قائداعظم محمدؐ علی جناح

ادیبوں کی نظر میں

مرتبہ

شیما مجید

قائداعظم محمد علی جناح

ادیبوں کی نظر میں

مرتبہ

شیما مجید

قائداعظم اکادمی

maablib.org

ناشر قائداعظم اکادمی

297 ایم اے جناح روڈ کراچی-5

طبع اوّل 1997ء

کمپوزنگ کوالٹی کمپوزر "عدیل سینٹر فرسٹ فلور کریم آباد" کراچی۔

طابع پرنٹنگ ایکسپرٹ 'فیڈرل بی ایریا کراچی۔

قیمت [redacted]

Rs. 250/-

اس کتاب میں جن خیالات 'نظریات 'توضیحات و تشریحات سے کام لیا گیا ہے وہ خالصتاً" مضمون نگاروں کے انداز فکر اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ قائداعظم اکادمی یا کوئی اور ادارہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔

فہرست

حرف آغاز	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۷
تقدم	شیما مجید	۱۱
۱۔ قائداعظم اور پاکستان کا تصور	انتظار حسین	۱۳
۲۔ قائداعظم اور صوبہ سرحد	انعام اللہ جان	۱۷
۳۔ لفظ "جناح" کی تحقیق	ڈاکٹر جمیل جالبی	۲۸
۴۔ اسلام سے قائداعظم کا رابطہ استوار	حامد علی خان	۳۲
۵۔ قائداعظم محمد علی جناح	پروفیسر حمید احمد خان	۳۹
۶۔ قائداعظم	خلیفہ عبدالحکیم	۴۴
۷۔ قائداعظم کی سوانح عمریاں	خواجہ رضی حیدر	۴۷
۸۔ قائداعظم محمد علی جناح۔ معمار پاکستان	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	۵۹
۹۔ قائداعظم اور گاندھی	سلیم احمد	۷۶
۱۰۔ قائداعظم محمد علی جینا	سید سلیمان ندوی	۸۵
۱۱۔ قائداعظم کے بعد قوم پر کیا گزری	سید سبط حسن	۸۹

۱۲۔ قائداعظم کی ذات گرامی اور تخلیق شعر	سید عابد علی عابد	۹۲
۱۳۔ مہد سے لحد تک	سید وقار عظیم	۹۸
۱۴۔ جناح کے بغیر	شیخ عبدالقادر	۱۰۸
۱۵۔ اقبال اور قائداعظم	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	۱۱۴
۱۶۔ قائداعظم کے دو ہتھیار	ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی	۱۱۷
۱۷۔ اردو قائداعظم اور تحریک پاکستان	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۲۳
۱۸۔ جناح اقبال اور تصور پاکستان	عبدالحمید کمالی	۱۴۵
۱۹۔ قائداعظم سے ایک ملاقات	عزیز احمد	۲۰۴
۲۰۔ قرارداد پاکستان میں صرف اتنا درج ہے	فیض احمد فیض	۲۰۹
۲۱۔ دیدہ بینائے قوم	کرار حسین	۲۱۱
۲۲۔ قائداعظم اور سندھ	کرامت علی خان	۲۱۸
۲۳۔ قائداعظم برصغیر کی جامع ترین شخصیت	مختار زمن	۲۳۰
۲۴۔ قائداعظم کے بعد	پروفیسر محمد حسن عسکری	۲۳۹
۲۵۔ قائداعظم کی کامیابی کا راز	ڈاکٹر محمد دین تاثیر	۲۴۶
۲۶۔ بابائے پاکستان	مختار صدیقی	۲۵۰

۲۷۔ قائد عظم محمد علی جناح کا آئینی سفر	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۲۵۸
۲۸۔ قائداعظم کا ایک سفر	ممتاز حسن	۲۶۵
۲۹۔ قائداعظم کی پہلی اردو تقریر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۲۷۸
۳۰۔ تصویر عزم	میاں بشیر احمد	۲۸۲
۳۱۔ قائداعظم۔ایک تاثر	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۸۷

maablib.org

حرف آغاز

مجھے قائدِاعظم محمد علی جناح کے بارے میں اہم پاکستانی ادیبوں کے خراج ہائے عقیدت کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کرنے کا خیال اس لئے آیا کہ یوں تو اردو میں قائداعظم پر شائع شدہ سیاستدانوں صحافیوں اور قلم کاروں کی تحریروں کا ایک انبار موجود ہے لیکن اس انبار میں اہم اور وقیع ادبا کی تحریروں کی تلاش بذات خود ایک ضروری کام نظر آیا۔

میں نے قائد اعظم اکادمی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۹۹۶ء میں قائداعظم کے بارے میں شعری اور نثری تخلیقات کے انتخاب شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی جسے سراہا گیا اور مجھے یہ اختیار دیا گیا کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ادبی اور ثقافتی زاویوں سے بھی کام کیا جائے۔ میں نے اس سلسلہ میں ملک کی ممتاز ادیبہ محترمہ شیما مجید صاحبہ سے رابطہ قائم کیا اور انہوں نے مہینوں کی شب و روز محنت کے بعد قائداعظم کی رحلت کے موقع اور اس کے بعد شائع ہونے والی ایسی تحریریں منتخب کر دیں جو علم و ادب کی دنیا کے روشن ستاروں نے بانی پاکستان کی منفردِ شخصیت کے بارے میں تحریر کی تھیں۔ ایک ادیب مورخ اور عام قلم کار کے زاویہ ہائے نظر میں نمایاں فرق کی وجہ وہ تخلیقی رس ہے جو ادیب کی تحریر میں شرط اول کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایک خلاق ادیب الفاظ میں رنگ بھر سکنے پر قادر ہوتا ہے اور اس طرح وہ سادہ لفظ اور تصویر کے فرق کو مٹا دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نفس مضمون کی صداقت کو درخو اعتنا نہیں سمجھتا۔ بلکہ صداقت سلیقہ مندی رنگ آمیز ہو کر زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ مورخ اگر ٹائن بی (Toyn bee) بھی ہو تو وہ تاثریت پسندی سے اجتناب برتتا ہے۔ مبادا میزان عدل پر انگشت نمائی کی جائے۔ عام قلم کار اکثر و بیشتر صحافیانہ ضرورت کے تحت قلم اٹھاتا ہے۔ اور مقررہ وقت پر تحریر مہیا کرنے کی مجبوری کی وجہ سے اس کی تحریروں میں ایک

تشنگی سی رہ جاتی ہے۔ جس کے لئے مختلف عذر پیش کئے جاسکتے ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ معقول نہیں نہ ہوں۔

شیما مجید صاحبہ نے جن اہم ادبا کی تعزیتی تاثراتی تحریروں کو یکجا کیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

عبدالحمید کمالی، وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، محمد حسن عسکری، عزیز احمد، پروفیسر حمید احمد خان، سید وقار عظیم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض، مختار احمد، سلیم احمد، سید سبط حسن، ممتاز حسن، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، انتظار حسین، میاں بشیر احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی، حامد علی خان، انعام اللہ جان، کرامت علی خان، کرار حسین، شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، خلیفہ عبدالحکیم، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، مختار زمن، خواجہ رضی حیدر اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔

ان تحریروں کو اس وقت کے اخبارات و جرائد میں تو نمایاں جگہ ملی لیکن مقام حیرت ہے کہ یہ تحریریں مصنفین کے مجموعہ ہائے مضامین میں نظر نہیں آتیں۔ اس شعوری صرف نظر کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے ادبا نے شاید ان تحریروں کو خود ہی ''صحافیانہ'' قرار دے دیا ہو یا پھر وہ سیاسی اور ادبی مضامین کی یک جائی پسند نہ کرتے ہیں۔ موخر الذکر وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

بہرحال قائداعظم اکادمی کے لئے بانی پاکستان کے بارے میں اردو کے اہم اور ممتاز ادباء کے رشحات قلم بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ ان تحریروں سے اندازہ لگائیں گے کہ اس مجموعہ میں شامل جملہ ادیب قائداعظم کی دیانت اور ان کے کردار کی رفعت کے یکساں قائل ہیں۔ وہ سب کے لئے محترم ہیں۔ ان تحریروں کے مصنفین کے خیال میں اگر قائداعظم کی تقلید کی جاتی۔ یا کی جائے تو پاکستان ان مسائل سے دوچار ہی نہ ہوا ہوتا جن سے کہ وہ ماضی

میں دوچار رہا، اور آج بھی دوچار نظر آتا ہے جب ادیب کسی سیاستداں سے "ہیرو" کی امیج متصف کرتے ہیں تو اس تمثال گری کی نوعیت قدرے مختلف ہوتی ہے۔ عوامی ہیرو ادیب کے لئے کچھ مختلف انداز میں ہیرو کا روپ دھار لیتا ہے وہ اسے تقابل (Comparison) اور تضاد (Contrast) کے معروف عمل سے گزارتا ہے اور ایک صحیح تخلیق کار کی طرح اپنے ممدوح میں اس تخلیقی قوت (Creativity) کو تلاش کرتا ہے جس کے بغیر سیاست کے پیچ و خم بر عمل نہیں آسکتے۔ اس طرح میدان حرب میں ایک جنرل کا کام بھی تخلیقی ہے۔ سیاست کی ایک تعریف یہ ہے کہ باقاعدہ جنگ کے بغیر جنگی مقاصد کے حصول کا نام ہے۔ قائداعظم مسلم برصغیر کے انتہائی منفرد رہنما تھے۔ انہوں نے تعلیمی سماجی اور معاشی طور پر پس ماندہ قوم کے لئے اپنی سیاسی قیادت کے جو معیارات مقرر کئے وہ تعلیمی، سماجی اور معاشی طور پر ترقی یافتہ لبرل سیاست کے انگلستان اور اسلامی شعائر میں گندھے ہوئے راست باز اور غیر منافقانہ طرز عمل سے یکساں طور پر مرتب ہوئی تھی اور حیران کن امر ہے کہ ایک ایسے شخص نے جسے راسخ العقیدہ شخص Conformist نے غیر راسخ العقیدہ، خوشامدی سیاستدانوں کے گروہ نے سچا اور کھرا اور ہندوستانی قوم پرستوں نے اعلیٰ درجہ کا ہندوستانی قوم پرست قرار دیا تھا اس نے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات منعقدہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں سو فیصد مسلم نشستیں حاصل کیں اور تاریخ کے ایک موڑ پر مسلم برصغیر کے تمام ممکنہ تضادات کو بے معنی بنا کر رکھ دیا۔ یہ بذات خود اتنا بڑا کام ہے کہ اسے قائداعظم کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہی قرار دیا جاسکتا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب علم و ادب کے روشن ستاروں کی باہم یکجائی کی وجہ سے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ ایک ہی کتاب میں قائداعظم سے متعلق تمام ادبا کی نگارشات مستقبل کے محققین کے لئے مددگار ثابت ہوں گی۔

میں محترمہ شیما مجید صاحبہ کو اس اہم کتاب کی تدوین پر اور خواجہ رضی حیدر، سینئر ریسرچ

آفیسر ڈپٹی ڈائریکٹر اور مہرالاسلام ریسرچ اسسٹنٹ کو ان کی لائق تقلید محنت و کاوش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اگر ان دو حضرات نے اس کام پر کماحقہ محنت نہ کی ہوتی تو شاید یہ کتاب اس قدر جلد منصہ شہود پر نہ آسکتی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ڈائریکٹر قائداعظم اکادمی

اگست ۱۹۹۷ء کراچی

حرف تقدم

قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت ان کے تدبر دانش، سیاسی بصیرت، مستقبل مزاجی بے مثال جرات اور قائدانہ صلاحیتوں کو سمجھنے کے لئے بے شمار پہلو ہیں۔ اپنے غیر معمولی کردار اور مسلمانوں کے کاز کے لئے ان تھک محنت اور بے لوث وابستگی کی وجہ سے انہوں نے جلد ہی مسلم عوام کے دلوں میں گھر کرلیا تھا۔ انہیں قوم کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد اور یقین تھا۔ جب قوم پر مایوسی طاری ہوجائے اور قوم ہمت ہار بیٹھے تو اس وقت ایک عظیم لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلم ہندوستان کو درپیش ایسے ہی حالات میں قائداعظم سیاسی افق پر ظاہر ہوئے اور ایک بھرپور کردار ادا کیا۔ انہوں نے محض نعرہ بازی اور جذباتیت سے کام نہیں لیا۔ بلکہ آئینی جنگ کا آغاز کیا۔ ایک ایسی آئینی جنگ جو ایک طرف ملک کی آزادی کے لئے تھی تو دوسری طرف مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے لئے تھی۔ قیام پاکستان کی صورت میں قائداعظم نے یہ دونوں جنگیں جیت لیں اور تاریخ میں ایک معمار قوم کے منصب پر فائز ہوئے۔ قائداعظم کی شخصیت کے متعدد گوشے ایسے ہیں جن پر تحقیق و تشریح کا سلسلہ جاری ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یعنی پچاس سال کے دوران ہمارے ملک کے ادیبوں اور دانشوروں نے ان کی سیاسی خدمات اور جدوجہد پر مقالات تحریر کئے ہیں جو مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ادیبوں نے قائداعظم کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو جس طرح محسوس کیا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں عقیدت کے ساتھ اس کا اظہار کیا لہٰذا یہ مقالے ادیبوں اور دانشوروں کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

میں قائداعظم اکادمی کے ڈائریکٹر اور ممتاز نقاد و دانشور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی ممنون ہوں کہ وہ ان مقالات پر مشتمل میری مرتب کردہ کتاب ''قائداعظم ادیبوں کی نظر میں'' اپنے ادارہ سے شائع کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے اہل قلم اور عوام ان تحریروں سے

ادارہ سے شائع کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے اہل قلم اور عوام ان تحریروں سے استفادہ کریں گے اور وہ قوم کے عظیم قائد کے افکار، فلسفہ حیات اور کارناموں کو لائحہ عمل بنا کر اپنے مستقبل کی تشکیل کریں گے اور اپنی منزل کی جانب تیزی سے آگے بڑھیں گے۔

شیما مجید

قائداعظم اور پاکستان کا تصور

انتظار حسین

پاکستان بن تو ضرور گیا ہے لیکن ہم میں سے بہتوں کو ابھی اس بات کا یقین نہیں آیا ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنی کوئی انفرادیت بھی رکھتے ہیں زندگی کے معاملہ میں ہم اپنے آپ سے اصلاح کرنے کی بجائے دوسروں سے سند لیتے ہیں۔ زبان کا معاملہ ہوتا ہے تو ہم عربی اور فارسی کے قواعد سے رجوع کی بات کرتے ہیں۔ شعر کی بات چھڑتی ہے تو ہم ایران کا رخ کرتے ہیں۔ موسیقی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو عراق کو آرڈر بھجواتے ہیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ پاکستانی قوم اب پیدا ہو رہی ہے اور مقصد ان کا یہ ہوتا ہے ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی پوری تاریخ اور کارناموں کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر قومی تعمیر پر کرایہ کا سامان منگانے پر اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر واقعی کوئی ہمارا تصور حیات اور اپنا طرز زندگی نہیں ہے تو یہ ایک الگ ملک بنانے کی ہمیں کیوں تکلیف ہوئی تھی۔ جب پاکستان کے مسلمانوں کی کوئی انفرادیت ہے ہی نہیں تو پھر پاکستانی ریاست نہ ہوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہوئی۔

یہ بات بے تکی نہ ہوگی اگر ہم خود بانی پاکستان کے یہاں اس سوال کا جواب ٹٹولیں۔ قائداعظم پاکستان کو دس کروڑ مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ قرار دیتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ خود ان کے ذہن میں پاکستان اور پاکستانی قوم کا تصور کیا تھا؟ پاکستان بن جانے کے بعد قائد اعظم نے چٹگاؤں میں تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے پاکستان کی تعریف یوں پیش کی تھی کہ پاکستان کے وجود میں آنے کی داستاں ہر طرح کی رکاوٹوں کے خلاف انسانی آدرشوں کا نام ہے، لیکن انسانی آدرش خلا میں صف باندھ کر تو رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد کرتے نہیں ہیں انسانی فکر اور عمل میں رس بس کر ہی محاذ قائم کرتے ہیں اگر پاکستان واقعی چند آدرشوں سے

عبارت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسانی آدرش ہم برعظیم پاک و ہند کے رہنے والوں کی زندگی میں گھل مل گئے تھے۔ لیکن قائداعظم نے جو بات کہی ہے۔ وہ اس سے ایک اور آگے والی منزل کا پتہ دیتی ہے۔ قائداعظم کا اصرار یہی ہے کہ یہ چند انسانی آدرش ہماری فکری اور عملی زندگی کو ایک الگ شکل دے سکتے ہیں جب ہی تو وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد کر سکے اور جدوجہد کر کے سرخرو ہو سکے۔ پھر آدرشوں کا کسی انسانی گروہ کی زندگی میں گھلنا ملنا اور اسے ایک انفرادی شکل عطا کرنا دو چار دن کا معاملہ تو ہوتا نہیں ہے اس عمل میں تو صدیاں لگتی ہیں۔ قائداعظم کی تقریروں کا جائزہ لیجئے تو دو باتوں کا بڑا شدید احساس ملتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہماری قوم ایک مخصوص انفرادیت کی حامل ہے دوسرے یہ کہ اس انفرادیت کے پیچھے صدیوں کی ایک تاریخ کام کر رہی ہے۔ اس انفرادیت کی وضاحت ایک مرتبہ تو انہوں نے بہت ہی جامع فقرہ میں کی تھی انہوں نے فرمایا کہ : ”ہم ایک قوم ہیں۔ ہمارا کلچر اور تہذیب الگ، ہماری زبان اور ادب الگ ہمارا آرٹ، اور فن تعمیر الگ، ہمارے نام اور نام رکھنے کے انداز الگ، ہماری تعداد اور تناسب کا احساس الگ، ہمارے قوانین اور اخلاقی ضوابط الگ، ہمارے طور طریقے اور تقویم الگ، ہماری تاریخ اور روایات الگ، ہماری افتاد طبع الگ، ہمارے آدرش الگ مختصر یہ کہ زندہ رہنے اور زندگی کو دیکھنے کا اپنا ایک طور الگ ہے غرض بین الاقوامی قانون کا وہ کونسا معیار ہے جس کی رو سے ہم ایک قوم نہیں ہیں۔“

یہاں قائداعظم نے بڑی تفصیل سے اور بڑے جامع انداز میں وہ تمام چیزیں گنا دی ہیں۔ جن سے قومیت کی تشکیل ہوتی ہے اور جن سے ایک قوم کی انفرادیت مرتب ہوتی ہے۔ قومیت کی اس تاریخ سے ایک اور بات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قائداعظم قومیت کو جغرافیائی اور سیاسی حد بندیوں میں جکڑنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ قومیت کو ایک نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی حقیقت سمجھتے ہیں۔ اس تعریف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم کو اس

بات کا بڑا شدید احساس تھا کہ برعظیم کے دس کروڑ مسلمانوں کی نکھری ہوئی انفرادیت ہے ان کی کلچری زندگی جامع اور بھرپور ہے۔ انہیں دوسرے سے چیزیں قرض لینے یا کرایہ پر منگانے کی ضرورت نہیں مرحوم قائداعظم اس برعظیم کے مسلمانوں کی ایک الگ انفرادیت کے تو قائل تھے، لیکن وہ اس انفرادیت کو کسی دوسرے اسلامی ملک کی انفرادیت میں گڈمڈ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک تقریر میں بڑے اعتقاد سے یہ بات کہی تھی کہ: "دس کروڑ مسلمانوں کا جیسا لمبا چوڑا اور جمع جتھا ہے۔ ویسا مسلمانوں کا جتھا تو روئے زمین پر نہیں ہے۔ وہ دوسروں سے قطعی الگ اپنا ایک قومی کلچر اور تہذیب رکھتے ہیں۔ وہ تمام قوموں اور ملکوں کی مکمل آزادی اور برابری کے حامی ہیں۔ آج عالمگیر کشمکش جاری ہے اور آئندہ جو نیا نظام جنم لینے والا ہے۔ اس کے معاملے میں اسلامی ہند کارہائے نمایاں انجام دے گا۔"

یہاں قائداعظم نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ایران ہو یا عراق ہم کسی کا ضمیمہ نہیں ہیں، بلکہ اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں اور یہ کہ اس معاملہ میں ہم کسی سے پیچھے نہیں بلکہ سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

پھر قائداعظم کی تقریروں میں یہ احساس بھی شدت سے کارفرما نظر آتا ہے کہ ہمارا ایک ماضی ہے ایک تاریخ ہے اور یہ کہ تاریخ بہت شاندار ہے چونکہ وہ ہندی مسلمانوں کی کلچری انفرادیت کے بڑی شدت سے قائل تھے اس لئے ان کے یہاں ساڑھے تیرہ سو سال کی مدت سے زیادہ آٹھ سو سال کی مدت کا ذکر ملتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہماری انفرادیت آٹھ سو سال پرانی ہے اور یہ کہ دو سو سال سے اس انفرادیت کا حال ابتر ہو رہا ہے اس کا وجود خطرے میں ہے اسے ان خطروں سے بچانے کے لئے اور اسے اور چمکانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ بالاخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندی مسلمانوں کا اس برعظیم میں ایک الگ وطن بنایا جائے۔ وہ بار بار اپنی تقریروں میں یہ بات کہتے تھے کہ ہندو اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنے

تصورات اور اپنے کلچر کو ہم پر مسلط کردیں۔ وہ ہماری زباں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔

قائد اعظم کے ان خیالات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ کوئی نئی قوم پیدا نہیں ہو رہی ہے بلکہ ایک بنی بنائی قوم پہلے سے موجود ہے پاکستان نے کسی نئی قوم کو جنم نہیں دیا ہے بلکہ ایک پرانی قوم نے پاکستان قائم کیا ہے پاکستان قائم ہی اس وجہ سے ہوا کہ ایک قوم پہلے سے موجود تھی اور اسے اپنی انفرادیت محفوظ کرنے کی فکر تھی پاکستان کی تاریخ میں یہ بڑا حادثہ ہے اگر ہم اپنی گزشتہ تاریخ کو بھول کر اپنے آپ کو چھ سال کا بچہ سمجھنے لگیں۔

ہفت روزہ قومی زبان کراچی

۲۶ ستمبر ۱۹۵۴ء

maablib.org

قائداعظم اور صوبہ سرحد

انعام اللہ جان

ظہور اسلام کے بعد پٹھانوں نے ہمیشہ اسلام کی سربلندی کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے حملے تک اس جمعیت نے نہ صرف برعظیم میں اسلام کے پھیلانے میں پہل کی بلکہ یہاں کے مسلمانوں کی تکلیف و آرام کے دنوں میں فیصلہ کن امداد بھی کی۔ اس بات کا ثبوت شاہ ولی اللہ کا وہ خط ہے جو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو اس غرض سے لکھا کہ اگر اس نے ہندوستان پر مسلمانوں کے تحفظ کے لئے حملہ نہ کیا تو مرہٹے اور ہندو ایک ایک کر کے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں جمال الدین افغانی ہی تھے جو برعظیم کے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے نعرہ زن ہوئے اور فرمایا کہ برعظیم کے مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ برعظیم کے مسلمان، افغانستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں سے مل کر ایک سلطنت کی تعمیر کریں۔

اس خطے کے ایک سپوت سردار گل نے جو ڈیرہ اسماعیل کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں بیان دیا تھا کہ ہند میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ پشاور سے آگرہ تک ایک مسلم اسٹیٹ وجود میں آئے۔

یہی وہ تحریکیں اور آراء تھیں جن کی بنیاد پر بیسویں صدی میں سرحد کے مسلمانوں نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا اور پھر دنیا میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا ظہور ہوا۔ اس مضمون میں میں نے ایسے واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کی وجہ سے سرحد کے مسلمان مسلم لیگ کے پروانے بنے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے آغاز اور کامیابی سے پہلے یعنی بیسویں صدی کے

آغاز سے سرحد کے سماجی اور سیاسی حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ موجودہ صدی سے پہلے صوبہ سرحد، پنجاب کا ایک حصہ تھا اور انگریزوں نے اس علاقے کو ہر لحاظ سے پسماندہ بنا رکھا تھا۔ یہاں کے لوگ قبائل کی شکل میں دیہاتی زندگی گزار رہے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن نے سرحد کو الگ صوبے کی حیثیت دی مگر اس سے بھی عوام کی زندگی پر کچھ خوشگوار اثر نہ پڑا کیونکہ علیحدہ صوبے میں جو بھی اقتصادی اور تعلیمی ترقی ہوئی اس پر ہندو اور سکھ چھا گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد دس فیصد تھی لیکن وہ صوبے کے نوے فیصد ذرائع پر قابض رہے اور سرکاری ملازمتیں تقریباً ان ہی کے پاس ہوتی تھیں۔ یہ حقیقت اللہ بخش یوسفی نے تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرحد کے سارے شہری مراکز ہندوؤں کے قبضے میں تھے اور وہ ہر قسم کے کاروبار پر قابض تھے۔ صرف قصابوں کا کام نہیں کرتے تھے مگر اس میں بھی کئی سکھ دلچسپی لیتے تھے اور قصابوں کو گائیں، بھینسیں مہیا کرتے تھے۔ یہ ہندو اور سکھ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ وہ تو بہادر اور تلوار چلانے والے لوگ ہیں، ان کا دکانداری، بنیا پن اور تل تکڑی سے کیا کام ہے۔ وہ مسلمانوں کو ہر بات میں دھوکا دیتے اور چونکہ مسلمان ان پڑھ تھے اس لئے حساب کتاب میں ان کو ہمیشہ مقروض ظاہر کرتے۔

سیاسی لحاظ سے بھی سرحد میں ہندوؤں کا بہت زور تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب خان عبدالغفار نے کانگریس میں شمولیت کا اعلان کیا تو اس کے ساتھ "سرخ پوش رضا کار تنظیم بھی کانگریس کا حصہ بن گئی اور آہستہ آہستہ گاندھی نے اپنی جادو بیانی اور چرب زبانی سے آزادی کے حصول کے لئے ایک بڑی اور کامیاب تحریک کو کانگریس میں بالکل مدغم کر لیا۔ امیر چند بھموال نے جو سرحد میں ہندو اخبار کا ایڈیٹر تھا، عبدالغفار خان کو "سرحدی گاندھی" کے نام سے مشہور کر دیا۔

پھر جب سرحد کے لئے اصلاحات کی بات چلی تو ہندوؤں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ مثلاً

۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو حمسوال کے اخبار فرنٹیئر ایڈووکیٹ میں ستیار تھی کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں واضح طور پر لکھا کہ "یہ صوبہ افغانستان کے بہت قریب ہے اور وسط ایشیا کے لوگ یہاں کے رہنے والوں پر سخت آفت نازل کر سکتے ہیں۔ لیجسلیٹو کونسل اور وزراء کے تقرر کے لئے یہ صوبہ آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے۔ اس صوبے میں رہنے والوں کا کیریئر کچھ ایسا عجیب و غریب ہے کہ یہاں اصلاحات کا نفاذ نہایت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

اسی طرح سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر مذکورہ اخبار کے ایک اداریہ میں بھی لکھا گیا کہ:

"اس صوبہ کی جغرافیائی، سیاسی، مالی اور مجلسی پوزیشن کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ امر نہایت نامناسب اور خود گورنمنٹ کے لئے مہلک اور خطرناک ہوگا کہ یہاں پر اس قسم کی جمہوری حکومت کا طریقہ جاری کیا جائے جو کہ مغرب کے مختلف ممالک یا ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہے۔"

ہندوؤں نے صرف سرحد میں ہی اصلاحات کے خلاف پروپیگنڈا نہیں کیا بلکہ سارے ہندوستان میں ایک زبردست تحریک چلائی اور مرکزی اسمبلی میں بھی اس بات کی مخالفت کی۔ اس سے ہندو ذہنیت کا پتا چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کیسے منظم تھے۔ برعظیم میں جہاں جہاں بھی مسلمان بستے تھے، ہندوؤں کی شدید خواہش تھی کہ ان پڑھ اور مفلس رہیں تاکہ زمانہ حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں۔

اس سلسلے میں ہندوؤں نے یہاں تک لکھ دیا کہ:

"سرحد میں اصلاحات کے نفاذ سے ہندوستان کا امن تباہ ہو جائے گا۔" اس پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ سرحد کے عوام کو فولادی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے انگریزوں کو مزید سخت اقدامات کرنے پر زور دیا۔ مثلاً رائے بہادر ٹھاکر دتہ نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

(ا) ''خیبر اور تیراہ کی طرح وزیرستان میں بھی فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی جائیں۔

(ب) سرحد کا نظم و نسق براہ راست ہندوستان کی مرکزی حکومت کے پاس رکھا جائے۔

(ج) سرحد کی عدلیہ براہ راست مرکز کے تحت رکھی جائے۔

(د) سرحد میں سرکاری ملازموں کی تقرری عام قابلیت کی بنا پر کی جائے اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملازمین کی تقرری نہ کی جائے۔

(ہ) اگر صوبہ کو اصلاحات دے دی جائیں تو پھر ہندوؤں کو کونسل میں ۳۰ فیصد نمائندگی ملنی چاہئے۔''

ایسے بیانات اور سازشوں سے پتا چلتا ہے کہ ہندو سرحد کے عوام کے کتنے سخت دشمن تھے۔

قائداعظم:۔

یوں تو قائد سرحد صاحبزدہ عبدالقیوم سرحد میں اصلاحات کے حصول کے لئے سرگرم عمل تھے ہی مگر ان کو برعظیم کی سطح پر مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں سے اخلاقی امداد کی بے حد ضرورت تھی اور یہ امداد برموقع اور زور دار طریقے پر قائداعظم محمد علی جناح کی طرف سے صاحبزادہ صاحب کو ملی۔ قائداعظم نے نہ صرف انفرادی طور پر سرحد میں اصلاحات کے نفاذ پر زور دیا بلکہ اپنی ساری تحریک کا رخ بھی اس بات کی طرف موڑ دیا اور اس طرح ۱۶ فروری ۱۹۲۶ء کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے سید مرتضیٰ بہادر نے یہ قرارداد پیش کی:

''یہ اسمبلی گورنر جنرل ان کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی ان دفعات کو جو قانون ساز ادارے کی کونسل، کابینہ کی تشکیل اور اقلیتوں کے تحفظ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ان کا دائرہ کار شمال مغربی سرحدی صوبہ تک بڑھا دیا جائے۔''

قرداد کے حق میں صاحبزادہ صاحب نے ایک طویل تقریر بھی کی۔

قائداعظم نے اصلاحات کے ضمن میں ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو ایک زبردست قدم اٹھایا اور دہلی میں ہندوستان بھر کے مسلمان لیڈروں کے ایک اجتماع میں، برطانوی حکومت کو یادداشت پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ:

"شمالی مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات کا نفاذ کیا جائے تاکہ یہ صوبے بھی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح آئینی مراعات سے فائدہ اٹھا سکیں۔"

مارچ ۱۹۲۷ء قائداعظم نے اپنے مشہور چودہ نکات کا اعلان کرتے ہوئے حکومت برطانیہ اور حکومت ہند سے پر زور مطالبہ کیا کہ:

"ایسی سرحدی پالیسی، جس سے مسلمانوں کی اکثریت والے صوبے پنجاب، سرحد اور بنگال متاثر ہوتے ہوں، عمل میں نہ لائی جائے اور سرحد اور بلوچستان میں ہندوستان کے باقی صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔"

یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں کل ہند مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے متفقہ طور پر انگریزوں سے مطالبہ کیا گیا کہ:

"شمالی مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں ہندوستان کے باقی صوبوں کی طرح دستوری اصلاحات مروج کرنا نہ صرف ان صوبوں کے عوام کے مفاد کے لئے ضروری ہے بلکہ کل ہندوستان کی دستوری ترقی کے لئے بھی عین ضروری ہے۔"

لندن کی گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے لکھنؤ میں سر علی امام کی صدارت میں قائداعظم کی ہدایت پر ہندوستان کے قوم پرست مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں انگریزوں سے مطالبہ کیا گیا کہ:

"سرحد اور بلوچستان میں ہندوستان کے باقی صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔"

قائداعظم نے انگریزوں کی سرد مہری دیکھ کر مرکزی اسمبلی میں یہ تک فرمایا:

"انگریز سرحد کے باشندوں کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں' تاریخی لحاظ سے زمانہ جاہلیت میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔"

قائداعظم نے ہندوستان کی فیڈرل اسمبلی میں پنڈت موتی لال نہرو' پنڈت مدن موہن مالویہ' راما سوامی آئنگر' ہری سنگھ گھور اور ان انگریز ممبروں کے خلاف ایک لمبی تقریر کی جو سرحد میں اصلاحات کے خلاف تھے۔ انہوں نے فرمایا:

"کیا ہم اس اصول سے انحراف کر رہے ہیں کہ ہم پورے ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کر رہے ہیں۔ اگر ہمارا یہ اصول ہے تو ہم سرحد کے لئے اسی جذبے کے تحت کام کیوں نہیں کرتے جس طرح ہم کسی دوسرے صوبے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ جناب عالی! ہندوستان میں ایک صوبہ ہے جو شمال مغربی سرحدی صوبہ کہلاتا ہے جس کے باشندوں کے متعلق برطانوی حکومت کی مقرر کردہ اکثریتی اور اقلیتی کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان میں تمام خوبیاں موجود ہیں۔ میرے معزز دوست سر راما سوامی آئنگر نے اپنی تقریر میں بیان کیا ہے کہ اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کے لئے کسی صوبے کے عوام میں اوصاف بھی ہونے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی صوبے کو حکومت خود اختیاری دینے کے لئے لازمی ہے کہ اس صوبے کے باشندے کچھ خوبیوں کے مالک ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان کے نزدیک وہ خوبیاں کونسی ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ سر ڈینس مبرے نے جو اپنی رپورٹ میں یہ کہا ہے کہ سرحد کے لوگ بہادر اور جرات مند قوم سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ کافی نہیں؟ میں وہ پیراگراف پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں: "صوبے سرحد کے باشندے یقیناً" ہندوستان کے باقی حصوں سے کسی لحاظ سے ذہنی طور پر اپنے معاملات کا انتظامات کرنے کی اہلیت کی بنا پر پسماندہ نہیں ہیں۔ ان میں

اصلاحات کے حاصل کرنے کا جذبہ پورے جوش و خروش کے ساتھ بیدار ہو چکا ہے اور یہ جذبہ ایسی ضروری اصلاحات کے بغیر جو ہندوستان کے دوسرے حصوں کو دی گئی ہیں، ٹھنڈا نہیں ہو گا۔" اس کے بعد قائداعظم نے اپنی تقریر میں سرحد کے متعلق اور بھی دلچسپ باتوں کا اظہار کیا۔"

قائداعظم کی اس قسم کی مساعی اور قائد سرحد کی جدوجہد سے لندن میں ۱۹۳۰ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر برطانیہ نے صاحبزادہ صاحب کی درخواست پر سائمن کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کا جائزہ لے۔ اسی سال دو جلدوں پر مشتمل ایک رپورٹ لکھی گئی جس میں یہ سفارش شامل تھی کہ:

"صوبے کی فضا ایک قانون ساز ادارے اور اس کے سامنے ذمہ دار انتظامیہ کے لئے مکمل طور پر تیار ہے۔ کوئی فرد بھی یہ تجویز نہیں کر سکتا کہ مجوزہ قانون ساز ادارے کو پانچوں ضلعوں کے علاوہ قبائلی علاقوں پر بھی مسلط کر دیا جائے۔"

اس سفارش کی بنیاد پر صوبہ سرحد کو اصلاحات مل گئیں اور اس طرح قائداعظم اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے۔ سرحد کو اصلاحات کے تحت جب قانون ساز کونسل کا حق ملا تو ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو صاحبزادہ عبدالقیوم پہلے وزیر مقرر ہوئے۔ کونسل کا پہلا اجلاس ایبٹ آباد کے ٹاؤن ہال میں ۱۲ مئی ۱۹۳۲ء کو ہوا۔ ۸ نومبر ۱۹۳۴ء کو آپ کی وزارت کے دوران شریعت بل پاس ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں آپ کی کوششوں سے صوبہ سرحد میں پہلا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا اور ایک ایسا بل بھی پاس کیا گیا جس کی رو سے ہندو اور سکھ مسلمانوں کی زمینیں نہیں خرید سکتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں اسکولوں کے نصاب سے ہندی اور گورمکھی کو خارج کرنے کا سرکلر جاری کیا گیا پھر مالاکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم کا آغاز ہوا اور یہ سب کچھ قائداعظم کے بھرپور تعاون کا نتیجہ تھا۔

قائداعظم کا پہلا دورہ سرحد:

۱۹۳۶ء میں قائداعظم نے مسلمانوں میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد تیز کرنے کے مقصد سے سارے برعظیم کا دورہ کیا۔ اس دورے میں صوبہ سرحد شامل نہیں تھا۔ جس وقت قائداعظم لاہور پہنچے تو سرحد کے چند سیاسی ارکان نے جن میں آغا سید لعل بادشاہ اور پیر بخش وکیل بھی شامل تھے' فیصلہ کیا کہ قائداعظم کو پشاور کی دعوت دی جائے سو قائداعظم کو تار کے ذریعے اطلاع دی گئی۔ عبدالعزیز خوش باش کو قائداعظم کو لانے کے لئے روانہ کیا گیا۔ وہ تشریف لے آئے تو چند سیاسی کارکنوں نے خاموشی کے ساتھ قائد کا استقبال کیا اور ان کو منڈی بیری پشاور شہر میں صاحب زادہ عبدالقیوم کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ اس وقت صوبہ سرحد میں کانگریس کی ذیلی سرخ پوش تنظیم پورے زوروں پر تھی۔ اس تنظیم کے سو فیصد کارکن دیہات کے رہنے والے تھے۔ اس وجہ سے وہ لوگ ہندوؤں کی سازشوں اور دباؤ سے بالکل بے خبر تھے اور ان کا لیڈر خان عبدالغفار خان پورے طور پر گاندھی جی کا سپاہی تھا۔ اس امر کا انہوں نے خود کئی مرتبہ اقرار بھی کیا تھا۔ شہروں کے لوگ ہندوؤں کی ہر حرکت سے واقف تھے کیونکہ انہوں نے ہندوؤں کو قریب سے دیکھا تھا۔ بالخصوص آغا سید لعل بادشاہ نے کانگریس میں وقت گزارا تھا۔ یہی حال میر بخش وکیل کا بھی تھا جو اس وقت ہندوؤں سے بہت بددل تھے۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کسی طرح سرحد کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے نرغے سے نجات دلائی جائے۔ لہٰذا اس کام کے لئے انہوں نے قائداعظم کو موزوں ترین شخصیت سمجھا۔

قائداعظم نے پشاور میں دس دن گزارے اور سرحد کے دور دراز علاقوں سے آنے والے وفود سے ملاقاتیں کیں۔ مگر کسی نے بھی قائد کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ہر ایک نے ان سے کہا کہ سرحد میں مسلم لیگ کو وجود میں لانا ایک سعی لاحاصل ہے۔ اس وقت ہر باشعور شخص'

کانگریس کی مسلمہ طاقت سے مرعوب تھا۔

غلام غوث صحرائی کے مطابق قائد اعظم نے شاہی باغ میں ایک چھوٹے سے جلسے سے خطاب کیا جس میں انہوں نے بر عظیم میں مسلمان اور ہندو دو الگ قوموں کے وجود کو ثابت کیا اور مزید فرمایا کہ مسلمان ایک الگ مذہب اور تہذیب کے مالک ہیں اور ان کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ انہوں نے ہندوؤں کے سازشی ذہن سے پردہ اٹھایا اور ان کو ازحد مکار اور عیار ثابت کیا۔

قائداعظم اگرچہ کانگریس کی ازحد شہرت کی وجہ سے اس مرتبہ مسلم لیگ کو پشاور میں قائم نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی مسلم لیگ میں شامل ہوا لیکن رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"جب میں دوبارہ سرحد کا دورہ کروں گا تو اس وقت مسلم لیگ سرحد میں سب سے کامیاب جماعت ہوگی اور دوسری کوئی سیاسی تحریک اس کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔"

قدرت کو یہی منظور تھا۔ بالکل اسی طرح ہوا کہ جب ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس کے بعد قائداعظم پشاور تشریف لائے کچھ اسی طرح کا سماں تھا۔ ۲۰ نومبر کے اخبارات میں قائد کے استقبال کا منظر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"صبح سے ہزاروں لوگ سڑکوں کے دونوں کناروں پر موجود تھے۔ جگہ جگہ دروازے بنے ہوئے تھے اور سارا شہر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ قائداعظم کا جلوس ایسی شان کے ساتھ شہر میں داخل ہوا کہ آگے آگے گھوڑوں کا رسالہ تھا اور پیچھے گھڑ سوار، موٹروں کے بعد موٹر سائیکل والے اور سائیکل سوار تھے۔ ان کے بعد مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی شاندار فوج تلواروں کو ہاتھوں میں لئے ہوئے تھی ان کے بعد ہزاروں کی تعداد میں پیدل لوگ تھے۔ یہ جلوس پشاور کی تاریخ میں ایک فقید المثال جلوس تھا۔ جب جلوس شاہی باغ پہنچا تو وہاں پرچم کشائی ہوئی۔ اس جلسے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگوں نے شرکت کی۔"

قائداعظم نے اپنی تقریر کے دوران اصلاحات کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

"میرے پٹھان بھائیو! جس وقت میں آپ کے صوبے کے لئے اصلاحات حاصل کرنے کے لئے لڑ رہا تھا اور آپ کے صوبے کو آئینی مراعات دلانے کے لئے کوشاں تھا تو کانگریس اور ہندوؤں نے کوشش کی کہ آپ کا صوبہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح نہ بنے لیکن ناکامی ان کی قسمت میں لکھی تھی۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کے صوبے کو آج جو صوبائی درجہ حاصل ہے یہ کس کی کوششوں کا نتیجہ ہے؟"

قائداعظم کی باقی تقریر کا خلاصہ۱۵ کچھ یوں ہے میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے حقیقت میں مجھے بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ یہاں میں ایک بار پہلے بھی ۱۹۳۶ء میں، آج سے ۹ سال قبل آیا تھا لیکن یہاں پر کانگریس کا جادو چھایا ہوا تھا، مگر اس مرتبہ ان کا جادو ٹوٹ گیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جادو اب ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا ہے آپ کو معلوم ہے کہ نو سال قبل یہاں پر مسلم لیگ کا نام و نشان بھی نہیں تھا، مگر آج آپ کو ہر طرف مسلم لیگ کے جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ مسلم لیگ نہ صرف سرحد میں مقبول ہے بلکہ یہ برعظیم میں دس کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

"مسلمان ایک پروردگار کی عبادت کرتے ہیں، ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور ایک رسول کی پیروی کرتے ہیں۔ اور مسلم لیگ ان مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے تاکہ مسلمان اس ملک میں اپنے لئے ایک باعزت مقام حاصل کریں کیونکہ یہاں نہ ہندو، مسلمان کا خیر خواہ ہے نہ انگریز۔ ہم ان دونوں متحدہ طاقتوں کا مقابلہ کریں گے۔

کانگریس نے جو سازش کی تھی اس کا راز شملہ کانفرنس کے وقت کھل گیا تھا۔ ہم معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں اور جب انگریز اس ملک سے چلے جائیں گے تو

ہندو ہر چیز پر قابض ہو جائے گا اس لئے ہم پاکستان چاہتے ہیں۔"

سرحد کے متعلق قائد نے فرمایا:

"پٹھان مجموعی طور پر ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں سے زیادہ منظم ہیں اور ان کا غلامی کا زمانہ بھی دوسروں سے کم ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ لوگ اپنا فرض پہچان لیں اور آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ کو کامیاب بنائیں۔ آج اگر ہم اپنا فرض نہ پہچانیں گے تو ہمارا انجام اچھوتوں جیسا ہو گا۔"

قائداعظم کے اس دوسرے دورے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور بہت جلد مسلم لیگ نے سارے صوبے میں زبردست مقبولیت حاصل کر لی۔ پیر صاحب مانکی شریف' خان عبدالقیوم خان' سردار عبدالرب نشتر اور ارباب عبدالغفور خان جیسی شخصیتوں نے مسلم لیگ کو چار چاند لگائے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پشاور کے دورے پر آیا تاکہ سرحد کے لوگوں کے جذبات معلوم کرے تو اس وقت پشاور پوری طرح مسلم لیگ کی آغوش میں تھا اور اس پر مسلم لیگ کی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے سرحد کے کونے کونے سے لاکھوں لوگ پشاور آکر جمع ہوئے تھے۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے یہ عالم دیکھا تو کہا: "سرحد میں کانگریس کا زور ٹوٹ گیا ہے۔" ریفرنڈم میں ۹۹ فیصدی لوگوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

یہ قائداعظم جیسی شخصیت کا اعجاز تھا جنہوں نے سرحد کو مسلم لیگ میں شامل کر کے پاکستان کا وجود میں آنا ممکن بنا دیا۔

سہ ماہی صحیفہ لاہور قائداعظم نمبر

ستمبر دسمبر ۱۹۷۶

لفظ "جناح" کی تحقیق

ڈاکٹر جمیل جالبی

قائداعظم پاکستان کے بانی تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک ایسی بیداری پیدا کی اور اتحاد' یقین محکم کا ایسا صور پھونکا کہ ساری ملت اسلامیہ' مختصر سے عرصے میں' ایک ہو کر پاکستان کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔ قائداعظم نہ صرف بابائے قوم ہیں بلکہ یک جہتی اور مسلم قومیت کی دائمی علامت ہیں۔ ان کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ایمانداری' خلوص نیت' بلندی کردار اور عقل و فراست سے کام لیا جائے تو ناممکن کام بھی ممکن ہو جاتے ہیں۔ قائداعظم کی جدوجہد اور محنت سے پر زندگی ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ صرف جوش و خروش سے کسی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ قوم میں جوش و خروش کا طوفان اٹھا کر ایک رہنما وقتی طور پر اپنا اقتدار تو قائم رکھ سکتا ہے لیکن انہیں منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن رہنماؤں نے قوم میں صرف جوش و خروش تو پیدا کیا لیکن عقل و شعور سے دور رکھا' وہ قوم کی زندگی پر آسمانی بجلی کی طرح گرے' ذرا دیر کو چمکے اور پھر قوم کا خرمن جلا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ قوم کے اندر صحیح شعور صرف ایسا ہی رہنما بیدار کر سکتا ہے جو خود سچا ہو' ایماندار ہو' بلند کردار کا حامل ہو' عقل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہو' جوش و جذبہ کو عقل و ہوش کے تابع رکھتا ہو' جس کی منزل ذاتی اقتدار نہیں بلکہ قوم کی فلاح و بہبود ہو۔ جس کی ایمانداری' خلوص اور سچائی پر کوئی انگلی نہ رکھ سکے۔ قائداعظم ہمارے ملک و ملت کے لئے ایک ایسی ہی دولت بیدار اور مثالی شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری نسل اور آنے والی نسلوں کے لئے ان کی ذات انہیں صفات کی وجہ سے ہمیشہ مینارہ نور بنی رہے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قائداعظم کی زندگی کے ہر پہلو کو سامنے لایا جائے اور ان کی فکر اور ان کی مثالی شخصیت کے سارے ممتاز و

نمایاں پہلوؤں کو نئی نسل کے مزاج میں شامل کیا جائے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ "صد سالہ جشن" کے اس موقع پر قائداعظم کی زندگی کے ہر گوشے پر تحقیق کی جائے۔ ان کی ہر تحریر اور ہر تقریر کو یکجا کر کے مرتب کیا جائے اور پھر اس مواد کی روشنی میں جدید قومی تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان کی سوانح عمری جدید انداز سے لکھی جائے۔ کل کے سوانح نگار کے لئے اس مختصر سے مضمون میں لفظ "جناح" کی تاریخ پیش کر رہا ہوں۔ سوال ہے: کیا یہ لفظ ہمیشہ سے قائداعظم کے نام کا جزو رہا ہے یا بعد میں، جب وہ برصغیر کی سیاست میں پوری طرح سے داخل ہو چکے تھے، ان کے نام کا حصہ بنا جسے خود انہوں نے قبول کر کے پسندیدگی کی مہر ثبت کر دی؟

قائداعظم کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ "محمد علی جناح کے والد جنا پونجا کھالوں کی تجارت کرتے تھے۔ وہ دبلے پتلے آدمی تھے۔" قائداعظم کا نام محمد علی اور والد کے نام کی مناسبت سے "جنا" ان کے نام کا جزو تھا یعنی محمد علی جنا۔ سندھ مدرسہ کراچی اور چرچ مشن ہائی اسکول کے ریکارڈ میں ان کا یہی نام ملتا ہے۔ قائداعظم کے والد چونکہ لمبے اور نہایت دبلے پتلے انسان تھے اس لئے "جنا" ان کا نام رکھا گیا یا پڑ گیا جس کے معنی گجراتی زبان میں دبلے پتلے کے ہیں۔ اردو میں بھی ایک لفظ اسی سے ملتا جلتا استعمال میں آتا ہے۔ جھنا جسے جھنا کپڑا یا جھینی ململ یعنی ایسا کپڑا جس کے تار و پود ذرا دور دور ہوں، گھٹے ہوئے نہ ہوں۔ ۱۶-۱۹۱۵ء تک اردو اخباروں میں ان کا نام محمد علی جنا یا محمد علی جینا ملتا ہے۔ یہی ان کا صحیح اور اصلی نام تھا۔ سید سلیمان ندوی نے قائداعظم کی وفات پر رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی ہمیں " قائداظم محمد علی جینا رحمتہ اللہ کی سرخی ملتی ہے۔ اس مضمون میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ "جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہوئے تھے اور وہ پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں میں

ظاہر ہوئے، سابق مہاراجہ محمود آباد سرکردگی میں لکھنؤ نے ان کا شاندار شاہانہ استقبال کیا تھا۔ اس وقت یہ نظم موزوں ہوئی:

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے
کوہ شعلہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا
جب کہ داروئے وفا ہر درد کا درماں رہی
جب کہ ہر ناداں عطائے بوعلی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے
جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادہ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر ومینا رہا
علت دیرینہ سے اصلی قوئی بے کار ہیں
گوش شنوا ہے، نہ ہم میں دیدہ بینا رہا
پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر "مسٹر علی جینا" رہا

یہ نظم ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ اجلاس کے موقع پر سید سلیمان ندوی مرحوم نے لکھی تھی۔ اس میں قائداعظم کا نام اسی طرح استعمال میں آیا ہے جس طرح وہ اس زمانے میں بولا اور لکھا جاتا تھا۔ یہاں "جینا" موجود ہے۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ جب ۱۹۱۶ء تک لفظ "جنا" جنا یا جینا قائداعظم کے نام کا جزو رہا تو آخر کب اور کیسے "جنا" "جناح" بن گیا؟ میری یہ مشکل بھی سید سلیمان ندوی مرحوم نے آسان کی۔ انہوں نے ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کی وفات حسرت آیات پر مضمون لکھتے ہوئے لکھا:

"شاید لوگوں کے لئے یہ بات اچنبھے کی معلوم ہوگی کہ قائداعظم مرحوم کے نام کا آخری جزو اس وقت تک "جینا" تھا جس کے معنی گجراتی میں "ننھے" کے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں جب وہ لکھنؤ (مسلم لیگ کے) صدر کی حیثیت سے آئے تو سید جالب مرحوم ایڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ کی ذہانت نے اس کو "جناح" بنا دیا جس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کرلی۔ خود میرا ہی اس زمانے کا ایک شعر ہے:

پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا "

اس کے بعد سے اردو انگریزی اخباروں میں جینا یا جنا کے بجائے "جناح" عام طور پر استعمال ہونے لگا اور خود قائداعظم نے اس لفظ کی معنویت کو دیکھ کر اسے قبول کرلیا اور انگریزی میں حرف "ایچ" کا اضافہ کرلیا۔ ۶

دنیا کے ہر چھوٹے بڑے موضوع پر پوری قدرت کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا اور مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اردو صحافت کی جدید روش کی طرح انہوں نے ہی ڈالی اسی لئے وہ بابائے صحافت اور امام صحافت کہلائے۔ اس دور کے بڑے بڑے صحافی جیسے حسن ریاض ایڈیٹر منشور، دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست، انیس احمد عباسی ایڈیٹر حقیقت، سید حبیب ایڈیٹر سیاست اور بہت سے دوسرے صحافی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے ذاتی کتب خانے کا ایک حصہ آج بھی جامع ملیہ دہلی میں محفوظ اور ان کے نام سے منسوب ہے۔ آج ہم نے جالب دہلوی کو فراموش کر دیا ہے لیکن جب بھی اس صدی کے مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ لکھی جائے گی جالب صاحب کا نام ان کی خدمات کے نور سے جگمگا رہا ہوگا۔

سہ ماہی صحیفہ قائداعظم نمبر

ستمبر، دسمبر ۱۹۷۶ء

اسلام سے قائداعظم کا رابطہ استوار
ارشادات پر ایک نظر

حامد علی خاں

مایوس ہو چکا تھا کرم تابہ حد کفر
پھر تو نے اس کو جذبہ ایماں عطا کیا
موران خاکباز کو تیری نگاہ نے
تخت سبا و بخت سلیماں عطا کیا

(کرم حیدری)

ایک عرب شاعر نے فخر سے کہا تھا۔

"میرے باپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر مجھے شرمسار ہونا پڑے۔"

ملت پاکستان کا مقام اس عرب شاعر سے بہت بلند ہے کیونکہ بابائے ملت قائداعظم محمد علی جناح نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر ہم فخر سے اپنا سربلند نہ کر سکیں۔

راقم نے ایک دفعہ حضرت شیخ عبدالقادر مرحوم سے ذکر کیا تھا کہ "بعض عرب زعما کے قول کے مطابق قائداعظم کا اصل پیغام سیاسی نہیں، اخلاقی اور روحانی ہے۔"

اس پر شیخ صاحب نے فرمایا "بالکل درست ہے اور رفتہ رفتہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جائے گی۔"

قائداعظم کے اقوال، بیانات اور تقریروں پر ایک نظر ڈالنے سے شیخ صاحب کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس باب میں ۱۹۲۶ء سے پہلے ہی کا ایک قول توجہ ہے۔

قائداعظم نے فرمایا:

"اخلاقی قوت دلیری محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری

عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے اور ناکامی وہ لفظ ہے جسے میں جانتا ہی نہیں۔"

اس قول میں اخلاقی قوت کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قائداعظم بعض فلسفیوں کی طرح اخلاق کو مذہب سے کوئی جداگانہ چیز نہ سمجھتے تھے، بلکہ وہ سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ قرآن مجید کے متعلق ان کا یہ قول اس حقیقت کا گواہ ہے۔

قائداعظم نے فرمایا:

قرآن مجید مسلمانوں کی زندگی کے لئے ایک عام ہدایت نامہ ہے یہ نہ صرف مذہبی رسوم پر بلکہ روز مرہ کی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ روح کی نجات سے لے کر بدن کی صحت تک، اس میں ہر شے کا ذکر ہے۔ ہمارے پیغمبر کا حکم ہے کہ ہر مسلمان اپنے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھے اور آپ اپنا مذہبی پیشوا ہو

قائداعظم کا ایمان تھا کہ قرآن مجید اور عقیدہ توحید ہی وہ رشتہ ہے جو پریشاں اجزائے ملت کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے دسمبر ۱۹۴۳ء کی ایک تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

قائداعظم نے فرمایا:

"آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے مسلمانوں کو تن واحد کی طرح متحد کر دیا ہے۔ اور اس قوم کی بنیاد کیا ہے اور وہ لنگر کون سا ہے جس نے اسے اپنے مقام سے جنبش نہ کرنے دی۔ وہ ہے اسلام اور ہماری عظیم الشان کتاب قرآن یہی ہے اسلامی ہند کی کشتی کا لنگر مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھیں گے ہم میں زیادہ سے وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسول ایک کتاب اور ایک ملت۔"

عمر بھر قائداعظم کو اسلام کے اخلاقی اور روحانی نصب العین سے جو وابستگی رہی اس کا ایک اور درخشاں ثبوت ۱۹۳۹ء کے پیغام عید کا ایک حصہ ہے جس میں حقوق العباد کے ادا کرنے کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

قائداعظم نے فرمایا:

آدمی کو قرآن مجید میں خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے۔ اس خطاب کے استحقاق کے لئے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم بندگان خدا سے ایسا (مہربانی کا) برتاؤ کریں جیسا خدا ہم سے کرتا ہے۔"

اس کے بعد قائداعظم نے فرمایا:

"میں آپ سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ یہ کبھی نہ بھولیے کہ اسلام ہر مسلمان سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی ملت کے متعلق اپنے فرائض ادا کرے۔"

بعد میں آپ نے پاکستان کی حکومت کا پہلا فرض یہ بتایا کہ "وہ غریبوں کی آسائش کا بندوبست کرے۔"

قائداعظم کو اس بات کا احساس تھا کہ اسلام دنیا بھر کے لئے رحمت کا پیغام بن کر آیا ہے۔ ۱۱ اگست ۴۷ء کو جب انہوں نے پاکستان کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے مرکزی قانون ساز اسمبلی کو مخاطب کیا تو آپ نے پھر ارکان حکومت کو غریبوں کی دست گیری کی تاکید کی اور ساتھ ہی اسلام کے ایک حقیقی ترجمان کی حیثیت سے یہ بھی واضح کر دیا کہ مذہب یا ذات پات یا نسل و رنگ کی وجہ سے کوئی شخص امتیازی سلوک کا مستحق نہ سمجھا جائے گا۔

قائداعظم نے فرمایا:

"اگر ہم پاکستان کی اس عظیم الشان سلطنت کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام مساعی اس کے باشندوں خصوصاً" عام لوگوں اور غریبوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ اس ملک میں جس کی ہم آج بنیاد ڈال رہے ہیں ذات یا مذہب کی بنا پر کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا ہم اس بنیادی اصول پر آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک" ریاست" میں برابر کے شہری ہیں۔"

اسلام میں جہاد اور مجاہد کی فضیلت مسلم ہے۔ قائداعظم نے برعظیم ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا کے لئے جو طویل اور سخت جہاد کیا اور جس میں انہوں نے ملت کے لئے کام کرتے ہوئے جانکاہ محنت سے اپنے خون کا آخری قطرہ تک خشک کر دیا' وہ آپ کی فرض شناسی کا عملی ثبوت ہے۔

لیکن قائداعظم کو اس جہاد میں ایک مجاہد کے علاوہ ایک مسلمان پیشوا اور سپہ سالار کے فرائض بھی انجام دینے تھے' کیونکہ اس سخت جنگ میں وہ خدا کے بعد مسلمانوں کے لئے آخری تنہا سہارا اور امید گاہ تھے۔ دنیا گواہ ہے کہ قائداعظم نے اپنے اس فرض کو عدیم النظیر عزم و ہمت قابلیت اور استقلال سے ادا کیا اور وہ کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی مسلمانوں کو خدا پر بھروسا رکھنے اور آگے بڑھے چلے جانے کی تلقین کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء کے وحشیانہ قتل عام اور بہیمانہ ظلم و ستم کے واقعات کے باوجود قائداعظم کی کوہ وقار ہمت برقرار رہی۔

قائداعظم نے فرمایا:

"اللہ اکثر ان لوگوں کا امتحان لیتا ہے جو اسے محبوب ہوتے ہیں۔ آج خدا پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کا امتحان لے رہا ہے۔ اس نے ہم سے زبردست قربانیاں مانگی ہیں۔ ہماری نئی حکومت ان زخموں سے خون آلود ہے جو دشمنوں نے اسے پہنچائے ہیں ہمیں اس وقت چاروں طرف سے سیاہ بادل گھیرے ہوئے ہیں لیکن ہم ہمت نہیں ہاریں ۴ گے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے اس خطرناک دور پر دشمنوں کے منصوبوں کے باوجود اسی طرح غالب آجائیں گے جس طرح ہم نے اپنی گزشتہ تاریخ میں ایسے موقعوں پر غلبہ حاصل کیا ہے اب دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو برباد نہیں کر سکتی۔ جتنی زیادہ ہمیں قربانیاں دینی پڑیں گی اتنے ہی ہم صاف اور پاکیزہ ہو جائیں گے اسی طرح جیسے سونا آگ سے نکل کر زیادہ

خالص ہو جاتا ہے۔ میرا پیغام آپ کے لئے امید ہمت' اور ایمان کامل کا پیغام ہے۔"

اسی زمانے کے ایک اور پیغام میں قائداعظم نے فرمایا:

"گزشتہ المناک واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی قوم تکلیف اٹھائے اور قربانی دیئے بغیر آزاد نہیں ہو سکتی' اس وقت ہم عدیم النظیر مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی ہمت اعتماد علی النفس اور خدا کے فضل و کرم سے ان تمام مشکلات پر فتح پا لیں گے' اس کام کے بوجھ اور پھیلاؤ سے دب نہ جاؤ۔ تم میں بڑا زبردست جوہر موجود ہے۔ حوصلہ رکھو۔ موت سے نہ ڈرو' ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی فلاح کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نیکی کی راہ میں اپنی جان قربان کر دے۔" اس جوش جہاد کے ساتھ قائداعظم کا عزم و یقین اور خدا کی ذات پر اعتماد وہ بنیادیں ہیں جن پر قائداعظم کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات قائم ہیں۔

قائداعظم دولت خداداد پاکستان کی تخلیق کو اپنا کوئی ذاتی کارنامہ سمجھ کر فخر نہیں کرتے تھے۔ ان کی زبان پر خود پرستی کا کوئی کلمہ کبھی نہیں آیا۔ ایک سچے مسلمان کی طرح دولت پاکستان کو وہ خداوند قدوس کا ایک انعام سمجھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے تمام اقوال اس حقیقت کے شاہد ہیں۔

قائداعظم نے فرمایا:

"یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمدؐ کا روحانی فیض ہے کہ جس ملت کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے صفحہ ہندوستان سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی سازش کر رکھی تھی آج وہ ملت آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے' اپنا پرچم ہے' اپنی حکومت اور اپنا آئین دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا کوئی اور انعام ہو سکتا ہے؟ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خداوند تعالیٰ نے رسول اکرمؐ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراط مستقیم اختیار کیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعام عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض

ہے۔"

قائداعظم اول و آخر ایک سچے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی قوم ان کے نزدیک ایک ملت واحدہ تھی جسے رنگ و نسل اور جغرافی حدود تقسیم نہیں کرسکتے۔ وہ علاقہ وار تعصبات کو پاکستان کی ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھتے تھے اس بارے میں ان کے بیسیوں اقوال میں سے ایک یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

قائداعظم نے فرمایا:

"جب تک آپ اپنی سیاسی زندگی کو (صوبجاتی تعصب کے) زہر سے پاک نہ کرلیں آپ اپنے آپ کو حقیقی ۔ہوم میں ایک بڑی قوم کی طرح مرتب، منظم اور متحد نہیں کرسکتے۔ اس لئے ایک سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی وغیرہ سمجھنا چھوڑ دیں۔ ہم مسلمان ہیں اور اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم خواہ اور کچھ بھی ہوں سب سے پہلے مسلمان ہیں، ہم ایک ملت ہیں ہم نے اپنے لئے ایک سرزمین، ایک وسیع سرزمین حاصل کی ہے یہ مسلمانوں کی سرزمین ہے۔ اسے کسی سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان یا بنگالی نے حاصل نہیں کیا۔"

یہ الفاظ قائداعظم کے ہیں اور دوست دشمن یکساں گواہ ہیں کہ ان کے اقوال ان کے دل سے نکلتے تھے، اور جو کچھ وہ کہتے تھے کہنے سے پہلے خود اس پر عمل کر دکھاتے تھے۔ اسلامی اخوت و مساوات کا جو درس ان الفاظ میں ہے اگر ہم اسے اچھی طرح سمجھ لیں تو پاکستان کا مستقبل نہایت شاندار ہو گا۔

اہل پاکستان کے نام قائداعظم کا آخری پیغام وہ تھا جو انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو اپنے بستر مرگ سے پاکستان کے تمام باشندوں کے نام جاری کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

قائداعظم نے فرمایا:

"پاکستان کے باشندو! آج ہم اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منا رہے ہیں سال بھر ہم نے

جرات، عزم و وجدان سے کام لے کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یکے بعد دیگرے دشمن نے کئی وار ہم پر کیئے، بالخصوص اس کا سوچا، سمجھا ہوا قتل عام کا منصوبہ، لیکن ہم نے یہ وار روک لئے اور اپنا اصل تعمیری کام کرتے رہے..... یاد رکھو پاکستان کا قیام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست ہے۔ اگر ہم ایمانداری، تندہی اور بے غرضی سے اپنی خدمات انجام دیتے رہیں گے تو پاکستان کے کارنامے سال بہ سال زیادہ نمایاں ہوتے جائیں گے مجھے اپنی قوم پر کامل اعتماد ہے کہ وہ ہر موقع پر ہماری اسلامی تاریخ کی شان و شوکت اور روایات کو برقرار رکھے گی۔"

آخر میں قائداعظم نے فرمایا:

"قدرت نے آپ کو ہر شے دے رکھی ہے۔ آپ کے وسائل غیر محدود ہیں آپ کی سلطنت کی بنیادیں استوار کی جاچکی ہیں اور اب یہ آپ کا کام ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ان بنیادوں پر ایک شاندار عمارت کھڑی کردیں۔ سو اٹھئے اور آگے قدم بڑھایئے۔ آپ کو یہ پیش قدمی مبارک ہو۔"

قائداعظم کا یہ غیر معمولی عزم اور اعتماد علی النفس خدا کی ذات پر آپ کے ایمان محکم کا قطعی ثبوت ہے۔

قائداعظم کے طبیبوں کا بیان ہے کہ حالت نزع میں آپ کے منہ سے جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ بہ مشکل سنے اور سمجھے گئے وہ تھے

"اللہ ...... پاکستان .... موت بھی اللہ اور ملت پاکستان کی یاد ان کے دل سے نہ نکال سکی۔ یہ اسی للّٰہیت کا اجر تھا کہ اللہ نے جیتے جی انہیں فائزالمرام کیا، اور مرنے کے بعد بھی ملت پاکستان نے اپنی بے پناہ اور عدیم النظیر محبت ان کے قدموں پر نچھاور کی۔

(اس مضمون کا بیشتر حصہ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا۔)

ماہنامہ مخزن لاہور

فروری ۱۹۵۱ء

قائداعظم محمد علی جناح

پروفیسر حمید احمد خاں

مارچ ۱۹۴۰ء کی ایک صبح کو لاہور کے ایک کالج میں کچھ نوجوان لیکچرار جمع تھے اور اس معجزے پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے جسے گزشتہ شب انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے دیکھا تھا۔ وہ معجزہ یہ تھا کہ جو بات ایک دن پہلے تک محض خواب و خیال معلوم ہوتی تھی، وہی اب ایک حقیقت بن کر مسلمانان برعظیم کے دل و دماغ کو منور کر رہی تھی اس انقلاب کا سبب صرف اتنا تھا کہ رات آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلمانوں کے پیرانہ سال مگر جواں ہمت قائداعظم محمد علی جناح نے مسلسل چند گھنٹوں تک ایک معرکہ الارا تقریر کر کے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس برعظیم کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ ایک ایسی قوم جو اپنا ایک مسلک رکھتی ہے اور ساتھ ہی یہ عزم کہ وہ اپنے اس ملک میں آزاد ہو کر رہے گی۔ ان لفظوں میں کچھ ایسا اعجاز تھا کہ کل جو لوگ ہراساں تھے کہ آخر یہ سب کچھ کس طرح ہو گا آج ان کے دل خود بخود گواہی دے رہے تھے کہ یہ ہو کے رہے گا۔

ہم میں سے وہ لوگ جنہیں ۱۹۴۰ء سے چند برس پہلے کے حالات یاد ہیں۔ گواہی دیں گے کہ کس طرح بے یقینی اور بے بسی کی وہ کیفیت جس میں ہم سب مبتلا تھے، قرارداد پاکستان نے یک بیک زندگی کے جوش اور حرارت ایمانی میں بدل دی تھی اب ہر بات ممکن نظر آتی تھی، اب پاکستان کا وجود ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا۔ یہ ذہنی انقلاب اس لئے پیدا ہوا کہ ہمیں قائداعظم کی ذاتی دیانت اور فراست پر پورا بھروسہ تھا۔ جب انہوں نے یہ کہہ دیا کہ "پاکستان بنے گا" تو ہمیں بھی پورا یقین ہو گیا کہ پاکستان کے بن کے رہے گا۔

پوری قوم کا یہ بے مثال اعتماد قائداعظم کو ناگہانی طور پر حاصل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے برسوں کی ریاضت، سالہا سال کی بے لوث خدمت کے بعد یہ مقام حاصل کیا تھا کہ آخر کار نو

کروڑ مسلمان متحد ہو کر ایک مضبوط دیوار کی طرح ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ قرارداد پاکستان کے منظور ہونے سے تقریباً" تین برس پہلے علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھا تھا کہ "آج ہندوستان بھر میں آپ ایک ہی مسلمان ہیں جس سے قوم کو بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ ہمیں آنے والے طوفان سے سلامت نکال لے جائے گا۔" اس ایک جملے میں قائداعظم کی سیاسی بصیرت فکری عزم و استقلال اور بے غرصانہ خدمت قوم کے پہلے تیس اور آخری دس برسوں کا خلاصہ بیان ہو گیا تھا۔ علامہ اقبال کی اور ملت اسلامیہ کی سب امیدیں اس "ایک ہی مسلمان" نے جس طرح پوری کی ہیں اس کی کہانی اب تاریخ کے صفحات پر جلی حروف میں لکھی جا چکی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جب قائداعظم نے قومی آزادی کے لئے اپنی چہل سالہ جدوجہد شروع کی تو ہمارے برعظیم کا سیاسی نقشہ یہ تھا کہ حکومت انگریز وائسرائے کے ہاتھ میں تھی اور حکومت کا کاروبار ایک ایسی کونسل کے مشورے سے طے پاتا تھا جس کے سب ارکان انگریز تھے۔ ہر درجے اور ہر مرتبے کے انگریز عہدہ دار زندگی کے ایک ایک محکمے پر قابض تھے۔ صوبوں کے گورنر، قسمتوں کے کمشنر، ضلعوں کے ڈپٹی کمشنر سب انگریز تھے۔ ریلوے کے بڑے اور چھوٹے افسر، سڑکوں کے، جنگلات کے، نہروں کے بااختیار حاکم، محکمہ صحت کے سب قابل ذکر کارکن، یہاں تک کہ ضلع کے اسپتالوں کے ڈاکٹر تک سب انگریز تھے۔ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور رجسٹرار، صوبائی تعلیمات کے ناظم اور ضلع بہ ضلع گھومنے والے انسپکٹر تعلیمات سب کے سب انگریز تھے۔ فوج انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ پولیس پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ سب سے اونچی عدالتوں میں انگریز کا حکم چلتا تھا جو محصول ہم ادا کرتے تھے انہیں انگریز جمع کرتے اور انگریز ہی خرچ کرتے۔ سرکاری دفتروں، عدالتوں، یونیورسٹیوں اور مدرسوں کی زبان انگریزی تھی۔ انگریزی اثرات سے بھری ہوئی اس فضا کے

پیچھے ہندو نے اپنا ہاتھ انگریز کے ہاتھ میں دے رکھا تھا جس کے صدقے حکومت کے کاروبار سے باہر تجارت اور صنعت و حرفت پر ہندو کا قبضہ تھا۔ زندگی کے عام کاروبار میں جہاں چھوٹے انگریز عہدہ دار ختم ہوتے تھے وہاں سے بڑے ہندو اہل کار شروع ہو جاتے تھے۔ اس طرح برعظیم کے تقریباً" ہر حصے میں مسلمان قوم پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں علامہ اقبال نے فکری طور پر اور قائداعظم نے عملی طور پر انسانی زندگی کی یہ بنیادی حقیقت ثابت کر دکھائی۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی!

مومن کا اب تقدیر الٰہی بننا کس طرح ممکن ہوا؟ اس سوال کا جواب قائداعظم کی زندگی کی پوری داستان میں موجود ہے۔

وہ ایک دراز قد انسان ضرور تھے لیکن عمر کی کسی منزل میں بھی نہ خاص طور پر تنومند تھے' نہ کسی نمایاں تن و توش کے مالک لیکن ان کی آنکھوں میں بجلی کی ایک چمک تھی جو ان کی روح کے لامحدود خزانوں کا پتہ دیتی تھی۔ عملی زندگی کے پہلے بیس بائیس برس تک انہوں نے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی کہ متحدہ ہندوستان میں عظیم مسلم اقلیت کے حقوق کا آئینی تحفظ کس طرح کیا جائے؟ جناح کے چودہ نکات میثاق لکھنؤ وغیرہ اسی دور کے کارنامے ہیں۔

لیکن یہ دور مجموعی حیثیت سے قائداعظم کی شکست کا دور ہے۔ "شکست" کے لفظ سے ہمیں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ مرد مومن کی ہر شکست کسی بڑی فتح مندی کا پیش خیمہ ہوتی

ہے۔ اس تمام مدت میں جس کا ذکر ابھی ہوا' قائداعظم کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے تدبر کا ارتقاء اس طرح پر ہوتا چلا گیا کہ ظاہری ناکامی کا یہی دور ان کی آخری فتح مبین کی بنیاد بن گیا۔ ۱۹۳۰ء کے قریب ان کی فراست ایمانی نے انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ان پر یہ ظاہر ہوا کہ مسلمانوں کے حقوق کا آئینی تحفظ متحدہ ہندوستان میں سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اب انہوں نے متحدہ ہندی قومیت کے بت کو توڑا اور ۱۹۳۵ء سے بعد کے دس بارہ برس مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت کی تعمیر میں لگا دیئے۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد آتا ہے۔ ۱۹۴۳ء (یا ۱۹۴۴ء) کا ذکر ہے' جب قائداعظم کا سن ہیسنٹھ برس سے متجاوز تھا' کسی نے ان سے بڑے ادب کے ساتھ پوچھا۔ "قائداعظم! دیکھنے میں آپ اس قدر نحیف سے آدمی نظر آتے ہیں کہ یہ بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ آپ اپنی قوم کی خاطر اس قدر مشقت کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ براہ کرم یہ سمجھا دیجئے کہ آپ اس حالت میں اتنا کچھ کیونکر کر لیتے ہو؟" قائداعظم نے برجستہ جواب دیا۔ "دو وجہ سے' ایک تو اس لئے کہ میں بہت کم کھاتا ہوں اور دوسرا اس لئے کہ میرے دل کے اندر کوئی چور نہیں ہے۔"

یہ ایک مرد مومن کا دو ٹوک جواب تھا۔ لہجے کی یہ قطعیت صرف اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے باطن کا محاسبہ سختی سے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی بصیرت زندگی کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں اس کی رہنمائی کرتی ہو۔ اس قسم کا ایک واقعہ میرے مشاہدے میں اس وقت آیا جب ۱۹۴۶ء میں عید الاضحیٰ کی تقریب پر دہلی کے مسلمانوں کے بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے ایک عجیب و غریب نکتہ ارشاد فرمایا۔ کہ ان دنوں کی بات ہے جب بہار میں ہزارہا مسلمان مرد' عورتیں اور بچے سفاکی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ قائداعظم نے کہا۔ "لوگ مجھ سے بار بار کہتے ہیں کہ ہم صرف آپ کے ایک اشارے کے منتظر ہیں پھر دیکھئے کہ ہم کس طرح سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ آپ ہمارے

جرنیل ہیں۔ ہمیں ایک دفعہ حکم دیجئے کہ ہم آگے بڑھیں۔" اس کے بعد قائداعظم نے جو کچھ فرمایا وہ میرے حافظے پر آج تک نقش ہے کہنے لگے۔ "میں کس فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دوں؟ کیا ان لوگوں کو جو ابھی تک بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں، جنہیں تنظیم کی کئی منزلیں طے کرنی ہیں؟" اس کے بعد قائداعظم نے اپنی آواز بلند کی اور فرمایا۔ "اگر قائداعظم اس حالت میں لوگوں کو آگے بڑھنے کی دعوت دے تو وہ جرنیل نہیں بلکہ مجرم ہو گا۔"

یہ تھا اس مردِ مجاہد کا انداز کار جسے ہم نے بجا طور پر اپنا سب سے بڑا رہنما قرار دیا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد جب طوفان بلا واقعی پھوٹ پڑا تو اس کی صاحب ضمیر ہستی کہیں باطل کے خس و خاشاک پر بجلی بن کر گری۔ کہیں ناتوانوں کی حمایت میں ایک آہنی دیوار بن گئی۔ اس نے شرارت، خوف، فریب، لالچ، الغرض دشمنوں کی ہر یورش کا مقابلہ کیا۔ زمانے نے دیکھا کہ کروڑوں کے اس برعظیم میں صرف ایک انسان اپنی قوت ایمانی کے سہارے تن کر سیدھا کھڑا رہا۔ وہ مکرودغا کے ہر جال سے نکلا اور بنیے کی دولت کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگاتا، انگریز کے قہرو جبروت کو تیغ نگاہ سے تسخیر کرتا، بالاخر اس پاک سرزمین تک آپہنچا آج ہمارے دل اس کے لئے شکر گزاری کے احساس سے لبریز ہیں۔ اس کا نام اور کام ہم سب کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی امنگ پیدا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ زندہ باد قائداعظم پائندہ باد پاکستان!

ماہنامہ ہمایوں لاہور

maablib.org

قائداعظم

خلیفہ عبدالحکیم

قائداعظم محمد علی جناح نہ صرف ایک بہت بڑی اسلامی مملکت کے بانی اور معمار تھے۔ بلکہ اپنی سیرت میں ایسے صفات محمودہ سے متصف تھے جو فرد اور ملت دونوں کے لئے سرمایہ حیات ہیں۔ مشیت ایزدی نے محمد علی جناح کو عمر کے آخری حصے میں ایک بہت بڑی ملت کا قائداعظم بنادیا۔ ان کی قیادت میں ایک محکوم اقلیت آزاد قوم بنی اور ایک عظیم الشان اسلامی مملکت معرض وجود میں آئی۔

زندگی محض پند و نصیحت سے نہیں بنتی بلکہ اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونوں سے بنتی ہے۔ اچھی باتیں کہنے والے دنیا میں ہمیشہ سے بکثرت موجود رہے ہیں اور بگڑی ہوئی ملتوں میں بھی محض قول کی حد تک اچھی باتیں کہنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہوتی ہے لیکن محض خیال یا قول انسان کو اس حد تک متاثر نہیں کرتے جس حد تک کہ عملی نمونے موثر ہوتے ہیں۔ قائداعظم کی سیرت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ہر اس اصول کو اپنی زندگی میں سمولیا تھا۔ جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ ازروئے تعلیم قرآنی حق کو حق سمجھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ زندگی کا جزو بننے کے لئے حقانیت انسان سے عمل، صبر اور استقلال کی طالب ہوتی ہے۔ درحقیقت عمل ہی انسان کے عقیدہ اور ایمان کی کسوٹی ہے۔ اسی لئے کلام الٰہی میں تقاضائے ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ پر بھی بے شمار آیات میں زور دیا گیا ہے۔ ان الذین امنو او عملو الصالحات قرآن کریم بار بار اس کو دہراتا ہے تاکہ یہ بات مومنین کے ذہن نشین ہوجائے کہ اعمال کو ایمان کی پختگی کا لازمی نتیجہ ہونا چاہئے اور ایسا مومن، مومن کہلانے کا مستحق نہیں جس کے اعمال اس کے ایمان کا آئینہ نہ ہوں۔

قائداعظم کی زندگی سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ حق اور اس کے حصول کے لئے صبر

استقلال لازم و ملزوم ہیں۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ مشکلات اور موانع کے باوجود اپنے ایمان یا اصول کو ترک نہ کرنا اور استقلال سے کام لیتے ہوئے اور اپنے نصب العین پر نظر جمائے ہوئے ہر قسم کے ایثار کو بہ رضا و رغبت قبول کرنا' یہاں تک کہ امتحان کردار کے بعد نصرت الٰہی انسان کو اس منزل تک پہنچادے جہاں حق کی فتح اور باطل کی شکست سے یہ اعلان ہو کہ:

جباءالحق وزھق الباطل - ان الباطل کان زھوقا" O

بلند انسانیت کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنے ایمان یا اصول حیات کو جسے اس نے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے کسی قیمت پر فروخت کرنے پر تیار نہ ہو۔ سب سے بڑی آیت الٰہی نفس انسانی ہے جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ نفخ روح الٰہی ہے۔ عام لوگ مفاد عاجل اور نہایت ناپائدار مادی آسائشوں کے لئے اس کو فروخت کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

لاتشترو ابایاتی ثمنا" قلیلا" (تھوڑی تھوڑی موہوم قیمت لے کر آیات الٰہی کو فروخت مت کرو۔

روح انسانی وہ جوہر ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے:

کہ بجریل امینے نتواں کرد گرد

گزشتہ نصف صدی کی سیاسی جدوجہد میں ہندوستان کے اکثر رہنما جلد جلد رنگ بدلتے رہے ہیں۔ لیکن محمد علی جناح نے جو راہ اختیار کی تھی اس سے وہ ایک قدم بھی ادھر ادھر نہیں ہٹے۔ نہ انہوں نے کبھی غیر ملکی حکومت میں کوئی بڑے سے بڑا عہدہ قبول کیا اور نہ کسی خطاب کے آرزو مند ہوئے' ملک و ملت کی آزادی اور خودداری کے معاملے میں وہ خم ٹھونک کر اس وقت وائسراؤں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے جب امپریل ازم اوج پر تھا۔ ہندوستان کی تمام قوموں نے ان کی ہمت و دیانت کی داد دی اور اُن کے نام کو بقائے دوام بخشنے

کے لئے شاندار یادگاریں تعمیر کیں۔ جس وقت پاکستان کے لئے شدید جدوجہد ہو رہی تھی اس وقت ایک مغربی نقاد نے قائداعظم کے متعلق مختصر مگر جامع انداز میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنی دھن اور اپنے ایمان کے اس قدر پکے ہیں کہ انہیں کوئی قوت کسی قیمت پر خرید نہیں سکتی۔ اور قائداعظم کی وفات پر بھارت کے ایک بڑے مقتدر لیڈر نے جو آخر تک ان کا مخالف رہا یہ کہا تھا کہ اس شخص کو اچھا کہو یا برا، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ ناممکن کو ممکن بنا گیا۔ جو ایک غیر معمولی انسانی کارنامہ ہے۔

ملتوں کی تعمیر اچھی روایات سے ہوتی ہے اور ان روایات کا بیشتر حصہ ان نصب العینوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اکابر ملت کی زندگیوں میں صورت پذیر ہوتے ہیں مسلمانوں کی تاریخ میں کردار کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ان کا رسولؐ زندگی کے ہر شعبے میں جس میں سیاست بھی داخل ہے ہمیشہ کے لئے ایک بصیرت افروز اسوہ حسنہ ہے۔ رسولؐ کے بعد وہ صالحین اور مصلحین ہیں جنہوں نے سیرت نبویؐ سے متاثر ہو کر اپنی سیرتوں کو ڈھالا اور اخلاف کے لئے بہترین نمونہ بنے۔ مرور ایام سے اسلاف کی زندگیوں کے نمونے انسانی ذہنوں میں دھندلے ہو جاتے ہیں لیکن قائداعظم محمد علی جناح زمانے کے لحاظ سے ایک معاصر ہستی ہیں ان کے کردار کو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو کو پرکھا ہے۔ قوم نے ہر قدم پر ان کے خلوص کا مشاہدہ کیا ہے اور اب ہر شخص اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر اس برعظیم کے مسلمانوں کو محمد علی جناح جیسا اپنے اصول میں اٹل اور حق پرست قائد میسر نہ آتا تو یہ عظیم اسلامی مملکت معرض وجود میں نہ آتی۔

قائداعظم کی سوانح عمریوں کا ایک جائزہ

خواجہ رضی حیدر

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی حیات و خدمات کے بارے میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۷ء تک یعنی تقریباً ۵۰ سال کے دوران اردو اور انگریزی میں ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً تین سو سے زائد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں تحقیقی، تاثراتی، موضوعاتی اور عمومی کتب کے علاوہ قائداعظم کی تقریروں، بیانات اور خطوط پر مشتمل مجموعے بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ایک سال میں قائداعظم پر اوسطاً ۵ سے ۶ تک نئی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں، مگر اس کے باوجود علمی حلقوں میں یہ شکوہ اپنی جگہ موجود ہے کہ قائداعظم کے بارے میں ابھی تک کوئی مستند اور جامع سوانح عمری شائع نہیں ہوئی ہے۔ یہ شکوہ ایک اعتبار سے محل نظر ہے کیونکہ تین سو سے زائد کتابوں کی اشاعت کے باوجود ابھی تک کوئی ایک ایسی کتاب نہیں ہے جو قائداعظم کی حیات و خدمات کا مکمل احاطہ کرتی ہو۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ قاری کا ذہن بھی ترقی کر رہا ہے۔ وہ جدید تحقیقی تقاضوں کے مطابق مختلف اہم و عظیم شخصیات پر لکھی گئی کتابوں کے تناظر میں قائداعظم کی شخصیت اور ان پر تحریر کی جانے والی کتابوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ دراصل اب جبکہ قیام پاکستان کو تقریباً پچاس سال ہو چکے ہیں قائداعظم کے بارے میں مطالعہ کے خواہشمند افراد کی تعداد میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی ہے جو تحریک پاکستان کے نہ شاہد ہیں نہ مجاہد۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ پاکستان کی آزاد فضاؤں میں تھے ایسی صورت میں تحریک پاکستان اور اس تحریک سے وابستہ شخصیات سے ان کی وہ جذباتی وابستگی نہیں جو ان سے پہلے کی نسل کا حصہ تھی۔ یہ لوگ جہاں جذباتیت سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں وہاں جزئیات کے بھی متقاضی رہتے ہیں کیونکہ شخصیات و واقعات کے باہم ارتباط و تعین میں ان کا حافظہ یا مشاہدہ

معاون کا کردار ادا نہیں کرتا۔ مزید بر آں وہ بیانیہ تاریخ کے دور سے نکل کر تجزیاتی تاریخ کے موڑ پر کھڑے ہیں اس لئے نتائج کے آرزو مند رہتے ہیں۔ سابق دور میں لکھی گئی کتابیں ان کے اس اشتیاق کی تسکین کا کام نہیں دیتیں ہیں بلکہ وہ ان کو صرف حوالہ جاتی کتب کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ قائداعظم کی حیات و خدمات پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو نہ صرف قائداعظم کی زندگی اور کارناموں کا مکمل احاطہ کرتی ہو بلکہ اپنے انداز و اسلوب اور مواد و مندرجات کی جامعیت کی بنا پر تادیر اپنی افادیت اور مطالعاتی کشش کو برقرار رکھ سکے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی باقاعدہ سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے اور وہ اپنی خدمات، سیاسی معاملہ فہمی، آزادانہ انداز فکر اور آئینی جدوجہد کی بنا پر اس قدر جلد ہندوستان گیر سطح پر ممتاز و مقبول ہو جاتے ہیں کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ قائداعظم کی اسی مقبولیت اور اہمیت کے پیش نظر ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی مقبول شاعرہ اور انڈین نیشنل کانگریس کی رہنما مسز سروجنی نائیڈو نے ان کے بارے میں انگریزی میں ایک کتاب "محمد علی جناح..... این ایمبیسیڈرر آف یونٹی" مرتب کی۔ یہ کتاب دراصل قائداعظم کی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۷ء تک کی تقاریر و بیانات کا مجموعہ تھی لیکن اس کے آغاز پر سروجنی نائیڈو نے قائداعظم کا ایک **سوانحی** خاکہ درج کیا تھا جس کی بناء پر ہم اسے نہ صرف قائداعظم پر لکھی جانے والی پہلی کتاب قرار دے سکتے ہیں بلکہ قائداعظم کی سوانح کے ضمن میں بھی شمار کر سکتے ہیں۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک یعنی تقریباً بیس سال کے دوران یہی ایک کتاب قائداعظم کے بارے میں **سوانحی** معلومات کا ماخذ رہی۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء کے دوران اخبارات و رسائل میں کچھ ایسے مضامین شائع ہوئے جن سے اس ضمن میں مزید تفصیلات کا اضافہ ہوا

لیکن ۱۹۴۴ء میں مدراس کے ایک صحافی اے اے رؤف کی کتاب "میٹ مسٹر جناح" نے اس خلا کو بڑی حد تک پر کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی **سوانحی** تفصیلات جاننے کی جو شدید خواہش اس دور میں یعنی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اسلامیان ہند کے دلوں میں موجود تھی اس کے پیش نظر اس کتاب کو فوری مقبولیت حاصل ہوئی اگرچہ اس کتاب میں بعض ایسی تفصیلات بھی موجود تھیں جن پر قائداعظم معترض ہوئے اور اے اے رؤف نے دوسرے ایڈیشن میں ان تفصیلات کو حذف کر دیا۔ ۱۹۴۵ء کے اواخر میں قائداعظم کے پرائیوٹ سیکرٹری مطلوب الحسن سید کی کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی جس کا نام تھا "محمد علی جناح اے پولی ٹیکل اسٹڈی۔"

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ قائداعظم کی سیاسی سوانح عمری تھی اور مطلوب الحسن سید نے اسے قائداعظم کے ہی ایماء پر لکھا تھا' اپنی ضخامت' مواد اور استناد کے لحاظ سے ۱۹۴۷ء تک اپنے موضوع پر یہ ایک جامع اور مفصل کتاب تھی۔ ہرچند اسی دور میں زیڈ اے **سلیری** کی کتاب "مائی لیڈر" اور سید عبدالطیف کی کتاب "دی گریٹ لیڈر" بھی منظر عام پر آئیں لیکن یہ دونوں کتابیں تاثراتی اور مختصر تھیں البتہ ان کا اسلوب دلکش اور موثر تھا۔

قیام پاکستان سے قبل اردو میں بھی قائداعظم کی چند سوانح عمریاں شائع ہوئیں اور ان کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کا جذباتی انداز تحریر ان کے اعتبار کی راہ میں حائل ہوتا چلا گیا۔ خصوصاً" عبدالعزیز بی ایس سی کی کتاب "قائداعظم" مطبوعہ ۱۹۳۹ء' رئیس احمد جعفری کی کتاب "حیات محمد علی جناح" مطبوعہ ۱۹۴۶ء اور خالد اختر افغانی کی کتاب "حالات قائداعظم" مطبوعہ ۱۹۴۷ء کو اردو پڑھنے والوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں اسی دور میں اردو ہی میں قائداعظم کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مضامین اور کتابچے بھی شائع ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود قائداعظم کی سوانح عمریوں میں کوئی

قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

قیام پاکستان اور خصوصا" قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ پھر قائداعظم کی ایک جامع اور مکمل سوانح عمری کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق لیکچرار اور تحریک پاکستان کے نہایت فعال قلم کار جمیل الدین احمد نے جو تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم کی تقاریر اور بیانات کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کر چکے تھے اس طرف توجہ دی۔ انہوں نے اس مجموعہ کا ترمیم و اضافہ شدہ اڈیشن مرتب کیا جبکہ اے اے صدیقی نے قائداعظم کے بارے میں مختلف واقعات کو ایک کتاب میں مرتب کر دیا اسی عرصہ میں سرکاری سطح پر قائداعظم کی سوانح عمری لکھوانے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی۔

قائداعظم کے دست راست اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان نے سوانح عمری لکھنے کے لئے پاکستان کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کرنل مجید ملک کے ذریعہ برطانوی سوانح نگار ہیک ٹربولائی تھو کا انتخاب کیا مگر بدقسمتی سے ہیک ٹربولائی تھو کا کام ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ نواب زادہ لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا چنانچہ بولائی تھو نے نہ صرف تاخیر سے کام شروع کیا بلکہ اس کو مواد و معلومات کی فراہمی اور حصول میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ہیک ٹربولائی تھو نے ۱۹۵۲ء میں قائداعظم کی سوانح عمری پر کام شروع کیا اور ۱۹۵۴ء میں ان کی کتاب شائع ہو گئی۔ کتاب کی تصنیف کے دوران بولائی تھو نے نہ صرف پاکستان اور بھارت کا دورہ کیا بلکہ برطانیہ میں موجود ایسے تمام افراد کے انٹرویوز کئے جن کی کسی نہ کسی حیثیت میں قائداعظم سے قربت یا ملاقات رہی تھی۔ مطلوب الحسن سید کا بیان ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح اس اہم ترین کام کے لئے ہیک ٹربولائی تھو جیسے غیر اہم اور غیر معروف مصنف

کے انتخاب سے خوش نہیں تھیں لہٰذا انہوں نے ہیک ٹربولائی تھو سے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بولائی تھو کے تصرف میں وہ دستاویزات نہ آسکیں جو محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بولائی تھو محترمہ فاطمہ جناح سے کوئی انٹرویو بھی نہیں کرسکا جو قائداعظم کے بارے میں سب سے معتبر راوی تھیں۔ چنانچہ بولائی تھو کی کتاب اپنی اشاعت کے فوراً بعد ہی بعض مندرجات کی بناء پر ہدف تنقید بن گئی۔ جن افراد نے اس کتاب کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ان میں محترمہ فاطمہ جناح سرفہرست تھیں۔

معروف افسانہ نگار و ادیب قدرت اللہ شہاب نے جو ۱۹۵۲ء میں وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈپٹی سیکرٹری تھے اور بعد میں بھی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اپنی خودنوشت سوانح "شہاب نامہ" میں ہیک ٹربولائی تھو کی کراچی آمد اور میٹروپول ہوٹل میں ان کے قیام کے بارے میں کچھ تفصیلات درج کی ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کا بیان ہے کہ "محترمہ فاطمہ جناح نے ہیک ٹربولائی تھو سے ملنے اور انہیں قائداعظم کے ذاتی کاغذات دکھانے سے منع کر دیا تھا.... ہیک ٹربولائی تھو صف اول کے ادیب تو نہ تھے لیکن انہیں روائتی طرز کی سوانح نگاری پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا اس وقت بہت سے دوسروں کی طرح مجھے بھی اس انتخاب پر مایوسی ہوئی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح کو بھی غالباً یہی اعتراض تھا کہ قومی اہمیت کے اس کام کے لئے ایک غیر ملکی شخص کو کیوں چنا گیا ہے، لیکن جب ۱۹۵۴ء میں بولائی تھو کی کتاب لندن میں ایک معروف **پبلی** شنگ ہاؤس سے شائع ہوئی تو بے شک اس نے بیرون ملک پاکستان کو متعارف کرانے میں ضرور کسی قدر مدد دی۔"

قائداعظم کے پرائیوٹ سیکرٹری اور سوانح نگار مطلوب الحسن سید جن سے راقم الحروف کو بھی تقریباً تیرہ سال نیاز حاصل رہا اکثر و بیشتر قائداعظم کی حیات و خدمات کے حوالے سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہیک ٹربولائی تھو کی کتاب قائداعظم کی پہلی سرکاری

سوانح عمری تھی اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی تحریر کردہ جس کی قائداعظم سے کبھی ملاقات یا قربت نہیں رہی چنانچہ اس کا قائداعظم کے بارے میں کوئی ذاتی تاثر بھی نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی جدید تاریخ اور مختلف سیاسی و مذہبی تحریکات کے بارے میں ہیکٹر بولائی تھو کا علم نہ ہونے کے برابر تھا ایسی صورت میں اگر اس نے دو سال کی مدت میں بذریعہ مطالعہ اپنی علمی استعداد میں اضافہ بھی کیا ہوگا تو وہ اضافہ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی بنیاد پر دو سال کے مختصر عرصہ میں وہ ان تحریکوں اور واقعات کے پس منظر یا ان کی رمزیت یا ان کے پس پردہ کارفرما مذہبی و سماجی عوامل سے پوری طرح آگاہ ہو سکتا۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر ہیکٹر بولائی تھو کی کتاب کو فوری طور پر سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ ہو سکی البتہ پرکشش انداز تحریر کی بناء پر اس کی مقبولیت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔" قائداعظم کے ایک اور سوانح نگار اور محترمہ فاطمہ جناح کے رفیق کار جی الانا نے ایک مرتبہ گفتگو کے دوران بتایا کہ "محترمہ فاطمہ جناح اول تو ہیکٹر بولائی تھو کے بہ حیثیت سوانح نگار انتخاب سے ہی مطمئن نہیں تھیں پھر جب اس کی کتاب سامنے آئی تو ان کے خدشات بڑی حد تک درست ثابت ہوئے۔ اور ان کو اس کتاب کے بعض مندرجات پر اس قدر اعتراض ہوا کہ انہوں نے اپنے عظیم بھائی کی سوانح عمری اپنی نگرانی میں لکھوانے یا خود لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔"

ہیکٹر بولائی تھو کی تصنیف کے مندرجات کی جانچ پڑتال کی ذمہ داری حکومت نے اس وقت کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کرنل مجید ملک کے سپرد کی تھی جنہوں نے اس کتاب کے مسودہ کی حتیٰ الامکان قطع و برید کر کے تقریباً" تمام ایسے حصے حذف کر دیئے تھے جو جزوی یا حتمی طور پر اختلافی یا نامعتبر ہو سکتے تھے مگر انہوں نے کتاب کی مطالعاتی کشش برقرار رکھنے کے لئے انداز تحریر کی ادبیت اور تخیل کی جاذبیت کو قلم زد نہیں کیا۔ اس بات کا اندازہ **ہیکٹر**

ہیک ٹربولائی تھو کی کتاب کے اس اصل مسودہ کی ٹائپ کاپی سے با آسانی کیا جاسکتا ہے جو کرنل مجید ملک کی ایڈیٹنگ اور مصنف کے ساتھ ہونے والی کرنل مجید کی خط و کتابت کے ساتھ آکسفورڈ یونیورسٹی کے آرکائیوز میں محفوظ ہے اور جس کی فوٹو کاپی راقم الحروف کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہیک ٹربولائی تھو نے یہ سوانح عمری جناح: کری ایٹر آف پاکستان کے نام سے لکھی تھی لیکن طباعت سے قبل یہ نام تبدیل کر کے رکھ دیا گیا۔ بولائی تھو کی کتاب کا انگریزی ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں لندن کے ایک معروف پبلشر ''جان مرے'' نے شائع کیا تھا جبکہ اردو ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں لاہور سے مرکزی مجلس ترقی اردو نے شائع کیا۔ اردو ترجمہ زہیر صدیقی کا تھا جو نہ صرف معروف صحافی تھے بلکہ بحیثیت طالب علم تحریک پاکستان سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہیک ٹربولائی تھو نے اپنی کتاب کے آخری ابواب مکمل کرنے کے بعد کرنل مجید ملک کے نام ۲۵ اپریل ۱۹۵۳ء کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اس کتاب کا انگریزی اور اردو ایڈیشن بیک وقت شائع کیا جائے۔ اردو ترجمہ کے لئے بولائی تھو نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کراچی کے ایڈیٹر فرید ایس جعفری کا نام تجویز کیا تھا۔

قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے کہ ''محترمہ فاطمہ جناح کی اپنی خواہش یہی تھی کہ قائداعظم کی سوانح حیات کسی پاکستانی اہل قلم کے ہاتھوں مرتب ہو۔'' اس بیان کی تصدیق جی. الانا کی گفتگو سے بھی ہوتی ہے جنہوں نے پہلے محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ مل کر ''مائی برادر'' نامی کتاب کے مسودہ پر کام کیا اور بعد میں یعنی ۱۹۶۷ء میں خود ان کی تصنیف کردہ ایک کتاب لاہور سے شائع ہوئی جس کا نام تھا ''قائداعظم جناح دی اسٹوری آف اے نیشن''۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ ممتاز شاعر رئیس امروہوی نے کیا تھا۔ پروفیسر شریف المجاہد جنہوں نے ''مائی برادر'' کے نامکمل مسودہ کی ایڈیٹنگ کے بعد اسے کتابی صورت دی ہے اس کتاب کی تصنیف کی تفصیلات درج کرتے ہوئے اپنے پیش لفظ میں انہوں لکھا ہے کہ ''ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ اپنے نامور بھائی قائداعظم کی سوانح لکھنے یا مرتب کرنے کا خیال محترمہ فاطمہ جناح کو اس وقت آیا جب ۱۹۵۴ء میں ہیک ٹربولائی تھو کی کتاب شائع ہوئی۔ اگرچہ وہ ایک اچھی سوانح تھی مگر اس کا انحصار زیادہ تر جناح کے ہم پیشہ مقربین' سیاسی رفقاء اور مبصرین کی ذاتی یادداشتوں اور تاثرات پر تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بولائی تھو کی کتاب جناح کی وہ حقیقی تصویر پیش کرنے میں کسی حد تک ناکام رہی جو ان کی عظیم الشان سیاسی جدوجہد اور کارناموں کی روشنی میں سامنے آتی ہے۔"

محترمہ فاطمہ جناح چونکہ ہیک ٹربولائی تھو کی کتاب سے مطمئن نہیں تھیں اس لئے انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے بعد ایک ایسے پاکستانی مصنف کی تلاش شروع کردی جو قائداعظم کی سوانح پر کام کرنے کا مکمل طور پر اہل ہو۔ بقول پروفیسر شریف المجاہد "ان کا خیال تھا کہ صرف ایک پاکستانی اور خصوصا" ایک ایسا پاکستانی جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے تاریخ ساز عشرہ کے دوران مسلم ریاست کے ارتقاء کے بارے میں مکمل اور موثر بصیرت رکھتا ہو وہ ہی اس پیچیدہ عشرہ کی منظر کشی اور قائداعظم اور ان کے مشن کے ساتھ انصاف کرنے کا کما حقہ اہل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں فاطمہ جناح کا پہلا انتخاب اسلامیہ کالج کلکتہ کے سابق پرنسپل اور بعد ازاں راج شاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عترت حسین زبیری تھے۔ جب پروفیسر زبیری ۱۹۵۹ء میں بوجوہ امریکہ چلے گئے تو محترمہ فاطمہ جناح نے اس مقصد کے لئے جسٹس ایم آر کیانی کو منتخب کیا لیکن جسٹس کیانی ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو اچانک انتقال کر گئے چنانچہ اب فاطمہ جناح کی نگاہ انتخاب جی الانا پر پڑی۔ جی الانا نے تقریبا" اٹھارہ ماہ تک جناح کی سوانح لکھنے کے سلسلے میں فاطمہ جناح کی معاونت کی لیکن ۱۹۶۴ء میں محترمہ فاطمہ جناح کو حزب اختلاف کے نمائندہ کی حیثیت سے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑنے پر آمادہ کیا گیا تو یہ سلسلہ چند ایسی وجوہات کی بنا پر منقطع ہو گیا جو آج بھی پردہ اخفا

میں ہیں۔" پروفیسر شریف المجاہد کے اس بیان سے کسی حد تک یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی کی اپنے حسب منشا ایک سوانح عمری مرتب کرنا چاہتی تھیں لیکن حالات کی ناسازگاری نے ان کے اس منصوبے کو مکمل نہیں ہونے دیا۔ البتہ فاطمہ جناح کے جولائی ۱۹۶۷ء میں انتقال کے بعد جی الانہ کی کتاب شائع ہوئی جس کو ایک پاکستانی مصنف کی اس ذیل میں ایک عمدہ کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ فاطمہ جناح نے جی الانا کے تعاون سے جس سوانح پر کام کیا تھا اس کے صرف تین ابواب مکمل ہوئے تھے جو ایک ٹائپ شدہ اسکرپٹ کی صورت میں تھے اور محترمہ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد ان کی رہائش گاہ "موہٹہ" سے قائداعظم کے کاغذات کے ساتھ ملے تھے۔ گمان غالب ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح نے اس مسودہ پر جی الانا کے ساتھ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء کے دوران کام کیا جس کا ثبوت اس مسودہ پر تحریر اس فقرہ سے ملتا ہے کہ "یہ مسودہ فاطمہ جناح نے جی الانا کے تعاون سے مکمل کیا۔" بہرحال فاطمہ جناح کی کتاب کا یہ مسودہ اگرچہ نامکمل ہے لیکن اس سے بیشتر نئی معلومات سامنے آئیں اور بعد میں متعدد سوانح نگاروں نے اس مسودہ کے مندرجات کو اپنی تصانیف میں حوالے کے طور پر استعمال کیا۔ یہ مسودہ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب قائداعظم کی زندگی کے آخری سال کے بارے میں ہے دوسرا باب قائداعظم کے خاندانی حالات اور ان کی ابتدائی زندگی کو ظاہر کرتا ہے اور تیسرا باب ان کی بحیثیت طالب علم لندن میں قیام اور بحیثیت وکیل جدوجہد کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر شریف المجاہد نے ۱۹۸۷ء میں اس مسودہ کی تدوین کی اور حاشیہ لگایا اور پہلی مرتبہ یہ مسودہ کتابی صورت میں قائداعظم اکادمی سے "مائی برادر" کے نام سے شائع ہوا۔ راقم الحروف نے اس کا اردو میں ترجمہ "میرا بھائی" کے عنوان سے کیا جو ۱۹۸۸ء میں قائداعظم اکادمی سے ہی شائع ہوا۔

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۶ء تک قائداعظم کی سوانح عمریوں میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا البتہ

اعظم پیپرز، فریڈم موومنٹ آرکائیوز اور شمس الحسن کلیکشن میں شامل دستاویز سامنے
ہیں۔ خصوصاً" ۱۹۷۶ء میں قائداعظم کے صد سالہ جشن پیدائش پر منعقد ہونے والی
کانگریس میں متعدد ایسے اہم مقالے پڑھے گئے جن میں ان دستاویزات سے مدد لی گئی تھی۔
کٹر احمد حسن دانی نے بعد میں ان مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کر کے اہم کام سرانجام
۔ ۱۹۸۱ء میں پروفیسر شریف المجاہد کی ایک کتاب "قائداعظم اسٹیڈیز ان انٹرپری ٹیشن۔" کو
بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب اگرچہ سوانح عمری کے ذیل میں نہیں آتی لیکن اس میں
قائداعظم کی حیات و خدمات کا تجزیاتی انداز میں اس طرح احاطہ کیا گیا کہ نہ صرف بین
قوامی سطح پر اسے پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ ۱۹۸۶ء میں اس کتاب کو صدارتی ایوارڈ کا مستحق
بھی قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء کے بعد قائداعظم کی اردو سوانح عمریوں میں راقم الحروف کی کتاب "
قائداعظم کے ۷۲ سال" رضوان احمد کی کتاب " قائداعظم کے ابتدائی تیس سال" اور پروفیسر
کرم حیدری کی کتاب "ملت کا پاسبان" منظر عام پر آئیں۔ عزیز جاوید کی کتاب "قائداعظم اور
سرحد" ۱۹۷۷ء میں احمد سعید کی کتاب "حیات قائداعظم چند نئے پہلو" ۱۹۷۸ء میں اور
اشتیاق اظہر کی کتاب "قائداعظم اور مسلم صحافت" ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۷ء سے
۱۹۹۷ء تک اردو میں کے ایچ خورشید کی کتاب قائداعظم کی یادیں، ستار طاہر کی کتاب "اپنا
قائداعظم ایک"" زاہد حسین انجم کی کتاب "سیرت قائداعظم" اور راقم الحروف کی کتاب "
قائداعظم کی رفیقہ حیات: رتی جناح" شائع ہوئی۔ یہ تمام کتابیں نئی معلومات پر مشتمل تھیں
اس کے باوجود ان کتابوں کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جو عموماً" انگریزی کتابوں کو حاصل ہو
جاتی ہے۔

۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر ریاض احمد کی انگریزی کتاب قائد اعظم محمد علی جناح: دی فار میٹوائرز
1920-1892ء شائع ہوئی یہ دراصل ریاض احمد کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا جسے انہوں نے کتابی

صورت دے دی۔ اس مقالے میں ریاض احمد نے قائداعظم کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایسی نئی معلومات جمع کر دی ہیں جو اس سے پیشتر منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ اس طرح یہ کتاب سوانح عمری کے ذیل میں ایک بنیادی کتاب ہو گئی ہے۔ قائداعظم کی حیات و خدمات یا قائداعظم کے خطوط' دستاویزات' تقاریر اور دیگر تحریروں کے حوالے سے سید شریف الدین پیرزادہ' مرزا ابوالحسن اصفہانی' سید ہاشم رضا' ڈاکٹر رفیق افضل' ڈاکٹر سرفراز مرزا' لطیف احمد شیروانی' ڈاکٹر ریاض احمد' پروفیسر احمد سعید' رضوان احمد' سید شمس الحسن اور ڈاکٹر وحید الزماں کی بھی اہم تصانیف و تالیفات شائع ہوئی ہیں اور یہ تمام کتابیں ایک جامع سوانح عمری کی تصنیف میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں امریکی پروفیسر ڈاکٹر اسٹینلے واپرٹ کی کتاب "جناح آف پاکستان" منظر عام پر آئی۔ واپرٹ سماجی علوم کے ایک سنجیدہ طالب علم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کی تصنیف میں جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں تمام بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا ہے ان کا انداز تحریر پر کشش اور غیر جانبدرانہ ہے لیکن اس کے باوجود بعض بے بنیاد مندرجات ان کی کتاب کا حصہ بن گئے اور یہ کتاب اپنی اشاعت کے ساتھ ہی تنقید کی زد میں آگئی لیکن مجموعی طور پر اس کتاب سے قائداعظم کی شخصیت اور عظمت اجاگر ہوتی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں معروف صحافی عزیز بیگ کی کتاب۔ جناح اینڈ ہز ٹائمز اے بایو گرافی شائع ہوئی۔ یہ شاید قائداعظم کی سب سے ضخیم سوانح عمری تھی لیکن اس کا نہ صرف انداز صحافیانہ تھا بلکہ اس میں ایسی غیر ضروری تفصیلات کو شامل کرلیا گیا کہ اصل موضوع کی جامعیت مجروح ہو گئی۔ عزیز بیگ نے بھی کچھ نئی سوانحی معلومات درج کی ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ ایک جامع سوانح عمری پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں پروفیسر شریف المجاہد کی ایک اور تالیف قائداعظم اینڈ ہز ٹائمز کی جلد اول شائع ہوئی۔ جس میں قائداعظم کے ۱۸۷۶ء سے ۱۹۳۷ء تک کے روز و شب کی مصروفیات کے تقریباً ساڑھے

پانچ ہزار اندراجات شامل ہیں۔ یہ ایک بنیادی نوعیت کی رہنما کتاب ہے جس سے قائداعظم کے بے شمار نئے سوانحی گوشے سامنے آئے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری جلد شائع ہو جانے کے بعد بلاشبہ قائداعظم کی سوانح لکھنے کے خواہش مند تحقیق کاروں کو ایک ایسی کتاب میسر آجائے گی۔ جس کی بنیاد پر وہ ایک جامع سوانح عمری مرتب کر سکیں گے۔ ۱۹۹۵ء میں سعد آر خیری کی کتاب جناح: ری انٹرپرٹیڈ شائع ہوئی۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ مصنف کے نقطہ نظر کی آئینہ دار ہے اور انہوں نے اس دائرہ میں رہتے ہوئے نئے اور پرانے ماخذ پر مبنی سوانح پیش کی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کے صد سالہ جشن پیدائش کے موقع پر ۱۹۷۶ء میں ایک تحقیقی ادارہ حکومت نے قائداعظم اکادمی کے نام سے قائم کیا تھا جس نے گزشتہ بیس سال کے دوران ساٹھ کتابیں انگریزی اردو اور پاکستانی زبانوں میں شائع کی ہیں۔ یہ تمام کتابیں بنیادی نوعیت کی تحقیقی کتابیں ہیں اور قائداعظم پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ افراد کے افعال و افکار اور ان کی شخصیت و کردار سے بر آمد ہونے والے نتائج کا مجموعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں تاریخ میں حالات و واقعات کا تحرک موجود ہوتا ہے وہاں افراد و اشخاص کی سرگرمیوں کی روداد بھی شامل ہوتی ہے اس لئے یہ باور کیا جاتا ہے کہ تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس دور کے افراد کی سوانح سامنے موجود نہ ہو۔

قائداعظم محمد علی جناح ..... معمار پاکستان

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

قائداعظم محمد علی جناح نے جب سیاسی زندگی کا آغاز کیا تو وہ برصغیر کی قوم پرست سیاست سے وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے جن سیاسی رہنماؤں سے فیض حاصل کیا ان میں گوکھلے، دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی اور سی آر داس کے نام سرفہرست ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں جب دادا بھائی نوروجی نے کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی تو قائداعظم نے ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے اہم خدمات سرانجام دیں۔ وہ اول دن سے ہندو مسلم اتحاد کے سخت حامی تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اس اتحاد کے بغیر ناممکن ہے۔ کانگریس کے اہم سیاسی رہنما ہونے کے باوجود قائداعظم کی دلچسپی مسلمانوں کے مفادات کے ساتھ ہمیشہ قائم رہی۔ انہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی اور اگرچہ شروع شروع میں وہ مسلم لیگ کے باضابطہ رکن نہیں بنے تھے تاہم لیگ کو ان کے مشوروں اور حمایت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں مسلم لیگ کونسل کے جو جلسے ہوئے ان میں قائداعظم کو شرکت کی دعوت دی گئی اس کے بعد مسلم لیگ میں تیزی سے سیاسی شعور بیدار ہونے لگا۔ ۱۹۱۲ء میں آغا خاں کی صدارت میں مسلم لیگ کے دائرہ عمل میں مزید توسیع ہوئی۔ ۱۹۱۳ء کے اجلاس لکھنؤ میں قائداعظم کی کوششوں سے مسلم لیگ کا نصب العین یہ طے پایا کہ آئینی طریقوں سے ہندوستان کے لئے تاج برطانیہ کے تحت حکومت خود اختیاری حاصل کی جائے اور اس مقصد کے لئے عوام کا تعاون حاصل کر کے موجودہ آئین میں ترمیم کرائی جائے۔

۱۹۱۳ء میں قائداعظم آرام کرنے کی غرض سے کچھ عرصے کے لئے گوکھلے کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں آغا خاں مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے تھے اور اب اس کے صدر راجہ محمود آباد اور سیکرٹری سید وزیر حسن تھے۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی اور سید

یر حسن مسجد کانپور کے انہدام کے بعد ہونے والے واقعات سے برطانوی عوام کو آگاہ کرنے، نیز مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے سلسلے میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے لندن گئے۔ وہاں ان حضرات کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی تو انہوں نے قائداعظم سے مسلم لیگ کے باضابطہ رکن بننے کی درخواست کی۔ قائداعظم اس شرط کے ساتھ مسلم لیگ کے رکن بن گئے کہ اس رکنیت سے ان کے کانگریس کے ساتھ تعلق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے بیک وقت رکن اور برصغیر کے ہردلعزیز رہنما ہونے کی حیثیت سے قائداعظم کے لئے یہ ممکن تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک دوسرے کے قریب لائیں اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد مضبوط کریں قائداعظم کی سیاسی زندگی کے دو اہم مقاصد بھی تھے۔ (۱) ہندو مسلم اتحاد اور (۲) برصغیر کی آزادی۔ اور قائداعظم ان مقاصد کے حصول کے لئے انتھک کوشش کرتے رہے۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں کراچی کے اجلاس میں کانگریس کے صدر نے مسلم لیگ کے نئے سیاسی موقف کو سراہتے ہوئے یہ کہا کہ میں پورے خلوص کے ساتھ مسلم لیگ کی اس خواہش کی تائید کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہونی چاہئے۔ ماضی میں اگر ہمارے درمیان غلط فہمیاں موجود تھیں تو اب انہیں فراموش کر دینا چاہئے۔ اسی ماہ میں مسلم لیگ کا اجلاس سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں آگرہ میں منعقد ہوا۔ صدر نے اپنے خطبہ میں یہ اعلان کیا کہ دونوں قوموں کے درمیان یک طرفہ تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔ اکثریت کو اپنا دل ٹٹولنا چاہئے کہ آیا وہ اقلیت کے ساتھ منصفانہ سلوک کر رہی ہے یا نہیں۔ سر ابراہیم نے یہ بھی کہا کہ برصغیر پر برطانوی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک نہ ایک دن یہ ملک آزاد ہو کر رہے گا۔

مسلم قوم کا انداز فکر سر ابراہیم کے خطبہ صدارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے کیا خدشات لاحق تھے اس کے باوجود قائداعظم جو

دونوں بڑی سیاسی جماعتوں سے منسلک تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد مفاہمت پیدا کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرتے رہے۔

۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا کوئی اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۵ء میں جب کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہونے والا تھا تو قائداعظم نے کوشش کی کہ مسلم لیگ کا اجلاس بھی بمبئی میں ہو۔ حکومت کی طرف سے ہر ممکن کوشش اس بات کی ہوئی کہ دونوں اجلاس ساتھ ساتھ منعقد نہ ہو سکیں۔ بالآخر حکومت کی ایک نہ چلی اور کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ساتھ ساتھ منعقد ہوئے۔ لیگ کے اجلاس میں کانگریسی رہنماؤں گاندھی جی، سریندر ناتھ بنرجی، چمن لال سیتل واد اور سروجنی نائیڈو کی موجودگی میں لیگ کے صدر مظہرالحق نے حکومت پر سخت نکتہ چینی کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ملک میں ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے زبردست تالیوں کی گونج میں کانگریسی رہنماؤں نے اپنے مسلم لیگی ساتھیوں کو گلے لگالیا۔ دوسرے دن لیگ کا اجلاس ہنگاموں کی نذر ہو گیا لیکن تیسرے دن کے اجلاس میں جو تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوا قائداعظم نے اس مفہوم کی ایک قرارداد پیش کی کہ لیگ ایک کمیٹی بنائے جو آزادی کے مطالبے کے پیش نظر دوسری سیاسی تنظیموں کے صلاح و مشورے سے ایک ایسی تجویز تیار کرے جس میں مسلمانوں کے مفادات کا مکمل تحفظ ہو۔

اس مقصد کے لئے کانگریس نے بھی ایک کمیٹی بنائی۔ بالآخر دونوں کمیٹیوں نے کافی غور و فکر کے بعد سیاسی اصلاحات کا ایک مسودہ تیار کیا جو نومبر ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے اجلاس میں پیش ہوا۔ قائداعظم کی تحریک پر مجلس قانون ساز کے منتخب ارکان نے جن کی تعداد قائداعظم سمیت کل انیس تھی، لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے کی توثیق کی، اور ایک یادداشت وائسرائے کے سامنے پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یادداشت میں تجویز کردہ سیاسی اصلاحات پر عمل درآمد کیا جائے۔ یہ بات اہم ہے کہ جداگانہ انتخابات کو

کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ انیس ممبروں کی یادداشت نے بھی تسلیم کیا تھا۔

قائداعظم نے احمد آباد میں بمبئی کی صوبائی سیاسی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اپنی ارتی تقریر میں کہا:

"میں جانتا ہوں کہ جداگانہ انتخاب کا مسئلہ پالیسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسلمانوں نظر میں اس کی حیثیت بنیادی مطالبے کی ہے۔ مسلمان عوام طویل عرصے تک نظرانداز جانے کے بعد اب یہ خواہش کرتے ہیں کہ ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ لہٰذا میں اپنے ہندو بھائیوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہندوستانی مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ نوکر شاہی کے اختیارات جمہوریت کو منتقل کردیئے جائیں اور یہ مقصد ہندو مسلم اتحاد سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

بالاخر لکھنؤ میں ایک بار پھر لیگ اور کانگریس کے اجلاس ساتھ ساتھ منعقد ہوئے۔ قائداعظم کو لیگ کے اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا۔

"میں ہمیشہ کانگریس کا پرجوش حامی رہا ہوں اور فرقہ پرستی سے میرا دامن کبھی آلودہ نہیں کبھی کبھی مسلمانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ علیحدگی پسند ہیں لیکن اس وقت یہ الزام کھوکھلا نظر آتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ فرقہ پرست جماعت کس تیزی سے متحدہ ہندوستان کی تشکیل میں طاقتور عنصر بنتی جارہی ہے"

قائداعظم نے ان الفاظ کے ساتھ لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے پر اپنی منظوری دی۔

"جہاں تک متحدہ ہندوستان کے سیاسی مقاصد کا تعلق ہے آل انڈیا مسلم لیگ انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دے گی اور وطن دوستی کے جذبے کے ساتھ ہندوستان کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی جائیں گی، لیگ ان میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی۔"

انہوں نے مزید فرمایا۔

"میں مطمئن ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قطعی سمجھوتہ ہو گیا ہے اس سمجھوتے سے ہمارے ملک کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے"

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ہم دشوار ترین مرحلے سے گزر گئے ہیں اور اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے آدھی جنگ جیت لی ہے۔

لکھنؤ میں مسلم لیگ اور کانگریس کی یہ مفاہمت "میثاق لکھنؤ" کے نام سے منظور ہوئی۔ اس میثاق کے اثرات مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر بھی پڑے علاوہ ازیں اس سے ہندو مسلم اتحاد کی وہ بنیاد پڑی جس کی مثال ملکی سیاست کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں اس میثاق کو بہت دخل ہے۔

۱۹۱۵ء میں گوکھلے اور فیروز شاہ مہتا کی وفات سے ملک کی سیاسی زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا لیکن عین اسی وقت ہندوستان کے میدان سیاست میں مسز اینی بیسنٹ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور پرجوش طبعیت کے ساتھ نمودار ہوئیں انہوں نے روحانیت کی سرگرمیوں کو خیرباد کہا اور برصغیر کی آزادی کے لئے زیادہ موثر اقدام اور تیز جدوجہد کی تلقین شروع کی۔ جلد ہی نوجوان اور ترقی پسند عناصر ان کے ہمنوا ہو گئے۔

یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مدراس میں مسز اینی بیسنٹ نے "آل انڈیا ہوم رول لیگ" کے قیام کا اعلان کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں طلبا وکیل ڈاکٹر پروفیسر اور صحافی ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ عورتوں کی کثیر تعداد اس تحریک سے وابستہ ہو گئی۔ جون ۱۹۱۷ء میں مسز بیسنٹ کو ان کے دو ساتھیوں کے ہمراہ نظر بند کر دیا گیا۔ اس نظر بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ آزادی کی علامت بن گئے اور اس سے ہوم رول کی تحریک میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

اسی زمانے میں قائداعظم محمد علی جناح بھی ہوم رول لیگ سے وابستہ ہوئے۔ وہ ہوم رول

لیگ کی بمبئ شاخ کے صدر مقرر ہوئے تو انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو تندہی سے نبھایا۔ ہوم رول لیگ کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنے ایک بیان میں فرمایا میں یہ حقیقت دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں اور ہماری تنظیم بھی اسی کے لئے کوشاں ہے کہ لکھنؤ میں اصلاحات کی جو سکیم منظور کی گئی تھی اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہوم رول لیگ عوام کی تربیت کرتی ہے اور کانگریس غور و فکر کرنے والی جماعت ہے۔"

۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کو کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح سر تیج بہادر سپرو' سر سری نواس شاستری اور سر سید وزیر حسن پر مشتمل ایک وفد انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے متحدہ مطالبات کے حق میں' جنہیں مجلس قانون ساز کے انیس ممبروں کی تائید بھی حاصل تھی' برطانوی سیاستدانوں اور رائے عامہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ یہ وفد ستمبر میں انگلستان روانہ ہوا جہاں اس نے برطانوی سیاست دانوں کو ہندوستان کی صورتحال سے آشنا کیا اور اپنے مطالبات کے حق میں کافی حد تک ان کی رائے ہموار کی۔

۱۹۱۷ء کے آخر میں جب چمبرلین اور مانٹیگو وزیر ہند نے ہندوستان کا دورہ کیا تو ان سے متعدد وفود ملے۔ مانٹیگو نے مسلم لیگ اور کانگریس کے معاہدے کو تسلیم کر لیا۔ اس سے قائداعظم کو بڑی خوشی ہوئی کہ ان کی محنت بالاخر ٹھکانے لگی۔ مانٹیگو نے مسلم لیگ اور کانگریس کے اشتراک کی صورتحال سے متاثر ہو کر اپنے روزنامچے میں لکھا:

"ہمیں اب ہندوستان کے عظیم سیاست دانوں کا سامنا کرنا تھا۔ ان کا تعلق کسی ایک صوبے سے نہ تھا بلکہ یہ مختلف صوبوں کے صف اول کے رہنما تھے جن میں مکمل تعاون اور ہم آہنگی موجود تھی۔ بنگال کے تجربہ کار سیاست دان سر سندر ناتھ بنرجی سی پی کے مدھولکر'

بمبئی سے جناح، بہار اور اڑیسہ سے مظہر الحق اور حسن امام، ان کے علاوہ گاندھی مسز بیسنٹ وغیرہ، غرض یہ کہ تحریک کے تمام بڑے رہنما یہاں موجود تھے۔"

قائداعظم کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مانٹیگو لکھتے ہیں۔

"ان تمام لوگوں کی قیادت نوجوان، خوش اخلاق، دلوں کو موہ لینے والی شخصیت، مدلل گفتگو کرنے والے اور اپنی پوری اسکیم منظور کرانے پر مصر۔ جناح کے ہاتھ میں تھی۔ ان کا مطالبہ تو بس ذمہ دار حکومت کا قیام تھا، اس کے علاوہ کسی اور چیز سے انہیں مطمئن کرنا مشکل تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ مطالبہ منظور نہ ہوا تو ہم کچھ بھی قبول نہیں کریں گے۔ میں بری طرح تھک گیا تھا اس لئے میں نے بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا چیمسفورڈ نے ان سے بحث کرنی چاہی، لیکن انہوں نے اسے بھی لاجواب کردیا۔ جناح بہت زیرک آدمی ہیں اور یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ ایسا شخص خود اپنے ملک کے نظم و نسق سے بے تعلق رہے۔"

جب وائسرائے نے رولٹ بل جیسے کالے قوانین کی منظوری دے دی تو ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو قائداعظم نے امپریل کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے وائسرائے کو ایک کھلی چٹھی بھیجی جس میں یہ لکھا:

"میں اس مسودہ قانون کی منظوری اور اس قانون کی منظوری کے طریق کار کے خلاف بطور احتجاج امپریل کونسل سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں کونسل میں میری شمولیت ملک کے عوام کے لئے بے کار ہے اور یہ امر کسی شخص کے عزت نفس کے منافی ہے کہ وہ ایسی حکومت سے تعاون کرے جس نے کونسل کے ایوان میں عوامی نمائندوں اور ایوان سے باہر ملک بھر کے عوام کی رائے کو بالکل نظر انداز کردیا ہو میں سمجھتا ہوں کہ جو کوئی حکومت زمانہ امن میں اس قسم کے قانون منظور کرتی ہے، اسے مہذب حکومت نہیں کہا جاسکتا مجھے اب بھی یہ امید ہے کہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو تاج برطانیہ کو یہ مشورہ دیں گے کہ

اس سیاہ قانون کی منظوری نہ دی جائے۔"

اس وقت قائداعظم کانگریس ہوم رول لیگ اور مسلم لیگ تینوں جماعتوں کے رکن تھے۔ مسز اینی بیسنٹ نے رولٹ ایکٹ کی مخالفت کو روکنے کے لئے ایک موقع پر یہ کہہ دیا کہ "جب مشتعل گروہ فوجیوں پر پتھراؤ کرنا شروع کر دے تو انہیں چند باڑھ چلانے کا حکم دینا رحمدلانہ اقدام ہے۔" اس پر مسز بیسنٹ "اینٹ پتھر کے بدلے گولی پر یقین رکھنے والی خاتون" کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ قائداعظم کو مسز بیسنٹ پر جو اعتماد تھا وہ بری طرح مجروح ہوا۔ پنجاب میں جو مظالم مارشل لاء حکومت نے کئے تھے اس سے بھی وہ بہت متاثر تھے۔

مسز بیسنٹ کی مقبولیت کم ہو رہی تھی اور ہوم رول لیگ کے نمایاں ممبران ان کی جگہ گاندھی جی کو تحریک کا صدر بنانا چاہتے تھے۔ بالاخر گاندھی جی ہوم رول لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ جلد ہی سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی مسز بیسنٹ سے زیادہ مطلق العنان ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے ہوم رول لیگ کے مقاصد میں تبدیلیوں کی تجویز پیش کی۔ ۳۰ اکتوبر کو بمبئی کے عام اجلاس میں اس پر غور کیا گیا۔ قائداعظم ان چند لوگوں میں تھے جنہوں نے ڈٹ کر تجویز کی مخالفت کی ایم آر جیکر، کے ایم منشی منگل داس پکواسہ اور جمناداس دوار کاداس نے قائداعظم کی تائید کی۔ گاندھی جی تجویز کے حق میں تھے وہ اجلاس کے صدر بھی تھے۔ بالاخر ان کی ہٹ دھرمی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے قائداعظم نے دیگر ارکان کے ساتھ ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔

ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دینے کے بعد قائداعظم کو گاندھی جی کا ایک خط موصول ہوا۔ جس میں ان سے اپنے استعفیٰ پر نظر ثانی کرنے کو کہا گیا تھا۔ قائداعظم نے گاندھی جی کو جو خط لکھا وہ بہت اہم ہے۔

"آپ نے ملک کی نئی زندگی میں میری شرکت کے متعلق جو تجویز کی ہے میں اس کا شکریہ

ادا کرتا ہوں اگر اس نئی زندگی سے آپ کی مراد اپنے طریقے اور پروگرام ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ میں انہیں قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا حاصل تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ لیکن صحیح معنوں میں ملک کی نئی زندگی یہ ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک ایسی حکومت سے ہے جو عوام کی شکایات' جذبات و احساسات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ یہ کہ ہمارے اہل وطن متحد نہیں ہیں۔ یہ کہ آپ اب تک جتنے اداروں سے بھی منسلک رہے ہیں آپ کے طریق کار سے ان کا شیرازہ بکھر گیا ہے اور ملک کی سیاسی زندگی میں نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں' مسلمانوں اور مسلمانوں' یہاں تک کہ باپ اور بیٹوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے ملک بھر میں لوگ عام طور پر انتہائی مایوس ہیں اور آپ کے انتہا پسندانہ پروگرام سے زیادہ تر نا تجربہ کار نوجوان اور کم فہم و ناخواندہ افراد متاثر ہوئے ہیں ان تمام باتوں کا مطلب بد نظمی اور افراتفری کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے جو نتائج ہوں گے میں ان کے تصور سے کانپ جاتا ہوں لیکن ایک بات پر مجھے یقین ہے اور وہ یہ کہ اس کا سبب بنیادی طور پر حکومت کی موجودہ پالیسی ہے جب تک یہ سبب دور نہ ہو گا اثرات موجود رہیں گے بے چینی کے اسباب کو دور کرنا میرے بس کی بات نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے وطن کے عوام کا شیرزاہ اس طرح منتشر ہو جائے۔ قوم پرست عناصر کے لئے صرف ایک راستہ موجود ہے اور وہ یہ کہ متحد ہو کر کوئی ایسا پروگرام مرتب کریں کہ مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے ملک بھر میں اتفاق رائے ہو سکے۔ کوئی فرد واحد پروگرام تیار نہیں کر سکتا۔ یہ کام ملک کے ممتاز قوم پرست رہنماؤں کو سرانجام دینا ہو گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مجھے یقین ہے کہ میں اور میرے ساتھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔"

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں گاندھی جی کی قرارداد کے مطابق کانگریس کا لائحہ عمل تبدیل کر دیا گیا۔ اس سے پہلے کانگریس کا مقصد دستوری اور آئینی

طریقوں سے قومی اتحاد کے ذریعے نظم و نسق میں اصلاح کرانا تھا۔ گاندھی جی کی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ "انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی عوام تمام جائز اور پر امن طریقوں سے سوراج حاصل کریں۔ چمن لال سیتل واد لکھتے ہیں کہ جناح نے اس بنیادی تبدیلی کی شدید مخالفت کی اور حاضرین کی اکثریت کی خلل اندازی کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس کے بعد وہ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔"

گاندھی جی اور قائداعظم کے راستے اب الگ الگ تھے۔ اس زمانے میں گاندھی جی ملکی سیاست میں اتنا رسوخ رکھتے تھے کہ ان کے ذرا سے اشارے پر سیاسی لیڈر عوام میں نامقبول ہو جاتے تھے۔ مگر قائداعظم اصولوں کے پابند تھے وہ کسی مصلحت کے قائل ہی نہ تھے۔ پورے برصغیر میں گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کا زور تھا، مگر قائداعظم ان چند سیاسی رہنماؤں میں تھے جو اس تحریک سے الگ تھے۔ ۱۹۲۱ء کے آخر میں حکومت نے گاندھی جی کے مخالفین کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کی تحریک کا توڑ کیا جا سکے۔ قائداعظم نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور ایک اخباری بیان میں کہا:

"عدم تعاون کی تحریک عام بے اطمینانی کی ایک علامت اور اس کا اظہار ہے۔ یہ بے اطمینانی رائے عامہ اور بڑے بڑے مسائل کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ دانشور اور معقول افراد بھی حکومت کی موجودہ پالیسی سے کسی طرح مطمئن نہیں ہیں۔"

قائداعظم محمد علی جناح ان لوگوں میں سے تھے جنہیں کسی قیمت پر خریدا نہیں جاسکتا تھا۔ انہوں نے کبھی برطانوی حکومت کی وفاداری کا دم نہیں بھرا۔ نہ ہی انہوں نے گاندھی جی کی طرح کبھی وائسرائے کو اس طرح کی تحریر لکھی:

"..... میں یقیناً" آپ کی عزت کرتا ہوں مجھے انگریز قوم سے محبت ہے اور میں ہر ایک

ہندوستانی کے دل میں انگریزوں سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

قائداعظم بمبئی ہوم رول لیگ کے صدر تھے۔ جنگ میں وہ انگریزوں کے ساتھ اس شرط پر تعاون کرنے کو تیار تھے کہ حکومت یہ یقین دلائے کہ ہندوستان کو ایک خاص مدت میں ہوم رول دے دیا جائے گا۔ بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن گاندھی جی کے مقابلے میں قائداعظم کے سخت رویے کو دیکھ کر ان کے دشمن ہو گئے۔ لیکن قائداعظم نے خوف کھانا سیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے لارڈ ولنگڈن' ان کے حواریوں اور بمبئی کی انتظامیہ کے خلاف عوام کے جذبات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کی۔ اس لڑائی میں قائداعظم بمبئی کے عوام کے ہیرو بن گئے۔ عوام نے اس فتح کی یاد میں کہ جناح نے عوام کی توہین کرنے والی نوکر شاہی کا سر جھکا دیا تھا' بمبئی میں جناح پیپلز میموریل ہال تعمیر کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے جناح پیپلز میموریل ہال کا افتتاح کیا اور قائداعظم کو جو اس وقت لندن میں تھے یہ تار بھیجا۔

"ایک پیغامبر کو اس کے اپنے ملک میں اور اپنی زندگی میں اعزاز مل گیا۔"

لارڈ ولنگڈن کے برعکس وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ سے قائداعظم کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ لارڈ ریڈنگ ان کی ذہانت' محنت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مداح تھے۔ قائداعظم کو ان کی جانب سے عہدے اور خطابات کی کئی بار پیشکش ہوئی۔ ایک بار انہیں ہائی کورٹ کی ججی کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد وائسرائے کونسل کے قانونی رکن کا۔ مگر قائداعظم نے یہ عہدے قبول نہیں کئے۔ لارڈ ریڈنگ نے ایک بار ان سے یہ پوچھا کہ اگر آپ کو "سر" کا خطاب پیش کیا جائے تو کیا آپ اسے قبول کرلیں گے۔ قائداعظم کا جواب یہ تھا کہ مجھے سر محمد علی جناح کے بجائے مسٹر محمد علی جناح زیادہ پسند ہے۔ قائداعظم اصول پرست آدمی تھے۔ انہیں پتا تھا کہ انہیں ساری زندگی سامراجی حکومت سے ملک کی آزادی کے لئے جنگ لڑنی ہے اور اگر وہ کوئی عہدہ یا خطاب منظور کریں گے تو انہیں حکومت کا احسان مند ہونا پڑے گا۔

قائداعظم کی غیور طبیعت یہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔

پچھلے دو تین برسوں کے سیاسی حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ قائداعظم کی پیشگوئی تھی۔ گاندھی جی کی حکمت عملی کا نتیجہ تشدد' خونریزی' ہندو مسلم فسادات اور سرکاری املاک کی تباہی کی صورت میں نکلا۔ دو بڑی قوموں میں نہ صرف یہ کہ سیاسی اختلافات پیدا ہونے لگے بلکہ رہنماؤں کے دلوں میں بھی ایک دوسرے کے خلاف کدورت بیٹھ گئی۔

مسلم لیگ کونسل کے دہلی اجلاس (مارچ ۱۹۲۴ء) میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو نئے سرے سے منظم کرنا چاہئے۔ طے کیا گیا کہ مئی کے آخری میں لاہور میں مسلم لیگ عام اجلاس منعقد کیا جائے۔ قائداعظم نے ایک بیان میں لیگ کے نظریات کی وضاحت کی:

"اجلاس کے سامنے خاص خاص مسئلے یہ ہوں گے ہندوستان کے آئین میں ترمیم کرانا' بالخصوص پنجاب میں جہاں فرقہ وارانہ تعصبات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ ہندو مسلم مفاہمت کرانا اور ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کے انداز پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک بار پھر مکمل اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ لیگ کوئی ایسی پالیسی یا پروگرام منظور نہیں کرے گی جو انڈین نیشنل کانگریس خلافت کمیٹی یا جمعیت العلمائے ہند کے خلاف ہو مسلم لیگ عام قومی مفاد کے پیش نظر کام کرے گی۔ البتہ مسلمانوں کے مفاد کو بطور خاص ملحوظ رکھا جائے گا۔"

قائداعظم نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ہندوستان کے کئی علاقوں میں حالیہ ہندو مسلم فسادات سے جن کے پیچھے "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تحریکیں بھی تھیں' دونوں قوموں کے اتحاد کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔ انہوں نے دونوں قوموں سے متحد ہونے اور مل جل کر کام کرنے کی اپیل کی اور اپنا بیان ان الفاظ پر ختم کیا۔

"میں تمام ممتاز مسلمانوں سے خواہ وہ مسلم لیگ کے ممبر ہوں یا نہ ہوں اجلاس میں شرکت کی اپیل کرتا ہوں۔"

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندو مسلم فسادات ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا اہم عنصر بن گئے۔ اب کی باران فسادات کا مرکز پنجاب تھا۔ اس صدی کی پہلی دہائی میں بھی مسلمانوں کے خلاف تعصبات کا بہت زہر اگلا گیا۔ اس وقت ان تعصبات کا مرکز بنگال تھا۔ دوسری دہائی میں آریہ سماجی تحریک اور "شدھی" اور "سنگھٹن" جو اس تحریک کی زیادہ بھیانک اور تشدد پسند صورتیں تھیں۔ پنجاب سے رونما ہوئیں۔ یہ بات اہم ہے کہ تعصبات کی یہ لہریں زیادہ تر انہی علاقوں سے اٹھیں جن میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اپنی اکثریت کے باوجود انہی علاقوں میں مسلمان سب سے زیادہ پسماندہ تھے۔ اس کے برخلاف ہندو تعلیمی معاشی اور معاشرتی ہر لحاظ سے بہت آگے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن جمہوری اقدار کی بنا پر وہ انگریزوں سے آزادی کے طلبگار تھے۔ انہیں کی بنیاد پر ان صوبوں میں وہ مسلم اکثریت سے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں ان کی موجودہ بالادستی ختم نہ ہو جائے۔ اسی نفسیاتی خوف کا نتیجہ یہ فسادات تھے۔

بہرحال قائداعظم ان ملک گیر فسادات کے باوجود ہندو مسلم اتحاد پر ایمان رکھتے تھے لیکن ۱۹۲۶ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں انہوں نے واضح طور پر یہ کہا کہ:

"ہندوستان میں فرقہ واریت موجود ہے۔ محض جذباتی باتوں سے اسے ختم نہیں کیا جاسکتا قوم پرستی کو محض مشترکہ انتخابی اداروں سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔"

کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی نمایاں کوشش نہیں کی۔ ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور اسے ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا مگر اس کمیٹی نے کانگریس کو کوئی رپورٹ پیش نہیں کی۔ اس مسئلہ پر سی آر داس نے بھی اپنی تجویز پیش کی مگر اسے یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ اس میں مسلمانوں کو بے جا رعائتیں دی گئیں ہیں اس طرح فرقہ وارانہ منافرت پھیلتی رہی۔

قائداعظم ہندو مسلم مفاہمت دل سے چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اخبارات کو ایک بیان دیا کہ چونکہ کانگریس ہندو مسلم اتحاد کی تحریک جاری رکھنے کی اہل ثابت نہیں ہوئی اس

لئے اس نے اس مسئلہ کو سرد خانے میں ڈال دیا ہے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان اپنی تنظیم کریں اور دونوں قوموں کے لیڈران تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے جن سے فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے ہیں' ایک گول میز کانفرنس بلائیں۔ انہوں نے بیان کے آخر میں کہا کہ میری زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائیدار اتحاد اور مفاہمت پیدا کی جائے۔

۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی زیر نگرانی ایک شاہی کمیشن کا اعلان کیا گیا جسے ہندوستان کے لئے سیاسی اصلاحات کے بارے میں رپورٹ پیش کرنی تھی۔ چونکہ کمیشن میں کوئی ہندوستانی ممبر نہ تھا اس لئے پورے ملک میں اس کے خلاف احتجاج ہوا۔ قائداعظم کی تحریک پر بمبئی میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں انہوں نے یہ قرارداد پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

"بمبئی کے شہریوں کا یہ جلسہ عام پرزور الفاظ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ جس کمیشن کا تقرر ہوا ہے وہ اہل ہند کے لئے ناقابل قبول ہے کیونکہ اس میں واضح طور پر ہندوستانی عوام کے اس حق کو نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ ملک کے آئندہ دستور کی تشکیل میں انہیں مساوی نمائندگی ملنی چاہئے۔ جلسہ عام یہ فیصلہ بھی کرتا ہے کہ ان حالات میں اہل ہند کسی وقت اور کسی طرح بھی کمیشن کی سفارشات کے پابند نہ ہوں گے۔"

حکومت ہند نے وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کی شہ پر بنگال اور پنجاب سے بعض ایسے مسلمان پٹھو تلاش کر لئے جو سائمن کمیشن سے تعاون کرنے کو تیار تھے۔ قائداعظم نے ۱۱ دسمبر کو اخباروں کے نام ایک بیان جاری کیا جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ:

"آپ خواہ قومی وقار کے وسیع تر اصول کو لیں یا ذاتی مفاد کے تنگ نظر اصول کو، مسلمانوں کو اس کمیشن سے کوئی فائدہ نہ ہوگا؛ انہیں تاریخ میں ملک کی سیاسی زندگی کے ایک اہم اور نازک موڑ پر ملک دشمن کا نام دیا جائے گا اور دوسرے فرقے بجا طور پر مسلمانوں پر یہ الزام

دہریں گے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے قومی مفاد سے بلکہ مادر وطن سے بھی غداری کی ہے مجھے یقین ہے کہ مسلمان ایسی کوئی راہ اختیار نہیں کریں گے اور گمراہ نہیں ہوں گے خواہ ذاتی اغراض کے غلام ان پر کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ڈالیں۔"

فروری ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن ہندوستان میں وارد ہوا تو ہر شہر میں اس کا استقبال کالی جھنڈیوں اور "سائمن واپس جاؤ" کے نعروں سے کیا گیا۔ کئی شہروں میں ہنگامے ہوئے۔ پولیس کے تشدد سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے والوں میں لالہ لاجپت رائے اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے بڑے رہنما بھی تھے۔

سرجان سائمن نے وائسرائے کے نام ۶ فروری کے ایک خط میں یہ لکھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے سات ارکان مرکزی اسمبلی کے منتخب سات ہندوستانی اراکین کے ساتھ مل کر کام کرنے کو تیار ہیں چودہ اراکین مشترکہ طور پر لوگوں کی رائے اور خیالات معلوم کریں گے۔ اس تجویز کی روشنی میں اسمبلی کے غیر سرکاری ممبروں کا اجلاس ہوا۔ قائداعظم اس اجلاس کی کارروائیوں میں پیش پیش رہے۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ غیر سرکاری ممبران اپنے سات نمائندے نامزد کرنے سے انکار کر دیں۔ مرکزی اسمبلی کے سامنے غیر سرکاری ممبروں نے ۱۶ فروری کو ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ "کمیشن کی تشکیل اور اسکیم اسمبلی کے لئے ناقابل قبول ہے۔ اسمبلی کمیشن سے کسی وقت اور کسی صورت میں کوئی تعاون نہ کرے" یہ قرارداد ۶۲ کے مقابلے میں ۶۸ ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔ ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں کی یہ فتح قائداعظم کی بے لوث اور سیاسی تدبر کی فتح تھی۔

قائداعظم ۵ مئی ۱۹۲۸ء کو آرام کی غرض سے انگلستان روانہ ہوئے تو دو ممتاز سیاسی رہنما سری نواس آینگر اور دیوان چمن لال بھی ان کے ہمراہ تھے۔ دیوان چمن لال اس سفر کے متعلق

لکھتے ہیں۔

"...... یہاں مجھے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ قانون ساز اسمبلی میں سائمن کمیشن کے معاملہ پر محمد علی جناح نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسمبلی میں دوستانہ انداز فکر پیدا ہو جائے تو اس سے حقیقی اتحاد پیدا ہو سکے گا۔ بدقسمتی سے آج وہ بہت مایوس اور دل برداشتہ ہیں کیونکہ ان کی کوششوں کے ٹھوس نتائج برآمد نہیں ہو پائے۔ سندھ کے مسئلے نیز شمالی مغربی سرحدی صوبے کے لئے اکثریت کی نشستوں جیسے معمولی مسئلوں پر وقتی طور سے اتحاد کے تمام امکانات ختم ہو گئے تھے۔ محمد علی جناح کا اصرار ہے کہ اگر مجھ سے صرف تین رہنما ایک متحدہ پروگرام پر اتفاق رائے اور تعاون کر لیں۔ (جو وائسرائے کو منظور ہے) تو سوراج جیسا مجرد تصور حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آجائے گا۔ میں نے ان سے ان تین رہنماؤں کے نام پوچھے تو انہوں نے کہا کہ پنڈت موتی لال نہرو' پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے۔ جناح نے کہا کہ پہلا اور سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کا ہے۔ یہ مسئلہ زبانی جمع خرچ سے طے نہیں ہو گا۔ یہ ایک سنجیدہ اور ٹھوس مسئلہ ہے۔ میں نے جہاز پر مختلف سیاسی گروہوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی باشندوں سے بھی اس موضوع پر بات کی اور ہر شخص نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ہندوستانی لیڈر میرے بیان کردہ مسائل پر تصفیے سے گریز کر رہے ہیں اگر ان مسائل پر مصالحت ہو گئی یا کوئی فریق اپنے موقف سے دستبردار ہو گیا تو کیا ہندوستان تباہ ہو جائے گا؟ اب فرض کیجئے کہ ہم نے یہ مسائل حل کر لئے تو یقین کیجئے کہ قوم کی متحد آواز کو کسی طرح دبایا نہیں جا سکے گا۔ ہم نے گاندھی کا ذکر چھیڑا تو جناح نے ہنستے ہوئے بتایا کہ کس طرح گاندھی اور عمر سوبانی نے انہیں تحریک عدم تعاون میں شامل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہوں نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ اس پر میں نے کہا کہ آپ غلطی پر تھے تحریک تو کم و بیش کامیاب ہو گئی تھی۔

ناکامی تو اس لئے ہوئی کہ گاندھی میں لینن کی سی اسپرٹ نہیں تھی ورنہ پچھلے چند برس کی تاریخ بدل جاتی انہوں نے کہا گاندھی سیاست دان نہیں ہیں۔ کاش وہ سیاست دان ہوتے۔"

قائداعظم محمد علی جناح

معمار پاکستان

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۸ء

maablib.org

قائداعظم اور گاندھی

سلیم احمد

اب میں قائداعظم کو بابائے ملت کہتا ہوں اور خود کو ان کا بچہ سمجھتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ جب بچے حروف تہجی یاد کرتے کرتے کسی حرف کو بھول جاتے ہیں تو پھر الف سے سبق دہرانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر الف ب پ ت ٹ اور کہا کہ ق یہاں ہے آیئے اسی طرح ہم بھی بابا کی انگلی پکڑ کر چلتے ہیں اور یہ دیکھتے کہ ہم کیا چیز بھول گئے ہیں؟

گاندھی جی نے قائداعظم سے ایک بار بہت معصوم اور بڑا خطرناک سوال پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "مائی ڈیر قائداعظم یہ تو بتایئے اگر میرا بیٹا مسلمان ہو جائے تو کیا وہ دوسری قوم کا ہو جائے گا۔" مطلب یہ تھا کہ میں ایک ہندو ہوں' میں اس ہندوستان میں صدیوں تک بلکہ ہزاروں سال سے رہتا ہوں۔ میری ہزاروں سال کی ایک تاریخ ہے میرے آباؤ اجداد میرے پرکھے اور میرے اسلاف ہزارہا سال سے اس سرزمین پر آباد ہیں۔ یہی نہیں میرے پاس وید ہیں اپنشد ہیں' پران ہیں' گیتا ہے' مہا بھارت ہے اور یہ سب کچھ میری نسل میں اور میری شناخت میں شامل ہے۔ مگر میرا بیٹا ایک کلمہ پڑھ لیتا ہے اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ اب یہ میری قوم سے الگ ہو گیا' دوسری قوم کا ہو گیا' وہ قوم بھی کیسی ہے جس کا وہ جز بنا کہ جو اس ملک سے تعلق نہیں رکھتی۔ صحرائے عرب میں اس کا جنم ہوا نہ میں اس کے آباؤ اجداد کو جانوں نہ اس کی تاریخ کو جانوں' نہ اس کے کلچر کو جانوں نہ اس کی زبان کو جانوں' مگر اس کے باوجود ایک کلمے کی بنا پر میرا ایک روایت سے رشتہ کٹ جاتا ہے اور دوسری سے جڑ جاتا ہے یہ کس طرح ممکن ہے؟

اگر ہم اس سوال کی مزید تشریح کریں تو گویا گاندھی جی نے قائداعظم سے یہ پوچھا کہ بتایئے قائداعظم! ایک قوم کی قومیت کی تشکیل میں مذہب کیا رول ادا کرتا تاریخ ہو گئی

ہو گیا۔ روایت ہو گئی نسل و خون ہو گیا' زبان ہو گئی مگر یہ جو مذہب ہے' کلمہ لا الہ الا اللہ ہے تو یہ ایک قوم کی شناخت میں کیا رول ادا کرتا ہے؟

اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ قائداعظم نے اس کا کوئی جواب دیا یا نہیں لیکن قائداعظم کا تو پورا وجود ہی اس سوال کا جواب تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قائداعظم عرب' ایران' ترکستان' یا افغانستان سے آئے ہوئے اس نسل کے فرد نہیں تھے بلکہ وہ راجپوت تھے اور یہ سوال تو ڈائریکٹ ان سے کیا جا رہا تھا کہ آپ تو راجپوت ہیں۔ ہماری ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں آپ مسلمان ہوتے ہی دوسری قوم کے کیسے ہو گئے۔

یہ ایک عجیب و غریب ایک معنی خیز اور بڑی علامتی بات ہے۔ برصغیر میں ہندی مسلمانوں کی قومی علیحدگی اور ان کے قومی تشخص کی لڑائی جو دو افراد لڑ رہے تھے دو عظیم ترین شخصیتیں لڑ رہی تھیں وہ وہی تھیں کہ جن کا تعلق عرب و عجم سے نہیں تھا۔ ہندوستان کی اس نسل سے تھا جس کی نمائندگی گاندھی جی کر رہے تھے یعنی قائداعظم اور علامہ اقبال۔ اور یہ دونوں شخصیتیں اپنے وجود سے کہہ رہی تھیں کہ دیکھو جب دین کسی جغرافیئے میں' کسی روایت میں کبھی زبان میں' کسی نسل میں جاری ہوتا ہے تو کس طرح وہ اس کے پہلے رشتے کو توڑ دیتا ہے۔ رام لکشمن سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ آج سے میرا رشتہ محمدؐ عربی سے ہے۔ یہ گویا قائداعظم کا وجود کہتا تھا یہ کہتا تھا کہ مہا بھارت سے میرا رشتہ باقی نہیں رہا۔ میری نسل کے نہیں ہیں میرے جغرافیہ کے نہیں ہیں اب یہ میرے اپنے ہیں تلسی داس میرا نہیں ہے لیکن مولانا روم میرے ہیں۔ اب میرا رشتہ محمد بن قاسم سے ہے اور طارق بن زیاد سے ہے۔ گویا مذہب ایک ایسی قوت ہے جو ماضی کے رشتے توڑ کر انسان کو نئے رشتے سے جوڑ دیتا ہے۔

اب صحرائے عرب کو دیکھئے یہاں کس طرح قومیں آباد تھیں۔ جب اسلام آیا تو کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ باپ بیٹے سے جدا ہو گیا اور بیٹا باپ سے الگ۔ اور بھائی بھائی کے خلاف تلوار لے کر

کھڑا ہو گیا اور یہ عجیب و غریب صورت پیدا ہوئی کہ جو اپنے اور خونی رشتہ دار تھے یعنی ابو جہل اور ابولہب وہ تو غیر بن گئے اور سلمان فارسی، سہیل رومی اور بلال حبشی اپنے ہو گئے گویا دین کی آمد سے ساری چیزوں تو رہی ہیں ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ صرف یہ ہوا کہ ایک سرا اٹھا کر دوسرے سرے سے جوڑ دیا گیا۔

جب یہ عرب قوم اپنے علاقے سے نکلی تو دو بڑے خطوں میں پھیلی ہے۔ ان کی تاریخ میں نہیں جاؤں گا برصغیر میں آتا ہوں۔ جب برصغیر میں مسلمان داخل ہوئے تو ان میں کچھ عرب تھے کچھ ایرانی تھے، کچھ ترک تھے انہوں نے یہاں شادیاں کیں لیکن ان کا کثیر و غالب حصہ وہ ہے جو یہاں کا (CONVERTED) ہندو ہے۔ جو ہندو سے مسلمان بنا ہے اور یہ قوم وجود میں آئی کہ جو یہ کہتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے مختلف ہیں اور ہمارا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہمارا ایودھیا اور کاشی سے کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارا رشتہ کعبے سے اور مدینہ سے ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد تھی بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان کے علاقے میں مختلف ہندو قومیں آباد تھیں۔ کوئی حیدر آباد دکن میں تھی، کوئی پنجاب میں، کوئی سندھ میں تھی، کوئی یوپی میں۔ ان کی اپنی زبانیں تھیں، تاریخ تھی ان کی نسلیں تھیں اور ان کی تہذیب تھی۔

اس اثنا میں اسلام کا ورود مسعود ہوتا ہے۔ یہ دین رفتہ رفتہ سندھ سے پنجاب، پنجاب سے یوپی، یوپی سے بنگال، بنگال سے دکن تک پہنچتا گیا اس طرح ہر مقام پر TRANSFORMATION کا عمل شروع ہو گیا۔ وہ سب اپنے مقامی اجزاء کو برقرار رکھتے ہوئے کچھ اور بن گئیں اب ان میں دین کا ELEMENT سب چیزوں کی قلب ماہیت کر دیتا ہے وہ داخل ہوا۔ اب اس دین کے پیروکار اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کر اس رشتے میں در آئے جس کو ہم برصغیر کی ہندی مسلم قوم کہتے ہیں۔

یہی وہ قوم تھی جو انگریزوں کی آمد کے بعد اس CRISIS سے دوچار ہوئی کہ اگر NATION اور NATION STATE کا وہ CONCEPT درست ہے جو انگریز لے کر آئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہو تا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے تشخص سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہندوستانی قوم کا حصہ ہو کر ہندو اکثریت کی غلام ہو جائے۔ یہ قوم نوے سال تک اس CRISIS سے دوچار رہی کہ یہ انگریزوں کے تصور کو مان لے تو اس کی IDENTITY ختم ہو جاتی ہے اس حال میں تاریخی PROCESS کے تحت پاکستان کا تصور DEVELOP ہوا۔

قائداعظم نے اس تصور کو بڑی وضاحت سے اجاگر کیا۔ انہوں نے CATEGORICALLY کہا کہ دنیا کے تمام معیارات اور اصولوں کے مطابق برصغیر کے دس کروڑ مسلمان ایک ہیں اور اس بات کو نہ صرف انہوں نے کہا کہ بلکہ دوسروں سے منوایا بھی۔ بالخصوص ان سے منوایا جو شدید اختلافات رکھتے تھے۔ اختلاف رکھنے والے صرف ہندو نہیں تھے انگریز بھی تھے۔ اختلاف رکھنے والے صرف انگریز ہی نہیں تھے بلکہ مسلمان بھی تھے۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے عربی مدنی اور سید اور بڑے بڑے شہزادے شامل تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب قانونی طور پر انگریز کو اور ہندو کانگریس کو ایک معاہدے کے ذریعے تسلیم کرنا پڑا کہ برصغیر کی ایک قوم دس کروڑ کی ہے اور اس کے لئے ایک HOME LAND کی ضرورت ہے اور وہ پاکستان ہے۔

قائداعظم نے تو یہ فرمایا تھا مگر ہمارے دوست جمیل خان (ڈاکٹر جمیل جالبی) کہتے ہیں کہ بھائی پاکستان میں نہ کوئی قوم ہے نہ کوئی کلچر ہے اب ہم بنائیں گے اگر یہ معاملہ ہے تو پاکستان کس لئے بنا ہے۔

چرخہ دیا جلا

آیا کتا کھا گیا

تو بیٹھی ڈھول بجا

عجیب معاملہ ہے ایک طرف یہ صورت حال ہے کہ ایک ہزار سال کی تاریخ اور دو سو سال کی جدوجہد آزادی ہے جس میں ہم نے مذہب، کلچر، تاریخ اور زبان کے اشتراک کی بنیاد پر یہ حقیقت منوائی کہ ہم ہر اعتبار سے، ہر بین الاقوامی معیار کے مطابق ایک الگ قوم ہیں اس لئے ہمیں ایک الگ وطن کی ضرورت ہے۔ جب یہ مقدمہ فیصل ہو گیا اور اس کی رو سے ایک مملکت وجود میں آ گئی تو بھائی جمیل جالبی کہتے ہیں کہ نہ قوم ہے، نہ کلچر ہے، کیسی عجیب و غریب بات ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صاحب پاکستان تو زمین کا نام ہے۔ اس زمین سے باہر جو ہے اس سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ یعنی جب ہم دیکھتے ہیں کہ بھئی تاج محل بھی ہمارا ہے اور دلی کی جامع مسجد بھی ہماری ہے اور شاہ ولی اللہ بھی ہمارے ہیں اور مجدد صاحب بھی ہمارے ہیں تو ایک گروہ یہ کہنے لگتا ہے کہ صاحب یہ تو سب پاکستان سے باہر کے ہیں۔ یہ پاکستان کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ پاکستان تو اس زمین کا نام ہے۔ اگر پاکستان اس زمین کا نام ہے تو اس دعوے کے کیا معنی ہیں کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات تک دس کروڑ مسلمان ایک قوم ہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی بارہ بج کر ایک منٹ پر یہ دو قومیں ہو گئیں، یہ کیا تماشہ ہے اس کے بعد مزید تماشہ یہ ہے کہ ۲۵ سال ایک قوم رہنے کے بعد مشرقی پاکستان و مغربی پاکستان اب یہ دو قومیں ہیں۔ تو پہلے جو ایک قوم تھی اب خدا کے فضل سے تین قوموں میں تقسیم ہو چکی ہے اس کے پیچھے غلط فہمی یہ ہے کہ قوم جو ایک مستقل IDENTITY ہے اور ایک بہت ESTABLISMED FACT ہے اس کو جس چیز سے خلط ملط کیا جا رہا ہے وہ ہے اسٹیٹ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ قوم وہ ہے جو ایک اسٹیٹ میں رہتی ہے۔ STATE IDENTITY اور چیز ہے اور STATE NATIONALITY بالکل اور چیز ہے۔

لیکن یہ کوئی اصول نہیں ہے دنیا کا NATIONAL STATE میں بھی کیا ایک قوم صرف ایک ہی اسٹیٹ میں رہ سکتی ہے کیا یہ ضروری ہے؟ عرب ایک قوم ہیں مگر مختلف اسٹیٹس میں رہتے ہیں اور کیا ایک اسٹیٹ میں ایک ہی قوم رہتی ہے اگر یہ ہو تو آپ کا دعویٰ ہی غلط ہو جائے۔ ہندوستان ایک اسٹیٹ ہے مگر اس میں مختلف قومیں رہتی ہیں مناسب یہی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو ہم STATE اور NATION کے فرق کو سمجھ لیں۔ اسٹیٹ اور چیز ہے اور NATION اور چیز ہے اگر ہم نے اسے نہ سمجھا تو یہ ایک مذاق بن جائے گا کہ دس کروڑ مسلمان ایک قوم تھے پھر وہ اسٹیٹ بنتے ہی دو قوم ہو گئے۔ پھر وہ پچیس سال بعد تین قوم ہو گئے' تو یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ اسٹیٹ جو NATION STATE کہلاتی ہے یہ PRIESTLY کی جانشین ہے۔ یہ تھی کہ وہ بزور شمشیر قائم ہوتی تھی اس کے لئے قوم کی یکجہتی ضروری نہیں تھی۔ بابر یہ نہیں کہتا تھا کہ ہندو میرے ہم قوم ہیں بابر یہاں تلوار لے کر آیا تھا حکمران بن گیا تھا۔ اس کے پاس POLITICAL پاور تھی۔ یہ ریاست اپنے شہری کو سرحد عبور کرنے سے روک سکتی ہے ایسی ریاست مجھے باہر نکال سکتی ہے اور کہہ سکتی ہے کہ سلیم احمد آج سے میرا شہری نہیں ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ٹمبک ٹو کے رہنے والے کو پاکستان کی شہریت دے دے کہ یہ پاکستان کا شہری ہے۔ دنیا کی ساری اسٹیٹس ایسا کرتی ہیں اس کو STATE IDENTITY اور STATE NATIONALITY دینے کا حق حاصل ہے لیکن یہ میرے خون سے شاہ ولی اللہ کو اور حضرت مجدد الف ثانی کو کھرچ نہیں سکتی۔ اس اسٹیٹ کو اپنی حدود معلوم ہونی چاہئیں۔ ہمارے ذہن میں یہ تصور جتنا کھل جائے اتنا بہتر ہے۔

مسعود اشعر نے بہت سی باتیں کہی ہیں ایک بات مجھے یاد رہ گئی جو ماضی کے خوابوں سے متعلق ہے میں یہ عرض کروں کہ میرے ماضی کے چار پانچ حصے ہیں۔ میرا ایک ماضی فرد کی حیثیت سے ہے جو میرے خاندان' میری تاریخ اور میری نسل سے بندھا ہوا ہے میرا دوسرا

ماضی ایک گروہ یا ایک قوم کے دامن سے بندھا ہوا ہے اور میرا تیسرا ماضی ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ملت کے ماضی سے بندھا ہوا ہے اور میرا چوتھا ماضی میرے انسان ہونے کی حیثیت سے تمام نوح انسانی سے بندھا ہوا ہے اس ناطے سے تمام بنی نوع انسان کے خواب میرے خواب ہیں اور تمام نوع انسانی کی مشترکہ شرافتیں میری میراث ہیں۔

ایک بات میں بہت وضاحت سے کہہ دینا چاہتا ہوں کلچر کے معاملے میں اس بات کی وضاحت پوری ہونی چاہئے۔ دین اور چیز ہے' کلچر اور چیز ہے اس بات کو مسلسل کنفیوز کیا جا رہا ہے دین کو اور کلچر کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کلچر دین کی ذیلی پیداوار ہے۔ کلچر کبھی دین نہیں ہے۔ کلچر انسانی وجود' اس کے تقاضوں' اس کی زمین اس کی مٹی' اس کے رہن سہن اور اس کی معاشرت سے پیدا ہوتا ہے۔ دین اپنی آمد سے کلچر کو TRANSFORM کر دیتا ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ صالح اور مفید اجزا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور جن اجزا سے فساد ہوتا ہے ہو ان کو مسترد کر دیتا ہے اور جن اجزا میں کوئی ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے اور وہ اصلاح سے درست ہو سکتے ہوں' ان کی اصلاح کر دیتا ہے خود اسلام نے اپنی تاریخ میں یہ کیا۔ حج کیا ہے؟ حضرت ابراہیم کی یادگار کے طور پر قریش کے قبائل منایا کرتے تھے۔ ساری رسوم ان کی لے لیں مگر ننگے ہو کر طواف کرنے کی چند رسموں کو خارج کر دیا۔ اس پر شاہ ولی اللہ نے یہ کہا کہ انبیاء کا طریقہ راسخہ یہ ہے کہ جس قوم میں وہ اپنا دین لے کر جاتے ہیں اس کے اعضائے حیات کو تباہ و برباد یا DESTROY نہیں کرتے اس کے اندر تین عمل کرتے ہیں' اصلاح کرتے ہیں کسی عنصر کا اضافہ کر دیتے ہیں اور جو عنصر براہ راست متصادم ہو اسے مٹا دیتے ہیں۔

جب مسلمان ہندوستان آئے تو انہوں نے ایک کمال مظاہرہ کیا۔ اس سلسلہ میں میں سلیمان ندوی سے کم اتھارٹی کا حوالہ نہیں دے رہا ہوں۔ محمد بن قاسم نے ایک خط حجاج کو لکھا

کہ یہاں رہنے والے والی قوم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے پاس اس کی کتاب ہے اور پیغمبر ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس اخلاقیات ہے اور یہ قوم ہمارے روبرو ہے تو اس سے ہمارا سلوک کیا ہو؟ بصرے سے برصغیر میں آنے والا فتویٰ یہ تھا کہ یہ مشابہ اہل کتاب ہیں اور ان سے سلوک وہ ہو گا جو اہل کتاب سے ہوتا ہے۔ ان کے خیر کے جتنے عنصر ہیں ہمیں ان سے کوئی کد نہیں سو میں خود شری کرشن اور رام چندر جی کے ناموں کے ساتھ فضیلت کے سابقے لگا کر لکھتا ہوں۔ ان میں ان کو مہاراج کہتا ہوں' میں ان کی گیتا پڑھتا ہوں اور رامائن پڑھتا ہوں لیکن کیا وہ ہماری IDENTITY ہیں ہمارا جواب یہ ہو گا کہ ہم پوری انسانیت کے مشترکہ سرمائے سے اس کے خیر کے تمام عناصر اور اس کی حکمت کو جذب کر سکتے ہیں لیکن وہ ہماری IDENTITY نہیں ہو سکتے۔ ہماری پہچان اس چیز سے نہیں۔ اب یہ جو میں نے کہا کہ دین اور کلچر ایک چیز نہیں ہے تو اس سلسلے میں کچھ کنفیوژن اپنے بھائی اشفاق کے ہاں بھی موجود ہے اور مسعود اشعر کے ہاں بھی پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ جب تاج محل کا مجدد صاحب کا' شاہ ولی اللہ کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ ہمارے ہیں اور پھر یہ کہا کہ مولانا روم اور عطار بھی ہمارے ہیں۔ یہ سب ہمارے ہیں مگر ایک فرق ہے۔ مولانا روم جو ہیں وہ ہماری ملی شناخت کا حصہ ہیں اس لئے ہمارے ہیں۔ شاہ ولی اللہ ہماری قومی شناخت کا حصہ ہیں اس لئے ہمارے ہیں تو ہمیں اپنی قومی و ملی شناختوں میں اور انسانی شناختوں میں فرق سمجھنا ہے اور جب تک ہم یہ فرق نہیں کریں گے اور ان کی TERM کو DEFINE نہیں کریں گے اور اس کو VERBAL FORMATION کی صورت میں بلکہ اپنے شعور کی گہرائیوں سے نہیں سمجھیں گے اس وقت تک یہ مسئلہ اس طرح الجھا رہے گا۔ یہاں ایک فاضل دوست نے موہنجو داڑو' ہڑپہ اور گندھارا کا بھی ذکر کیا ہے۔

گاندھی جی نے قائداعظم سے پوچھا تھا کہ کیوں صاحب مسلمان ہونے کے بعد آپ کے

مدینے سے تعلق رکھتے ہیں یا رام اور رامائن سے۔ ان کا جواب یہ تھا کہ کے اور مدینے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو وہ جو درست بات تھی۔ وہی بات یہاں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے بارے میں صحیح ہے کہ ہماری تاریخ وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے اسلام کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ دوسری کسی چیز سے ہماری تاریخ شروع نہیں ہوتی۔ جس طرح مسلمانوں کی تاریخ محمد الرسول اللہ کی بعثت سے شروع ہوتی ہے اور جب وہاں سے شروع ہو جاتی ہے تو ہمارے نصب ناموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ حضرت سلمان فارسی سے پوچھا گیا کہ تمہارے باپ کا نام کیا ہے تو انہوں نے کہا سلمان ابن اسلام ابن اسلام!

maablib.org

قائداعظم محمد علی جینا

سید سلیمان ندوی

افسوس ہے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کو قائداعظم محمد علی جینا کا کراچی میں بہتر برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ پاکستان و ہندوستان اور عالم اسلام نے اس حادثہ پر بڑا صدمہ محسوس کیا۔ دوسرے دن عصر کے وقت کئی لاکھ کے مجمع میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ عام مسلمانوں میں ان کو جو ہردل عزیزی حاصل تھی اس کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان اور اکثر اسلامی ملکوں، ریاستوں اور شہروں نے ان کا ماتم کیا اور ان کے لئے قرآن خوانی اور مغفرت کی دعا کی گئی۔

مرحوم کے سیاسی کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ وہ بڑے قانون دان بڑے مناظر اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے، اور اپنے پیروؤں پر بلا کا اثر رکھتے تھے ان کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی۔ انہوں نے اپنی اس قوت کا مظاہرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا۔ اور بالاخر کامیابی حاصل کی اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت سب سے بڑی اسلامی حکومت ہے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا میں اس کا پانچواں نمبر ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں مرحوم کا بڑا حصہ ہے اور ۱۹۱۶ء سے لے کر جب لیگ اور کانگریس میں ان کی کوشش سے مشہور پیکٹ ہوا۔ ۱۹۴۸ء تک سوائے ان چند سالوں کے جب وہ ترک موالات کی تحریک میں کانگریس سے الگ ہو گئے ہمیشہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ملک میں ممتاز رہے۔ ان کی نسبت ان کے دوست اور دشمن ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ نہ کبھی حکومت وقت سے ڈرے اور نہ جاہ و منصب کی کوئی حرص و طمع ان کو اپنی جگہ سے ہلا سکی۔

مرحوم پاکستان کے بانی اور یہ کہنا چاہئے کہ اس کی کشتی کے تنہا ملاح تھے ایسے طوفان حوادث کے موقع پر جب ہر ملک اندرونی و بیرونی خطروں سے گھرا ہوا ہے۔ ان کی وفات حد درجہ افسوس ناک ہے یہ وہ وقت ہے جب پاکستان کے حکمران اور رہنما صرف اپنی بے لوث خدمت، مخلصانہ کوشش، سادہ زندگی، ایثار، حب ملت عاقبت اندیشی اور ذاتی اغراض سے بلند ہو کر باہمی اتحاد اور پورے ضبط و نظم کو قابو میں لا کر اپنی مملکت کو نشو و نما دے سکتے ہیں۔ اور تاریخ میں نئے شان دار کارناموں کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ ورنہ ان کی ذرا سی غلطی اس نئے ملک کو ایسا سخت صدمہ پہنچائے گی جس سے وہ صدیوں تک عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا۔

مرحوم سے میری ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی البتہ چار دفعہ ان کو دور دور سے اور ایک دفعہ نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا پہلی دفعہ میں نے انہیں دیکھا جب ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہو رہے تھے اور وہ پہلی دفعہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں میں ظاہر ہوئے۔ سابق محمود آباد کی سرکردگی میں لکھنؤ نے ان کا شان دار شاہانہ استقبال کیا اس وقت یہ نظم موزوں ہوئی۔

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں منور تھے
کوہ شملہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا
جب کہ داروئے وفا ہر درد کا درماں رہی
جب کہ ہر ناداں عطائی بوعلی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے
جس پہ موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادہ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا

ملت دیرینہ سے گو اصلی قویٰ بے کار ہیں
گوش شنوا ہے نہ ہم میں دیدہ بینا رہا
پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

اس کے بعد دوسرے سال بمبئی میں لیگ و کانگریس کے اجلاس ہوئے مسلم لیگ کے صدر مظہرالحق مرحوم تھے۔ اور جینا صاحب اس اجلاس کے بانی اور داعی تھے۔ لیکن مسلم لیگ کا یہ جلسہ جیسا کہ اس وقت سمجھا گیا انگریزی حکومت کے چند کارندوں کی شرارت سے درہم برہم ہو گیا۔ یہ مرحوم قائداعظم کے دیکھنے کا دوسرا موقع تھا۔ اس وقت قلم نے یہ نظم لکھی۔

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آراء رہا
ابر خورشید پر بہت چھایا رہا
کہ شب تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں
ملک میں پچھلے دنوں کچھ کچھ اجالا سا رہا
وہ زمانہ جاچکا جب بت پرستی عام تھی
جب خدا کا حکم ہر عیار کا ایما رہا
جب متاع رہنمائی تھی سزا وار خرید
جب کہ ہر قارون پہ ہم کو خضر کا دھوکا رہا
جب کہ تھی آزادگان عشق کی ہم میں کمی
جب کہ ہر فرعون ہم میں قوم کا موسا رہا
پھر بھی تمیز حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا
جو ہمیشہ قوم میں شمع رہ صحرا رہا

رزمگاہ نور و ظلمت بمبئی مدت سے ہے
گر یہیں انوار حق چمکے تو کیا بے جا رہا
آیت قرآن کہ جاء الحق مصدق ہو گئی
مجلس آئین ہماری "مظہر حق" ہو گئی

تیسرا موقع یہ آیا کہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کی تحریک کے زمانے میں محمد علی مرحوم اڈیٹر کامریڈ کے ساتھ جینا صاحب کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں دونوں لیڈروں میں اس وقت کے مسئلوں پر گفتگو ہوئی اور جس کا خاتمہ بالاخر ایک دوسرے سے علیحدگی پر ہوا۔

اس کے بعد میں نے انہیں ناگپور کی کانگریس میں دیکھا جب ترک موالات کی تجویز کی مخالفت کے لئے کھڑے ہوئے اور پورے جلسے کی مخالفت کے باوجود اپنی بات پر اڑے رہے اور اس کے بعد وہ کانگریس کے اجلاس بلکہ کانگریس سے نکل گئے اور پھر اس میں شریک نہیں ہوئے۔ سالہا سال کے بعد ابھی دو سال ہوئے جامعہ ملیہ کی جوبلی میں انہیں دیکھا۔ اور ان کی تقریر سنی۔

روزنامہ انجام کراچی

۲۶ دسمبر ۱۹۶۴ء

قائداعظم کے بعد قوم پر کیا گزری

سید سبط حسن

یہی دن تھے جب قائداعظم محمد علی جناح ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے تھے۔ اس نو سال کی مختصر مدت میں ہمارے مقتدر رہنماؤں نے ملک وملت کی خدمت کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر قائداعظم دیکھیں تو شاید پہچان نہ سکیں کہ یہ وہی پاکستان ہے جس کا وعدہ انہوں نے مسلمانوں سے کیا تھا اور جس کی خوش حالی اور بہبودی اس عظیم شخصیت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

قائداعظم تمام عمر چند بنیادی اصولوں اور بنیادی قدروں کی خاطر جدوجہد کرتے رہے.... انگریزوں سے ان کا اختلاف اسی بنا پر تھا اور کانگریس سے ان کی ٹکر اسی وجہ سے تھی.... سچ تو یہ ہے کہ یہ اصول اور قدریں ان کے کردار کا جز بن گئی تھیں۔ مصلحت کے تقاضے انہیں اپنے نصب العین سے ایک لمحے کے لئے بھی ہٹا نہ سکتے تھے اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے مقابلے میں وہ کبھی خوف اور جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی ضرب المثل جرات و بے باکی اسی اصول پرستی کا پرتو تھی۔ اور ان کی خود اعتمادی اور صاف گوئی اسی فلسفہ حیات کا عکس.... قائداعظم نے جس وقت پاکستان کا نعرہ بلند کیا تھا تو اپنے اور بیگانے دونوں نے ان کی اس "دیوانگی" کا مذاق اڑایا تھا۔ ان کو "حقیقت پسند" بننے کا مشورہ دیا تھا اور انگریزوں کی طاقت کو ہوا بنا کر پیش کیا تھا لیکن قائداعظم نے دنیا کو دکھا دیا کہ آخری فتح اصول پر قائم رہنے والوں کی ہوتی ہے اور بڑی سے بڑی قوت کو بھی سچے نصب العین پر چلنے والوں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ آج یہی "حقیقت پسند" حضرات قوم کے نصب العین کو مصلحت اندیشوں پر قربان کر رہے ہیں اور قوم میں خوف و ہراس اور احساس کمتری پیدا کر کے پاکستان کو اغیار کا خیمہ بردار بنا رہے ہیں قائداعظم بھیک مانگنے کو قومی غیرت اور خودداری کی توہین خیال کرتے تھے

لیکن آج یہ گداگری ہماری قومی سیرت بنتی جا رہی ہے۔ کتنی دور نکل آئے ہم قائداعظم کی منزل سے.....!

قائداعظم کے بدترین دشمن بھی ان کی دیانت کا اعتراف کرتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ جاہ و منصب اور دولت و عزت کا بڑے سے بڑا لالچ بھی قائداعظم کے پائے ثبات میں لغزش نہیں لا سکتا اور نہ انہیں کسی قیمت پر خریدا جا سکتا۔ وہ کون سی آزمائش تھی جس میں انہیں مبتلا کرنے کی سعی نہ کی گئی لیکن قائداعظم بکاؤ مال نہ تھے۔ انہیں سودا بازی اور درباری سازش سے فطری نفرت تھی۔ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ڈنکے کی چوٹ پر کہتے اور جو کچھ کرنا ہوتا بر سر عام کرتے..... قائداعظم کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب ہے جس میں خفیہ باب کوئی نہیں..... البتہ ان کی تقلید کا دعویٰ کرنے والی مقتدر ہستیاں ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو انہیں قائداعظم کی طبعی استقامت اور اپنی منفعت بخش تلون مزاجی کا فرق صاف نظر آجائے گا۔ اس مہنگائی کے زمانے میں ضمیر کتنا سستا اور ایمان کی قیمت کتنی کم ہے برادران یوسف اپنی وفاداریوں کو ٹھیکوں، لائسنسوں، پرمٹوں اور وزارتوں کے چند ٹکڑوں کے عوض فروخت کرتے ہوئے کوئی شرم و حیا محسوس نہیں کرتے۔ اب تو یہ بردہ فروشی قوم فروشی میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔

قوم و وطن اور ضمیر کا سودا کرنے والے قائداعظم کے زمانے میں بھی تھے۔ انگریزوں نے انہیں یہی سکھایا تھا لیکن قائداعظم نے ان کی پشت پناہی اور ہمت افزائی کبھی نہ کی۔ پیروڈا کا قانون قائداعظم کی ہدایت ہی پر بنا تھا اور ایک صوبے کے وزیر اعلیٰ کے خلاف قائداعظم ہی نے تادیبی کارروائی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

قائداعظم نے ""اتحاد تنظیم اور یقین محکم"" کا سبق دیا تھا۔ قائداعظم کا یہ ارشاد سرکاری دفتروں میں آج بھی بڑی بڑی تختیوں پر لکھا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن ان دنوں ""اتحاد تنظیم اور

یقین محکم" کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ "کسی ایک طبقے کو لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری کی اجازت نہیں ہوگی.... پاکستان میں بسنے والے ہر شخص کو ترقی کے مساوی مواقع میسر ہوں گے .... پاکستان' امیروں' سرمایہ داروں' جاگیرداروں اور نوابوں کی لوٹ کھسوٹ کے لئے نہیں بنایا گیا۔ یہ غریبوں کا ملک ہے اور اس پر غریبوں ہی کو حکومت کا حق ہے" مگر' قائداعظم کا یہ خواب ہنوز شرمندہ تعبیر ہے۔

یہ گزارشات اعتراض برائے اعتراض نہیں اور نہ کسی مخصوص گروہ یا طاقت کی تنقید مقصود ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ قائداعظم کے یوم وفات پر ہم سب حکومت سیاسی جماعتیں اور عام شہری... سنجیدگی سے غور کریں کہ کیا آج ہمارا مسلک اور طریقہ کار وہی ہے جو قائد اعظم کا تھا اور کیا ہم قوم کو قائداعظم کے بتائے ہوئے راستے پر لے جا رہے ہیں۔ اگر ہم قائداعظم کے کردار و عمل کو آج کے حالات میں لائق تقلید نہیں سمجھتے تو ہمیں صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کر لینا چاہئے۔ اس کے برعکس اگر ہمیں یقین ہے کہ وہ بنیادی اصول اور جمہوری قدریں جن پر کاربند ہو کر قائداعظم نے مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی آج بھی مفید ہیں تو پھر ہمیں فکر و عمل کا احتساب کرنا پڑے گا۔

اداریہ

ہفت روزہ لیل و نہار لاہور

۸ ستمبر ۱۹۵۷ء

قائداعظم کی ذات گرامی اور تخلیق شعر

سید عابد علی عابد

جوانی کے دنوں کی بات ہے (اور جوانی چونانکہ افتدوانی) میں سرسید کے متعلق حالی نے جو شعر نقل کیا ہے اسے پڑھ کے ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا تھا یعنی۔

"آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے"

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان دنوں دل بردن کا تعلق کسی دیرینہ سال سے منسوب ہونا یا مربوط ہونا کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن جوں جوں ماہ و سال گزرتے گئے اور وہم و گمان کے وہ تارہائے عنکبوت جو دماغ کے نہاں خانوں میں مستور تھے ٹوٹتے چلے گئے اس شعر کی حقیقت واضح اور اس کے معانی روشن ہوتے چلے گئے۔

تصوف اور متعلقہ کوائف کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ مسرت کا نقطہ عروج جسے تواجد کہتے ہیں (اور مسرت معنوی مراد ہے) کسی خوبرو نوجوان کی مدد کے بغیر بھی احساس کی گرفت میں آتا ہے ان دنوں تصوف کے حیرت خانے کی سیر کر کے اشعار کے تہ در تہ مقامات بتدریج مجھ پر روشن ہوئے۔ مثلاً آسی کے یہ دو شعر تو دل میں تیر ترازو ہو گئے۔

نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں
تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا
دل گردوں سے لے کر تا دل دوست
گیا نالہ کئی منزل ہمارا

دوسرے شعر میں ظاہر ہے کہ نالہ ان مقامات تک پہنچا ہے جو دل گردوں سے بلند تر ہیں اور ظاہر ہے کہ دل دوست اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے اور یہ درست ہے وہی ہے حس کے

متعلق کسی نکتہ سنج نے یوں داد بلاغت دی ہے

ہرچہ از دوست مے رسد نیکو است

اور سعدی نے اس سلسلہ میں کیا قیامت کا مصرع کہا ہے

دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست

بہرحال موضوع سے ذرا دور ہٹ جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں اس بات کی توضیح کر سکوں کہ بامتداد زمان مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ محبت وہ ہزار شیوہ اور ہزار عشوہ کیفیت ہے جس کی گوناگونی کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس میں عقیدت سے لے کر عشق تک کی منزلیں آتی ہیں اور جیسا کہ داغ نے کہا ہے دو چار مقام بڑے سخت بھی آتے ہیں۔ بہرحال ایسی صورتوں میں درد محبت کا خدا ہی حافظ ہوا کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی بامتداد زماں مجھ پر روشن ہوئی کہ عقیدت محبت اور عشق جنسی کوائف سے بلند ہو کر ایسے مقام تک پہنچ سکتے ہیں جہاں واقعی کوئی پیر دیرینہ سال بیک نگاہ وہ کام کر دے جو خوبرو جوان مل کر نہیں کر سکتے۔ مصحفی نے کیا خوب کہا ہے

بندہ ہوں میں تو اس کی آنکھوں کی ساحری کا
تار نظر سے جس نے صاحب کمال باندھے

یوں تو قائداعظم کی ذات شروع ہی سے محبوب اور پسندیدہ واقع ہوئی تھی کہ وہ گوناگوں صفات کا مجموعہ تھے۔ لیکن جب انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی اور تن تنہا ایک طرف کانگریس کو اور دوسری طرف انگریز کو للکارا کہ یہ نہ سمجھو ہندوستان میں فقط دو قوتیں ہیں انگریز اور کانگریس ایک تیسری قوت بھی ہے اسے مسلمان کہتے ہیں اور اس کا مظہر مسلم لیگ ہے تو اس نعرہ مستانہ کے بلند کرنے کے بعد ان کی ذات گرامی قوم کے ذوق عمل جوش جہاد اور برکت ایمانی کی دلنشین علامت بن کر رہ گئی۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، طالب

علم، استاد، ہر قسم کے پیشہ ور۔ مختصر یہ کہ برصغیر ہندوپاکستان میں سب مسلمان کم و بیش یہ سمجھنے لگے۔ کہ قائداعظم کی آواز میں وہ گونج ہے جس کی وجہ سے قصر حکومت کے پتھر چٹخ جائیں گے۔

پاکستان کا تصور جو پہلے علامہ اقبال مرحوم کے ذہن میں پر افشاں ہوا تھا آخر کار عملی صورت اختیار کر کے رہا قیام پاکستان کے بعد اگرچہ ہم لوگوں کو بے پناہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور یہ مشکلات بخط مستقیم تقسیم ملک نے پیدا کی تھیں لیکن اس کے باوجود قائداعظم کی محبوبیت میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں نہ ہوئی۔ مصیبتیں اپنی جگہ تھیں مگران کی ذات گرامی سے عقیدت اپنی جگہ پر تھی۔ کہا گیا ہے کہ کسی چیز کے پرکھنے کا معیار یہ بھی ہے کہ یوں دیکھا جائے کہ وہ چیز موضوع شعر بن کر کن منزلوں سے گزر رہی ہے اور کس مقام پر پہنچی ہے اور محرک شعری کی حیثیت سے اسے کیا اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دیرینہ سال قائداعظم ان تمام فنکاروں کے محبوب تھے جو حب وطن کا تصور ہی کرتے تھے تو قائداعظم کی وساطت سے کرتے تھے۔

بالفاظ دیگر حب وطن آزادی قیام پاکستان قائداعظم ہم معنی الفاظ ہو گئے تھے۔ غالباً" دنیا میں کسی شخص کی ذات اتنی متنوع اور گوناگوں نظموں کا موضوع نہیں بنی جتنا قائداعظم کی ذات۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی تعریف کرنے والے انہیں سراہنے والے انہیں چاہنے والے ہر مکتبہ خیال اور ہر مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ فن کاروں میں اور کوئی چیز قدر مشترک کے طور پر پائی جائے یا نہ پائی جائے قائداعظم سے عقیدت لازما" موجود ہوتی تھی۔ محبوبیت کا یہ مقام بلند بھی بہت کم شخصوں کو حاصل ہوا کہ مختلف الخیال فنکار جو اپنے انفرادی مزاج سے پہچانے جاتے ہیں ایک شخص کی مدح سرائی پر متفق ہو جائیں اور جب قائداعظم کی بات کریں تو یوں معلوم ہو جیسے سب کے سب متحد الخیال ہیں۔

ان شعرا سے لے کر جو ہماری کلاسیکی میراث کے صحیح وارث ہیں ان نئے فنکاروں تک جو بالکل ماضی سے منہ موڑ کر مستقبل کے نئے افقوں کی طرف رواں ہیں سب لوگوں نے قائداعظم کے متعلق اپنے جذبات عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ جو اظہار کہیں بانکا تیکھا اور شوخ کہیں اس کا رنگ مدھم ہے کہیں کوئی پہلو نمایاں کیا گیا ہے کہیں کوئی دوسرا پہلو اجاگر کیا گیا ہے مگر بہرحال یہ بات یہیں آکر ختم ہوتی ہے کہ قائداعظم ملت کی زبان اور ملت کے جذبات کے ترجمان ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ میں حفیظ جالندھری سے لے کر عصر حاضر کے کم عمر ترین شاعر تک کی منظومات کا تجزیہ کروں نہ یہ ممکن ہے کہ میں ان تمام شعرا کی فہرست مرتب کروں جنہوں نے قائداعظم کے متعلق نظمیں کہی ہیں لیکن یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ جن چیزوں نے مجھے "شخصاً" زیادہ متاثر کیا ہے ان کا ذکر کروں۔ اس سے دوسرے حضرات کی کاوشوں کی تنقیص مقصود نہیں، مطلوب فقط یہ ہے کہ مختلف الخیال مفکروں نے قائداعظم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔

محمد ہادی حسین قریشی جو میرے ہم سبق بھی تھے اور ہزار داستاں میں میرے رفیق کار بھی۔ سرکاری منصب کے بلند ترین مقام پر پہنچنے کے باوجود اور انتہائی مصروفیتوں کے باوصف شعر کہتے رہے انہوں نے پاکستان کے عنوان سے چند شعر کہے ہیں جن کی بلاغت دیدنی ہے

وہ خواب کہ تخیل اقبال نے دیکھا تھا
اس خواب مسرت کی تعبیر ہے پاکستان
احسان الٰہی ہے گو دیدہ ظاہر میں
اک مردمدبر کی تدبیر ہے پاکستان

دوسرا شعر بہت بلیغ واقع ہوا ہے کہ واقعی پاکستان کا قیام ایک مرد مدبر کی تدبیر آفرینی پر مبنی ہے۔ قائداعظم نے جو تصور انگریزوں اور کانگریس کے سامنے رکھا پہلے اس کا مذاق اڑایا جاتا

رہا لیکن آخر یہ صورت پیدا ہو گئی کہ اسے تسلیم کئے بنا چارہ نہ رہا۔

تاثیر نے قائداعظم کے متعلق دو تین نظمیں کہی ہیں لیکن ان کی وفات پھر جو شعر کہے گئے ہیں ان میں احساس کی صداقت بہت نمایاں ہے قائداعظم سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

ترے جہاں میں زمان و مکاں کی قید نہیں
یہاں کی قید نہیں ہے وہاں کی قید نہیں
ترے طریق پہ چلتاہے کارواں تیرا
ہمارے ملک میں ہے کوئی رازداں تیرا

دوسرا شعر اگرچہ بظاہر استفہام انکاری کا حامل معلوم ہوتا ہے لیکن الفاظ سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ اگر کارواں فیصلہ کر لے کہ قائداعظم کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا تو منزل پر پہنچ جائے گا۔

شورش کاشمیری نے "گفتنی ناگفتنی" میں اگرچہ بصراحت نئے دور کا فرمان نامی نظم میں قائداعظم کا نام نہیں لیا لیکن اس نظم کا ہر مصرع اس دلخراش حقیقت کا ماتم کرتا ہے کہ قائداعظم نے مملکت پاکستان کو تابندہ و درخشاں بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ تاہم شاعر مایوس نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قائداعظم نے جو مملکت قائم کی ہے وہاں آخر ثقافت کا سورج طلوع ہو گا اور ہر شخص کو ذہنی اور روحانی اطمینان نصیب ہو گا۔

ضمیر جعفری "لہو ترنگ" میں لکھتے ہیں

تو نے ظلمت کو چاند اور تارے دیئے
اک شب تار کو چاندی بخش دی
ایک شاعر نے کچھ خواب پیارے دیئے
تو نے تعبیر کو زندگی بخش دی

ایک ملت کو آزاد پرچم دیا
ایک مقصد سے وابستگی بخش دی

آخر میں قیوم نظر کے کچھ شعر سن لیجئے

زمانے نے لی ایک کروٹ نئی
زمیں دیکھتے دیکھتے بٹ گئی
جہاں اک طرف آسماں اک طرف
قفس اک طرف آشیاں اک طرف
ہوئے ایسے شیخ و برہمن الگ
رہے جیسے سرسوں سے ساون الگ
ہر اک ذرہ فتنے اٹھاتا رہا
مگر ایک مطرب کہ گاتا رہا
نئی منزلوں کے ٹھکانے ملے
ہوا کے لبوں پر ترانے ملے
بدل ہی گیا بجلیوں کا چلن
چمن در چمن آشیانے ملے
کہاں رات کی تیرگی پھر کہاں
سحر اس پہ جب نیزہ تانے ملے

پندرہ روزہ استقلال لاہور
یکم جنوری ۱۹۵۸ء

maablib.org

مہد سے لحد تک

سید وقار عظیم

عمر کا وقفہ اس رستہ میں کیا ہے میر سمجھتے ہو
ہارے ماندے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سولیں گے

میر کے اس شعر میں حیات انسانی کو ایک طویل سفر کا وقفہ کہا گیا ہے۔ ایک ایسا وقفہ جس میں سفر کے ہارے ماندے تھوڑی دیر آرام کر لیتے ہیں۔ زندگی کا یہ فلسفہ عام لوگوں کے معاملہ میں شاید صحیح ہو، لیکن ایک ایسی شخصیت کے لئے جسے ایک بہت بڑی قوم کا رہبر اور قائد اعظم بننا ہو، اس میں عزم، ہمت اور بلند حوصلگی کی تابندگی ہو، جو زندگی ایک مسلسل جدّوجہد عزم اور استقلال کی تفسیر ہو وہ قدم قدم پر اس فلسفہ حیات کو اپنا رہبر بناتی ہے کہ یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل تگاپوئے دمادم نہیں تو زندگی، زندگی نہیں کچھ اور ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح اب سے تقریباً ۷۲ برس پہلے، ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی کے ایک محلہ کھارادر میں پیدا ہوئے اور ۷۲ برس تک عزم، استقلال اور خلوص کی زندگی گزاری اپنے فکر، عمل اور دانش سے ایک گم کردہ منزل قوم کو ایک بلند نصب العین کا احساس دلایا، احساس کو عمل کی طرف پھیر کے ایک ایسی سرزمین حاصل کرنے میں اس کی مدد کی، جہاں وہ آزادی کی وہ زندگی بسر کر سکے جو فطرت کا مقصود ہے۔ اور پھر اپنا یہ اہم کام ختم کر کے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جان شیریں جہاں آفرین کے سپرد کی۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی ابتدائی تعلیم سندھ مدرستہ الاسلام اور مشن ہائی اسکول کراچی میں حاصل کی۔ محمد علی جناح کے والد کراچی کے ایک مشہور سوداگر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ اتنی تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد ان کے ساتھ کاروبار میں لگ جائیں لیکن ان کے ایک مخلص انگریز دوست نے جناح کی ذہانت دیکھ کر ان سے کہا کہ آپ میرے کہنے

سے اپنے بچے کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھیج دیجئے۔ چنانچہ ۱۶سال کی عمر میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ اور ۱۸۹۶ء میں ۲۰ سال کی عمر میں امتیاز کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور اسی سال کراچی میں بیرسٹری شروع کی۔ کراچی اس زمانہ میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور جناح کا عزم اور حوصلہ وسعت کا طالب تھا۔ اس لئے جناح کراچی سے بمبئی چلے گئے اور اپنی ذہانت محنت اور قانونی ذکاوت سے بہت جلد دلوں پر ایسا سکہ جمایا کہ حکومت کے قانونی سیکرٹری سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پندرہ سو روپیہ مہینہ کے مشاہرہ پر پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے پر مامور کرنے کی پیشکش کی، لیکن جناح نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں اتنی رقم ایک دن میں کمانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ جناح نے اپنی خود اعتمادی اور ہمت سے بہت جلد اپنے حوصلہ کو عملی شکل دے دی۔ بمبئی کے قانونی حلقوں میں اپنا سکہ جما کر یہ حوصلہ اپنی تسکین کے لئے ایک وسیع تر میدان کا طالب ہوا اور جناح ۱۹۳۰ء میں انگلستان چلے گئے اور چار سال تک پریوی کونسل میں بیرسٹری کرتے رہے اور اس چار برس میں اپنی غیر معمولی قانونی قابلیت، ذہانت، حافظہ اور منطقی انداز استدلال اور پر تاثیر قوت بیان سے یہاں بھی اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ یہ قائد اعظم جناح کی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ اس زندگی میں قانون ان کا حلقہ بگوش ہے اور قانونی نکات ان کی منطق اور استدلال کے بحر مواج کے گہرہائے آبدار۔

قائد اعظم کی حیات مجاہدانہ کا دوسرا پہلوان کے وہ کارنامے ہیں جو انہوں نے قانون ساز مجلسوں میں یادگار چھوڑے ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلسل چالیس سال تک جناح نے اپنی آزادی رائے، بے لوث جذبہ خدمت گزاری اور بے باکانہ جسارت سے وہ امتیاز حاصل کیا کہ ہندوستان کی قانون سازی کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک نمایاں جگہ لکھا جائے گا اور ان بے شمار تقریروں کے علاوہ جو اپنے زور بیان، حاضر جوابی اور منطقی باریک بینی

کے لئے مشہور ہیں جناح کی زندگی کا وہ زمانہ ایک یادگار زمانہ ہے۔ جب انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے بہت سے اہم قانونوں کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں تھا۔ قائد اعظم کی زندگی کے ان پہلوؤں کے ساتھ جو چیز شروع ہی سے ان کی ہمدم و دمساز تھی۔ وہ سیاست تھی۔ ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا کانگریس کی سرگرمیوں میں شرکت عمل کے ساتھ ہوئی۔ جب جناح نے سیاست میں قدم رکھا تو کانگریس کے علاوہ کوئی اور جماعت ایسی نہ تھی۔ جو قانونی وسائل سے حکومت خود اختیاری کے حصول کی حامی ہو۔ اس لئے جناح اس میں شریک ہو گئے، لیکن تھوڑے ہی دن میں جب کانگریس میں دو مختلف الخیال گروہ پیدا ہو گئے تو جناح دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا اور جی کے گوکھلے کے ساتھ ہو گئے۔ اور ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے صدر دادا بھائی نوروجی نے انہیں اپنا پرائیوٹ سیکرٹری بنا لیا۔

یہی سال تھا جب کچھ مسلمانوں نے سیاست کی نئی روش سے گھبرا کر آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی، لیکن چونکہ جناح پوری طرح اس کے مقاصد سے متفق نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے لیگ کو مشورہ دیا کہ وہ قانونی وسیلوں سے حکومت خود اختیاری کے حصول کو اپنا نصب العین بنا لے۔ چونکہ کانگریس کا نصب العین بھی اس وقت یہی تھا۔ اس لئے جناح اس زمانہ میں کانگریس اور لیگ دونوں کے ہیرو بن گئے۔

۱۹۱۴ء میں کانگریس کا ایک وفد جناح کی قیادت میں انگلستان گیا۔ وہاں سے واپسی پر جناح نے مسلم لیگ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بھی اپنا سالانہ اجلاس (کانگریس کی طرح) بمبئی میں ہی کرے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام اور تقریباً" ایک ہی زمانہ میں ہوتے رہے۔ جناح چونکہ لیگ اور کانگریس دونوں کے رکن تھے۔ اسلئے انہیں اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا بہت موقع ملا اور ان کی ان کوششوں نے انہیں ہندو اور مسلمان دونوں کا محبوب بنا دیا اور

لوگوں نے انہیں ''سفیر اتحاد'' کا لقب دیا اس اتحاد اور تعاون کی ایک پختہ شکل وہ معاہدہ تھا۔ جو ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان لکھنؤ میں ہوا۔ اس معاہدہ میں کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کو تسلیم کرلیا۔ ۱۹۱۷ء میں جناح نے ۱۹ ہندو اور مسلمانوں کے دستخط سے حکومت برطانیہ کے پاس ایک منشور بھیجا اوراس میں حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۱۸ء میں برطانوی حکومت نے اس مطالبہ کو مانیٹگو چمسفورڈ ریفارم کی صورت میں پورا کیا۔ کانگریس نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس کے باوجود ان تجویزوں کو قانون کی صورت دے دی گئی اور ۱۹۱۹ء کا قانون نافذ ہو گیا۔ اس پر کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے ناگپور والے اجلاس میں قانونی طریقہ کار چھوڑ کر گاندھی جی کے نان کو آپریشن پر عمل کرنے کی تجویز پاس کی جناح تنہا لیڈر تھے۔ جنہوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد ان کے لئے کانگریس میں رہنا ممکن نہ رہا اور انہوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا' لیکن وہ برابر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ تجاویز پیش کیں۔ لیکن اس کے باوجود نہرو رپورٹ حکومت برطانیہ کو بھیج دی گئی۔ جناح نے یہ تجویز پیش کی کہ اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس طلب کی گئی' لیکن کانگریس نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا' لیکن ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا اور گاندھی جی اس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ جناح نے مسلمانوں کے مطالبات بڑی قابلیت سے کانفرنس کے سامنے پیش کئے اور برطانوی حکومت کو یہ سارے مطالبات ماننے پڑے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک جناح انگلستان میں رہے اس زمانہ میں مسلم لیگ عوام سے دور اور بے تعلق سی ہو گئی۔ جب جناح واپس آئے تو دوبارہ لیگ کی تنظیم شروع کی اور اپنے

جوش، سرگرمی اور اثر سے بہت جلد اسے منظم و مرتب کر لیا اور اب سارے اختلافی گروہ ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں جناح کی قیادت میں مسلم لیگ نے ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو تسلیم کر لیا۔ اب الیکشن لڑنے کا زمانہ تھا۔ لیگ نے ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ بنایا اور جناح کو اس کا صدر منتخب کیا۔ جناح کی قیادت میں مسلمانوں نے اپنے اختلافات مٹا کر لیگ کے امیداروں کو رائیں دیں۔ اور اس وقت کے وسائل کو دیکھتے ہوئے انتخابات میں لیگ کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ صوبوں میں کانگریس کے امیداروں کی کثرت تھی۔ جناح نے کانگریس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس اور لیگ دونوں مل کر وزارتیں بنائیں۔ لیکن کانگریس نے اس تجویز کو نہ مانا اور پنڈت جواہر لال نے یہ دعویٰ کیا کہ ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں۔ حکومت برطانیہ اور کانگریس جناح نے اس دعویٰ کی سختی سے تردید کی اور یہ دعویٰ کیا کہ کانگریس اور حکومت برطانیہ کے علاوہ ایک جماعت اور بھی ہے اور وہ ہے مسلمان قوم۔

۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جناح اس کے صدر تھے۔ اس اجلاس میں لیگ نے ڈومنین اسٹیٹس کے بجائے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنایا اور آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کا مطالبہ کیا۔ اور اس طرح مسلم لیگ نے جناح کی قیادت میں ایک نئی منزل میں قدم رکھا اس کے بعد بنگال اور پنجاب کی وزارتی جماعتیں بھی لیگ میں شامل ہو کر جناح کی قیادت کے زیر سایہ آگئیں یہی زمانہ تھا جب قائداعظم نے یہ بات پہلے سے بھی زیادہ شدت سے محسوس کی کہ مسلمان عوام کو سیاسی حیثیت سے بیدار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ انہوں نے ملک کے مختلف حصوں کے دورے کئے اور ہر جگہ پہنچ کر مسلم لیگ کمیٹیوں کی تشکیل کی اور مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ ایشیا میں اسلام کو اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے قوی بنانے کا واحد ذریعہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت زیادہ ہو اور یہ

چیز اتحاد اور تنظیم کے بغیر ممکن نہ تھی۔ قائداعظم کی قیادت نے لوگوں کے دلوں میں اتحاد اور تنظیم کا ولولہ اور جوش پیدا کیا اور جو مسلم لیگ اب تک صرف اعلیٰ متوسط طبقے تک محدود تھی وہ اب ایک عوامی تنظیم اور تحریک بن گئی اور قوم نے پہلی مرتبہ اپنے محبوب رہنما کو قائداعظم کا لقب دیا۔

۱۹۴۰ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کا ریزولیوشن پیش کیا اور اس بات کا مطالبہ کیا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ وہاں اپنی آزاد حکومت قائم کر کے اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اور پروان چڑھ سکیں۔ اس تجویز کے بعد قائداعظم کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ خود مسلمانوں کو اس خیال پر متفق اور متحد کریں کہ پاکستان ان کا حق ہے اور پاکستان کے قیام کے علاوہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا اور کوئی حل نہیں۔

قائداعظم کو قوم نے اب مسلم لیگ کا مستقل صدر منتخب کر لیا تھا اب کام کی ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ آپ نے اپنی وکالت چھوڑ کر سارا وقت قوم کے کاموں کے لئے وقف کر دیا اور پاکستان کے حصول کی کوشش ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن گیا۔ خود مسلمانوں میں بہت سے لیڈر ایسے تھے جو پاکستان کے مطالبے اور اس کے منطقی جواز کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ قائداعظم نے رفتہ رفتہ انہیں اپنا ہم خیال بنایا اور مسلمانوں کے اکثر بڑے بڑے رہنما لیگ کے رکن بنتے گئے۔

اگست ۱۹۴۰ء میں سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے اعلان کیا کہ جنگ ختم ہونے پر حکومت برطانیہ ہندوستان کی سیاسی گتھی کا کوئی ایسا حل تلاش کرے گی جو ہر جماعت کے لئے قابل قبول ہو۔ آخر ۱۹۴۲ء میں ایک تجویز پیش کی جس میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے اس مطالبہ کو کہ انہیں الگ مملکت بنانے دی جائے کو تسلیم کیا گیا اور آخر طویل گفت و شنید کے بعد جس

میں قائد اعظم نے انگریزی اور ہندوستانی سیاست کے بے شمار شاطروں کی چالوں کا تنہا مقابلہ کیا اور آخر طے یہ ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا فیصلہ عوام کی رائے سے ہو گا۔

اس تجویز کے مطابق جنوری ۱۹۴۶ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہوئے اور مسلم لیگ نے قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان کے مطالبہ کو الیکشن کی بنیاد بنایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ نے مرکزی نشستوں میں سو فیصدی نشستیں حاصل کیں اور صوبائی نشستوں میں ۴۸۲ میں سے ۴۲۷ انتخابات کے اس فیصلہ کن نتیجے نے حکومت کو اس بات پر مجبور کیا کہ کوئی مستقل فیصلہ کرنے کے لئے باہمی کانفرنسیں ہوں۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان گفتگو کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ایک مستحکم نصب العین، اس نصب العین پر پختہ یقین، اس یقین کو منطقی استدلال کی کسوٹی پر پرکھنے کی عدیم المثال قابلیت نے ان گفتگوؤں میں قائد اعظم کو ہمیشہ اپنے حریفوں پر مظفر و فتح یاب کیا۔ لیکن کوئی پندرہ مہینہ کی گفتگوؤں کے بعد بھی کوئی عملی صورت پیدا نہ ہوئی تو ۳ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تجویز پیش کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اسے منظور کر لیا۔ اور اسی تجویز کی رو سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی نئی مملکت کا افتتاح ہوا۔ اس مملکت کا قیام قائد اعظم کی سات سال کی دن رات کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ اس لئے قوم نے قائد اعظم کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل منتخب کیا اور انہیں اپنی ضعیف العمری اور جسمانی ناتوانی کے باوجود تقریباً ۷۱ سال کی عمر میں ایک نئی مملکت کی رہنمائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا۔

اس نئی مملکت میں قائد اعظم کی حیثیت محض ایک آئینی گورنر جنرل کی نہیں بلکہ قوم کے سب سے بڑے رہبر کی تھی جہاں ایک طرف ایک نئی سیاسی مملکت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ

میں تھی دوسری طرف قوم اور ملک اپنی ہر چھوٹی بڑی مشکل میں ان کی رہبری اور رہنمائی کے محتاج تھے اس لئے اس بڑے منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قائداعظم کو اپنا یہ آئینی عہدہ سنبھالتے ہی نہ صرف اپنی ساری ذہنی قوتوں سے بلکہ اس سے بھی زیادہ جسمانی قوتوں سے کام لینے کی ضرورت پڑی۔ پاکستانیوں کو پاکستان انہیں کی جرات ہمت اور استقلال سے ملا تھا۔ اب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جرات، ہمت اور استقلال کا مرکز بنائیں گے۔ اس بلند نصب العین کے حصول کی خاطر قائداعظم نے اپنی راحت اور سکون کی قربانی کی۔ حصول پاکستان سے پہلے اس کے حصول کی جدوجہد میں مرحوم کی زندگی راحت و سکون سے ناآشنا رہی لیکن حصول پاکستان کے بعد تو زندگی کا راحتیں بالکل ہی ختم ہو گئیں۔ اس نئی حکومت کے معمولات اس آئین کے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ یہ کمی پاکستان کی زندگی کے پہلے سال میں قائداعظم کو پوری کرنی پڑی اور اسی لئے جب مرکزی یا صوبائی حکومتوں میں، پاکستان سے الحاق کرنے والی ریاستوں میں سرکاری دفتروں کے کارکنوں کی زندگی میں کوئی ذرا سی پیچیدگی بھی پیدا ہوتی تو اسے صرف قائداعظم سلجھاتے۔ حکومت کا چھوٹا یا بڑا شاید ہی کوئی کام ایسا ہو جو کسی نہ کسی منزل میں قائداعظم کے پاس نہ پہنچتا ہو اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اس ضعیف جسم کو جس کی سفیدی میں خون کی سرخی کی جھلک تک باقی نہیں رہی تھی، راتیں جاگ کر کاٹنی پڑتیں۔ دنوں کو فائلوں کے انباروں کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے سیاسی نمائندوں سے ملنا پڑتا، مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے وزیروں کو مشورے دینے پڑتے۔ قوم کے مستقبل اور اس کی تنظیم کے منصوبے بنانے پڑتے اور ایک ایسے وقت جب کوئی مسئلہ اتنا اہم اور تشویشناک بن جاتا کہ لوگوں کو پاکستان کی بنیادیں ہلتی نظر آتیں تو یہ اے برس کا بوڑھا قائد اپنی فکر سے، اپنے عمل سے اور اپنے ذاتی اثر سے آن کی آن میں ہر مشکل کو آسان بنا دیتا۔ وہ بلوچستان، سرحد، پنجاب اور مشرقی پاکستان کے دورے کرتا۔ جلسوں میں شریک ہوتا،

دھواں دھار تقریریں کرتا' تعمیری کاموں کی بنیاد رکھتا' لوگوں کا ہراس دور کرتا' انہیں ڈھارس بندھاتا' ہر ایک کی سنتا اور اسے اپنے پاس سے مطمئن واپس کرتا' گھر میں رہتا تو راتوں کو برآمدوں میں ٹہل ٹہل کر قوم کے غموں کا مداوا تلاش کرنے کی فکر کرتا اور گھر سے باہر بڑھاپے میں جوانی کی ہمت سے کام لیتا' ہوائی جہاز' ریلیں' موٹر اور کبھی کبھی صرف دبلے پتلے پاؤں اسے کہیں سے کہیں پہنچاتے رہے۔ وہ جہاں جاتا مشکلیں آسان ہوتیں اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگتے' پاکستان زندہ باد کی آوازیں بلند ہوتیں۔ لیکن اس جرات ہمت اور قوم کے درد اور محبت نے قائد اعظم کے ضعف و ناتوانی کو بڑھایا۔ بیماریاں کمزور جسم پر اپنا تسلط جماتی رہیں اور اب وہ قائداعظم زندہ نہیں۔ پاکستان البتہ زندہ ہے اور اس کی نشانی ہمیشہ زندہ رہے گی۔

قائد اعظم پر مصروفیات کی اس کثرت کا یہ اثر ہوا کہ وہ بیمار ہو گئے اور ڈاکٹروں کے مشورے سے مجبور ہو کر انہیں کراچی چھوڑ کر آرام کی خاطر زیارت جانا پڑا' لیکن پاکستان کی محبت نے اس بیماری میں بھی انہیں وہاں سے کھینچ بلایا۔ اور آپ ۲۹ جون ۱۹۴۸ء کوئٹہ سے کراچی آئے کہ یکم جولائی کو اسٹیٹ بینک کا افتتاح فرمائیں۔ افتتاح کے بعد ۴ جولائی پھر کوئٹہ واپسی ہوئی اور ۶ جولائی کو زیارت تشریف لے گئے اس کے بعد انفلوئنزا ہوا۔ اچھے ہو گئے پھر بیمار ہوئے اور آخر بیماری نے پیچیدگی اختیار کرلی۔ اس کے بعد سے طبیعت کی کیفیت میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ جب طبیعت اچھی ہوتی تو پاکستان کے سرکاری کام میں لگ جاتے۔ لوگ کراچی سے آتے اور اہم معاملات میں ہدایات لے کر چلے جاتے طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو مجبوراً" لیٹ جاتے۔ ۸ ستمبر تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد سے طبیعت بے حد خراب ہو گئی۔ ۱۱ ستمبر کو اسی حالت میں کراچی آئے۔ ساڑھے چار بجے ہوائی جہاز سے اترے اور اسی دن رات کو ۱۰ بج ۲۵ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا.... اناللہ وانا الیہ راجعون ○ خدا

نے قوم کی خدمت کے لئے پیدا کیا تھا' اسی کی خدمت میں جان دی اور قوم نے خدا کی اس امانت کو ۱۲ ستمبر کو شام کے ۶ بج کر ۲۴ منٹ پر سپرد خاک کر دیا۔

بابائے ملت قائد اعظم محمد علی جناح اللہ کو پیارے ہوئے اس لئے کہ وہ قوم کے پاس اللہ کی امانت تھے۔ اب ان کی دی ہوئی امانت مملکت پاکستان ہمارے پاس ہے۔ اس امانت کی پرورش انہوں نے اپنے خون جگر سے کی ہمیں اپنے خون جگر سے اسے پروان چڑھانا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے آمین ثم آمین۔

ماہ نامہ ماہ نو لاہو

اپریل ۱۹۷۹ء

جناح کے بغیر

شیخ عبدالقادر

جب لارڈ ویول کے زمانے میں شملہ میں کانگریس اور لیگ کے درمیان کسی ممکن سیاسی سمجھوتے کے لئے بات چیت ہو رہی تھی۔ اس وقت میں بھی حسن اتفاق سے شملہ گیا ہوا تھا۔ ایک دن ایک غیر مسلم نیشنلسٹ جو میرا واقف تھا۔ راستے میں ملا اور اس نے نہایت تبختر سے مجھے یہ خبر سنائی کہ کانگریس کے بڑے بڑے اراکین اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ وہ اگر قائداعظم کو راضی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ ان کی شرکت کا انتظار کئے بغیر جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر گزریں گے۔ ان دنوں نئے نئے فارمولے بہت بنتے تھے اور عموماً" انگریزی الفاظ کی صورت اختیار کرتے تھے۔ میرے ملاقاتی نے بڑے جوش کے ساتھ جو لفظ انگریزی میں کہے۔ ان کا ترجمہ یہ تھا۔

"جناح کو ساتھ لے کر (اگر ممکن ہو) ورنہ جناح کے بغیر۔"

میں نے تعجب سے اس شخص کی طرف دیکھا مگر اس سے کسی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ الفاظ محض دھمکی ہیں۔ ورنہ کانگریس کے زیادہ پرانے لیڈر خوب سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہم آہنگ ہوئے بغیر برطانوی حکومت انہیں آزادی دینے کی طرف مائل نہیں ہو گی اور مسلمانوں کی باگ اس وقت قائداعظم کے ہاتھ میں تھی۔ اسی زمانے میں انگلستان کے بعض ہمدردان کانگریس کی آواز اٹھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی بڑی اکثریت کی خواہشوں اور آرزوں کا راستہ روکنے کی اقلیت کو اجازت دی جائے اس آواز نے اس دھمکی کے لفظوں میں اور بھی زور پیدا کر دیا تھا اور یہ نعرہ کانگریس کے حلقوں میں بہت عام ہو گیا بظاہر اس نعرے کے حق میں کئی دلائل تھے مگر جو غلطی اس جماعت کے سیاست دانوں اور ان کے بعض ہمدرد انگریزوں سے ہوئی وہ یہ تھی کہ انہوں نے قائداعظم

کو صرف ایک واحد فرد سمجھا اور اس بات کا احساس نہ کیا کہ اس کی آواز اس کی پوری قوم و ملت کی آواز تھی۔

کانگریس اور لیگ کے مقابلے اور مقابل صف آرائی کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ اس سے پہلے کئی معرکے ہو چکے تھے اور پھر انگلستان سے کمیشن کی آمد پر بھی بہت سے مقابلے ہوئے مگر جو غیر مساوی سیاسی مقابلہ شملہ کی اس کانفرنس کے موقع پر ہوا اس جیسی نمائش پہلے نہ ہوئی تھی۔ اس نمائش کا پہلو خاص طور پر قابل دید تھا کہ ایک طرف گاندھی جی اپنے مہاتمائی لباس میں ملبوس اور اپنے بے شمار پیرووں کے جمگھٹے کے ساتھ شملے میں پہنچے اور مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صدر کانگریس تشریف لائے۔ یوپی کے وزیر اعظم مسٹر پنت ان کے ترجمان کی حیثیت سے ہمراہ آئے گاندھی جی راج کماری امرت کور کے دولت کدہ میں فروکش ہوئے۔ یہ مکان اپنے ممتاز مکین کی طرح خصوصیت رکھتا تھا۔ یعنی وہ خاتون کھدر کے لباس میں ملبوس کیمبرج اور آکسفورڈ کی بہترین انگریزی بولتی تھی اور اس کی لباس کی سادگی کے باوجود اس کمرے کی زینت اور آرائش مشرقی اور مغربی دونوں سجاوٹوں کے نمونے دکھاتی تھی کانگریس کی اور بڑی شخصیتیں بھی بڑی تعداد میں اس موقع کے لئے شملہ میں جمع تھیں اور سب لوگ راجکماری صاحبہ کے یہاں آکر صلاح و مشورے میں شریک ہوئے اس ابنوہ کے مقابلے میں، لیگ کی طرف سے قائداعظم ہوٹل کے ایک کمرے میں متمکن تھے۔ ان کی اپنی خداداد چمک کے سوا کوئی چمک دمک کا سامان ان کے ہمراہ نہیں تھا۔ گویا ایک دبلا پتلا شخص الف کی طرح سیدھا یکہ و تنہا ایک گروہ کا سامنا کرنے پر مامور تھا ایک اور چیز جو کانگریس کے حق میں پلڑا جھکانے کا باعث تھی وہ کانگریس کے پریس کی طاقت تھی۔ اس جماعت کے سب بڑے بڑے اخباروں نے اپنے نمائندے اس کانفرنس میں بھیجے تھے اور وہ اپنا پورا توپ خانہ لیگ اور مسلمانوں کے خلاف اور کانگریس کے حق میں استعمال کر رہے تھے۔

بعض چھوٹی چھوٹی مصنوعی ترکیبیں تھیں۔ جن کی کانگریس والوں کو خوب مشق تھی اور جن کا دوسری طرف وجود نہ تھا۔ مثلاً کانگریس کے کیمپ میں یہ معمول تھا کہ صدر کانگریس وائسرائے کے یہاں جاتے وقت مہاتما جی سے برکت اور دعا لے کر جائیں اور آتے وقت مہاتما جی کو ساری کارگزاری کی رپورٹ سنا کر جائیں۔ یہ سمجھنا ہم معمولی قسم کے انسانوں کے فہم سے بالاتر تھا کہ کانگریس کے صدر کے فرائض میں مہاتما جی کے یہاں' یہ حاضراشی کیوں داخل تھی جب کہ مہاتما جی اس اعلان سے کسی وقت نہ تھکتے تھے کہ وہ تو صرف ایک ہمدرد مشیر کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ کانگریس میں ان کی حیثیت چار آنے ماہوار دینے والے ممبر کی بھی نہیں مگر صدر پر یہ پابندی عائد کرنے سے جو اثر گاندھی جی کے متعلق پبلک پر یا وائسرائے پر پڑتا تھا وہ ظاہر ہے قائداعظم نے کسی ایسے بیرونی اثر سے اس کانفرنس میں یا کسی اور موقع پر کام نہیں لیا۔ وہ صرف مسٹر محمد علی جناح کہلانے پر قانع رہے۔

صدر کانگریس کی روزانہ آمدورفت' مہاتما گاندھی کے یہاں تو پھر بھی ایک سیاسی اہمیت رکھتی ہے۔ کانگریس والوں نے تو ایک غیر سیاسی بات سے اس موقع پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی' حالانکہ انہیں اس بات سے قدرے اجتناب لازم تھا واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن لارڈ ویول کے جی میں یہ خیال آیا کہ گاندھی جی کو اپنے یہاں بلائیں اور ان سے باتیں کریں۔ اس کے لئے ان کی خدمت میں خط بھیج دیا گیا جس میں یہ لکھا تھا کہ وائسرائے صاحب اپنی سواری کا خاص رکشا مہاتما جی کو لانے کے لئے بھیجیں گے جب یہ خبر نکلی تو بعض لوگوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مہاتما جی چونکہ اصولاً" رکشا کی سواری کو مذموم سمجھتے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ انسان انسانوں کو گھوڑوں کی طرح استعمال کرے۔ اس لئے وہ شاید رکشا پر سوار ہونے سے انکار کر دیں مگر معلوم نہیں کہ کس مصلحت سے انہوں نے اس موقع پر رکشا پر جانا قبول کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں عوام جن میں بہت سے مشہور مقامی کانگریسی بھی تھے۔ وائسرائے کے گھر کے باہر

سڑک پر دور دیہ کھڑے ہو گئے کہ گاندھی جی کو رکشا میں بیٹھے دیکھیں۔

ایک طرف بناوٹ اور دوسری طرف سادگی' اس کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں گر میں سمجھتا ہوں کہ باتوں باتوں میں جو تھوڑا سا ذکر آگیا وہ کافی ہے وہ کانفرنس چونکہ بے نتیجہ رہی اس لئے اس کے تفصیلی حالات میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ فقط ایک چیز کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ اس کانفرنس کے اختتام پر بھی کانگریس والے کہتے تھے اور دوسرے موقعوں پر بھی کہا گیا کہ قائداعظم کی طبعیت میں ضد تھی اور ان کی ضد کے سبب برطانوی حکومت پاکستان کو علیحدہ مملکت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی۔ یہ بات درست نہیں۔ قائداعظم ارادوں کے پکے اور مضبوط عزم والے ضرور تھے اور جو بات غور و خوض کے بعد وہ صحیح مان لیتے تھے اس سے انہیں دوسری طرف پھیرنا آسان نہ تھا۔ لیکن جس معنی میں ضد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے قائداعظم اس سے بہت بلند تھے۔ قائداعظم سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں کسی قسم کی ضد کو دخل نہیں دیتے تھے۔ ان کا عمر بھر کا رویہ ان کی بااصول زندگی اور خلوص اس کی شہادت دیتا ہے جب سے انہوں نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ اپنی عمر کے آخری دس پندرہ سال چھوڑ کر برابر نیشنلسٹ رہے اور ان کی اسمبلی کی اور دوسرے مواقع کی تقریریں شائع ہو چکی ہیں اس بات کی شاہد ہیں کہ قائداعظم جس راہ پر چلتے تھے اس پر ثابت قدم رہے۔ یہاں تک کہ جب انہیں لیگ سے تعلق ہو گیا اور مسلمانوں کی خاص ضروریات کا احساس ان کے اندر پیدا ہوا تب بھی وہ عرصے تک اس کوشش میں رہے کہ جس طرح ہو سکے لیگ اور کانگریس میں تعاون پیدا کریں اور دونوں مل کر متحدہ مقاصد کو مدد پہنچائیں مگر جب انہیں بار بار کی مایوسیوں اور تلخ تجربوں سے یقین ہو گیا کہ ابنائے وطن چکنی چپڑی باتوں کے علاوہ کسی طرح بھی مسلمانوں کی تعلیمی' صنعتی' تجارتی یا سیاسی ترقی میں مدد دینے کو تیار نہیں اور ان کی حیثیت کو ملک کی اکثریت میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں۔ تب انہوں

نے آواز بلند کی کہ ملک میں دو قومیں ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی روایات اور تمدن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ یہ عقیدہ ان کے دل میں رفتہ رفتہ راسخ ہو تا گیا اور اس نے پاکستان کی صورت اختیار کی۔ اس پر بھی وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی خواہش تھی کہ یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے اچھے ہمسائے بنیں اور ان سب چیزوں میں جن میں مل کر کام کرنے میں دونوں کا فائدہ ہو۔ مل کر کام کرنا سیکھیں۔ افسوس ہے کہ دوسری جانب سے ان کے اس دوستانہ رویہ کے جواب میں ان کے ہم خیال بہت زیادہ نہ نکلے۔ تاہم قائداعظم نے جو پیغامات مختلف موقعوں پر پاکستانیوں کو دیئے ہیں۔ ان میں اس کی تلقین موجود ہے۔

پاکستان اور ہندوستان دونوں کو جیسی اور جتنی آزادی ملی ہے وہ قائداعظم اور گاندھی جی کے اشتراک کا نتیجہ ہے جب ہند کو چھوڑ جاؤ کی آواز میں دونوں شریک ہوئے تب سے منزل قریب آئی۔ آہ! افسوس کہ ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی سے دونوں جماعتیں محروم ہو گئیں اور دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے وقفے کے بعد اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ آج ہم پاکستانی پھر "جناح کے بغیر" ہیں اور گھر گھر اس کے ہم سے رخصت ہو جانے کا سوگ ہو رہا ہے۔ مگر "جناح کے بغیر" کی جو آواز میں نے شملے میں سنی تھی اس میں اور اس وقت "جناح کے بغیر" ہونے کی آواز میں بہت فرق ہے۔ اس وقت پاکستان محض قائداعظم کا خواب تھا اب وہ اپنے خواب کی تعبیر اپنی زندگی میں دیکھ کر اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ اب جناح کا جسم تہ خاک چلا گیا ہے مگر اس کی روح پاکستان کی ترقی کرتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہی ہے اور جو ہدایات اس نے ہمارے لئے چھوڑی ہیں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور ان سے ہماری ہمت بندھ رہی ہے۔ پاکستان کے دارالحکومت کراچی وہ مدفون ہے۔ جہاں دنیا کے ہر حصے سے ممتاز اشخاص اور اکابر آکر ان کے مزار پر پھول چڑھاتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ کس طرح اس نے ایسی بڑی مملکت مسلمانوں کے لئے کسی جنگ و جدل کے بغیر حاصل کرلی۔ آج لاکھوں،

بلکہ کروڑوں فرزندان توحید اس یگانہ روزگار شخص کی روح کو ثواب پہنچا رہے ہیں اور جوش عقیدت سے پاکستان زندہ باد کے ساتھ 'قائداعظم زندہ باد کے نعرے بھی لگاتے ہیں وہ اپنی ملت کا سچا عاشق تھا اور اسی کی خدمت کرتے کرتے بستر مرگ پر لیٹ گیا حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

ماہنامہ مخزن لاہور

نومبر ۱۹۴۹ء

اقبال ..... اور ..... قائداعظم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

بڑے آدمیوں میں بالعموم ایک قدر مشترک ہوتی ہے وہ یہ کہ ان کی سوچ کا انداز کم و بیش ایک سا ہوتا ہے۔ ہمارے دیس کے دو عظیم انسانوں علامہ اقبال اور بابائے ملت قائداعظم کی زندگی مین یہ قدر مشترک بہت نمایاں نظر آتی ہے۔

دونوں نے قانون کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا اور اس میں ممتاز مقام بھی حاصل کیا تھا۔ دونوں کو اپنے دیس سے محبت تھی اور اس برصغیر کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالت سے باخبر تھے اور یہاں کے باسیوں کی واماندگی، غیر ملکی حاکموں کے جابرانہ سیاسی تدبر کی چیرہ دستیاں، محکومی اور غلامی کے اثرات، ان سب باتوں سے آشنا تھے۔

ہرچند ان دونوں کی زندگی کی راہیں الگ الگ تھیں اقبال فلسفہ اور شعر و ادب کے دلدادہ تھے اور قائداعظم قانون اور سیاست کے رسیا، لیکن دونوں کے دل اپنی قوم کے لئے مضطرب تھے۔ دونوں اپنے اپنے مشاغل حیات اور طرز کار کے مطابق قومی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں اور سرگرم عمل رہے۔ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کو شعر و ادب کے قالب میں ڈھال کر برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں اور بالخصوص مسمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظر ہمالیہ پہاڑ سے اٹھ کر، عالم اسلامی کا جائزہ لیتی ہوئی مسجد قرطبہ کی دیواروں پر پڑی اور وہاں سے ابھری توافق انسانیت سامنے آیا۔ وہ حالات و ماحول کے ساتھ ساتھ اپنے نغمات الاپتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی آواز عالمگیر فضامیں گونجنے لگی۔

اقبال نے ایک مسلمان متدین گھرانے میں جنم لیا تھا اور ابتدا ہی سے اس نے دیں اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ساتھ ساتھ تاریخ عالم اور بالخصوص تاریخ اسلام پر بھی نظر ڈالی تھی۔ شرق و غرب کے فلسفیانہ علوم کے ارتقاء کو بھی غور سے دیکھا تھا اور اسی مطالعے اور تجربے کی

روشنی میں اس نے ایک منظم اسلامی نظام حیات اور اس کے لائحہ عمل کو ایک پیام کی صورت میں پیش کیا' لیکن اس کا یہ پیام' جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حاوی تھا' محض اس کے مسلمان ہونے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اپنے وسیع مطالعے اور تجربے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسلامی نظام حیات ہی ایک ایسا دستور العمل ہے جو انسانی نسل کی قومی زندگی کی بقا کے لئے لازمی ہے دنیا کے مختلف مفکرین نے مختلف ادوار میں مختلف انداز میں اپنے اپنے دستور العمل وضع کئے لیکن تاریخ نے بالا خران کے فرسودہ اور ناکارہ ہونے کا فیصلہ صادر کیا۔

حضرت قائداعظم نے بھی اپنی قانونی اور سیاسی سرگرمیوں میں مختلف میدان عمل دیکھے تھے۔ دنیائے سیاست کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ اپنے ہم وطنوں کی زبوں حالی کو شدت سے محسوس کرتے تھے اور موقع و محل کے مطابق کبھی قانون کی خرو مندانہ رہگزاروں سے گزرتے اور گہری سوچ بچار سے اپنی قوم کے دکھوں کا مداوا کرتے اور کبھی عشق کی طرح' آتش نمرود میں بھی بے خطر کود پڑتے۔

مختلف سیاسی جماعتوں کے ہمراہ چلتے کبھی اعتدال پسندوں اور کبھی شدت کاروں کا ساتھ دیتے' غرض پاک و ہند کے تقریباً" تمام سیاسی گروہوں کو دیکھا اور آزمایا اور پھر ان کے عمر بھر کے سیاسی تدبر اور تجربے نے بتایا کہ اس دیس کے باسی بالخصوص ہندو قوم کسی صورت میں بھی مسمانوں کے ساتھ کوئی منصفانہ فیصلہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ برصغیر میں مسلمانوں کے الگ تھلگ وجود کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ انہیں اسلامی ثقافت اور تمدن تسلیم نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک ایسی الگ آزاد مملکت کی ضرورت ہے جہاں وہ رہ کر آزادی سے سانس لے سکیں اور اسلامی شعار کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

اس کام کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو پکارا اور سب سے پہلے انہیں تنظیم کی دعوت دی

کیونکہ انسان کی زندگی، انفرادی ہو یا اجتماعی، تنظیم کے بغیر سنور نہیں سکتی۔

بابائے ملت حضرت قائداعظم نے اپنے ہم عصر مفکر اور ہمنوا اقبال کا فیصلہ بھی سن رکھا تھا۔ اس فیصلے کو جو ایک خواب کی صورت میں تھا، عملی صورت دینے کی سر توڑ کوشش شروع کی۔

پاکستان کا نعرہ بلند کیا، اور اس کے حصول کے لئے ایک منظم مہم کا آغاز ہوا۔ اور اس مہم نے اتنا زور اختیار کرلیا کہ بالاخر پاکستان جسے دنیا اور بالخصوص ہندو ایک خواب تصور کرتے تھے، ایک حقیقت بن کر سامنے آگیا۔

پاکستان کی تشکیل، تعمیر اور تکمیل میں اقبال اور قائداعظم ایک دوسرے کے ممد و معاون تھے ان کا باہمی تعاون محض کسی پرجوش جذبے کا اظہار ہی نہ تھا بلکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ابھری ہوئی آواز تھی ان کے اشتراک فکر و عمل کی بنیاد ان کے سالہا سال کے عمیق مطالعے اور ذاتی تجربے پر تھی۔

یہی ان میں قدر مشترک تھی۔

ماہنامہ کتاب لاہور

۲۵ دسمبر ۱۹۶۳ء

قائداعظم کے دو ہتھیار ...... دلیل اور محنت

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

تیرہ سال ہوئے آج کے دن قائداعظم محمد علی جناح ہم سے رخصت ہو کر اپنے پروردگار سے جا ملے تھے۔ ہر سال ۱۱ ستمبر کی تاریخ آتی ہے تو قائداعظم کی رحلت کا زخم پھر سے ہرا ہو جاتا ہے' انتقال سے سال بھر پہلے انہوں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے خواب کی عملی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی اور جس مقصد کی خاطر انہیں شبانہ روز محنت کرنا پڑی تھی' اس کا حیات افروز نتیجہ بھی ان کے سامنے آگیا تھا' لیکن کس قدر رنج و غم کا مقام ہے کہ پاکستان کی بنیادیں بھی ہنوز استوار نہ ہونے پائی تھیں کہ اس کا بانی اس جہاں فانی سے سفر کر گیا۔

لندن کے سب سے معزز اور اہم اخبار روزنامہ ٹائمز کے ایڈیٹر نے اپنے اخبار مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے انتقال پر جو مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم کیا تھا اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"دنیا میں ایسے بہت کم سیاسی مدبر ہمیں نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی پالیسی کے مطابق زمانے کے حالات و واقعات کا رخ موڑنے میں مسٹر جناح کے برابر کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کا دماغ ہر قسم کے شک و شبہ سے صاف اور ہر نوع کی غلط فہمیوں سے پاک تھا دور از کار تصورات و توہمات سے انہوں نے کبھی واسطہ نہیں رکھا تھا وہ اول و آخر ایک حقیقت پسند انسان تھے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظم کی یہی حقیقت پسندی ان کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ خدا نے انہیں ایسی بصیرت عطا کی تھی کہ وہ بہت جلد حقیقت کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ایک بہت بڑے وطن پرست ہندوستانی کی حیثیت سے کیا تھا چنانچہ ۱۹۲۰ء تک وہ انڈین نیشنل کانگریس کے نہایت سرگرم' مخلص اور بلند

پایہ لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ان کا راستہ کانگریس سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنی تمام تر قوت آل انڈیا مسلم لیگ پر صرف کرنا شروع کر دی، لیکن اس کے باوجود ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہو گا، ہندوستان کی آزادی کی منزل قریب نہیں آسکتی۔ ۱۹۳۹ء تک قائداعظم کی کوششیں بدستور اس کام پر صرف ہوتی رہیں اور انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر بڑی سے بڑی جدوجہد سے دریغ نہ کیا۔ میثاق لکھنؤ، ہوم رول لیگ، سائمن کمیشن، گول میز کانفرنس۔ ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ان تمام سیاسی معرکوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو ہر جگہ یہی دکھائی دے گا کہ قائداعظم دل و جان سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قائداعظم کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور انہوں نے قطعی طور پر محسوس کر لیا کہ جب تک برعظیم ہند میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ وطن تعمیر نہیں ہو گا۔ یہ مصائب رفع نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اپنی زندگی کی آخری جدوجہد شروع کی جو مسلسل سات سال تک جاری رہی تا آنکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد و خود مختار مملکت وجود میں آئی۔ اقبال کے یہ شعر بے اختیار اس وقت زبان پر آتے ہیں۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

کسب حلال اور بے خوفی

علامہ اقبال نے ایک مرتبہ قائداعظم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسٹر جناح میں ایک

ایسی خوبی ہے جو آج مجھے کسی مسلمان میں نظر نہیں آتی۔ جب بڑے ادب کے ساتھ ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ خوبی کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ مسٹر جناح کو نہ تو بڑی سے بڑی دولت اور اونچے سے اونچے منصب کا لالچ دے کر خریدا جا سکتا ہے اور نہ کوئی شخص بہکا کر انہیں غلط راستے پر ڈال سکتا ہے علامہ مرحوم کے اصل انگریزی الفاظ یہ تھے:

HE IS INCORRUPTIBLE AND UNPURCHASABLE

سچ پوچھئے تو یہ دونوں خوبیاں ایمان کامل کی علامت ہیں اور ان کا ظہور صرف اس شخص میں ہوتا ہے جو برگزیدگان خاص میں شامل ہو۔ ہم نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مدعیان زہد و رع کو ثمن قلیل کے عوض میں بکتے دیکھا اور بڑے بڑے اہل جبہ و عمامہ کو اہل دل کی چوکھٹ پر ناصیہ فرمائی کرتے پایا۔ جناح تنہا ایک شخص تھا جس کی اس بازار میں کوئی قیمت نہ تھی۔ وہ ہر خوف سے آزاد' ہر لالچ سے بے نیاز' ہر طمع سے بے پروا اور ہر مکر و فریب سے پاک تھا

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اقبال علیہ الرحمتہ ہی کا ایک اور قول یاد آگیا ہے آپ سے ایک مرتبہ کسی شخص نے پوچھا کہ فقر کی پہلی منزل کون سی ہے آپ نے جواب دیا "کسب حلال" پھر عرض کیا گیا کہ آزادی منزل کیا ہے تو فرمایا۔ "بے خوفی" علامہ مرحوم کے اس قول کی روشنی میں قائداعظم کی پوری زندگی کا مطالعہ کیجئے تو ان کی سرگزشت حیات سر سر تاپا محنت و مشقت اور کسب حلال کا ایک مرقع نظر آئے گا۔ ان کی بے خوفی' دلیری' جرات اور صداقت اسی کسب حلال کا نتیجہ تھی۔

پس آج تک کہ ہم قائداعظم کی یاد میں اپنی چشم تر سے آنسو گرا رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی انہی دو خوبیوں کو مشعل راہ بنائیں۔ کوئی شخص کسب حلال کے بغیر جرات اور

صداقت کی دولت حاصل نہیں کر سکتا اور کسب حلال ناممکن ہے۔ جب تک ہم صبح و شام محنت کرنے کی عادت ڈالیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی یاد رکھیے کہ کوئی شخص یا کوئی قوم اس کارگاہ عالم میں محنت کے بغیر ایک قدم ترقی نہیں کر سکتی۔

تین طاقتوں کا نعرہ حق

قائداعظم نے مسلمانوں کی رہنمائی کا بار گراں اس وقت اٹھایا جب قوم تہی دست اور لیڈر شپ سے محروم ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۶ء کا زمانہ آنکھوں کے سامنے لائیے جب پورے بر عظیم میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک جگہ جگہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بکھری ہوئی تھیں جن کے درمیان کوئی باہمی ربط و ضبط، کوئی افہام و تفہیم، کوئی گفت و شنید نہیں تھی۔ ہر گھڑی اندیشہ تھا کہ یہ بکھری ہوئی ٹولیاں غنیم کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔ پھر یکایک جناح کی گرج سنائی دی اور انہوں نے کلکتہ میں کھڑے ہو کر وہ تاریخی الفاظ کہے جو ہماری قوم کی نہضت ثانیہ کی روداد ہیں آب زر سے لکھے جائیں گے۔ یعنی آج ہندوستان میں تین طاقتیں ہیں ایک برطانوی حکومت، دوسری انڈین نیشنل کانگریس اور تیسری طاقت کا نام ہے مسلمان۔ ہم نہ برطانوی حکومت کے کاسہ لیس بننے کو تیار ہیں اور نہ کانگریس کے خیمہ بردار، ہمارا اپنا قومی پروگرام اور پالیسی ہے۔"

آج نئی پود کے لوگوں کو کچھ اندازہ نہیں کہ ان تاریخی الفاظ نے کیا معجزہ کر دیا تھا جس طرح گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی چمک جائے تو دور دور تک راستہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح قائداعظم کی اس للکار سے تاریکیاں چھٹ گئیں۔ شک و شبہ کے بادل پھٹ گئے اور ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم جیتے جاگتے دس کروڑ انسانوں کی ایک زندہ قوم ہیں بھیڑوں کا گلہ نہیں کہ جدھر جس کا جی چاہے ہانک کر لے جائے۔

قائداعظم اس وقت یکہ و تنہا تھے جن کے پاس کوئی سیکرٹری بھی نہیں تھا۔ بیسیوں خطوط

روزانہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے پشاور سے راس کماری تک۔ پورے برعظیم کا انہوں نے دورہ کیا جگہ جگہ تقریریں کیں۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملے انہیں مسلم لیگ کا پروگرام بتایا جو نہیں مانتے تھے انہیں دلیل سے قائل کیا۔ اور جو جان بوجھ کر روڑے اٹکاتے تھے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ کہ زمانہ سب سے بڑا معلم ہے وہی ان کے بل نکال دے گا پھر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب حسن نیت اور حسن عمل کا اجر بارگاہ ربی سے عطا ہوا اور قائداعظم کی کوششوں کے شجر کو فتح و کامرانی کا ثمر لگا تو لوگ ان کی خاک پاک کو اپنی آنکھوں سے لگاتے تھے۔ جس راستے سے وہ گزرتے۔ ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لئے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔

قائداعظم نے اپنی زندگی میں جتنی کامیابی حاصل کی۔ وہ سراسر محنت کا نتیجہ تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے پاس صرف دو ہتھیار ہیں۔ ایک کا نام ہے دلیل اور دوسرے کا نام ہے محنت۔ وہ بڑے سے بڑے حریف کو صرف اس سے قائل کرنا جانتے تھے اور خود بھی کسی جانب کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے جب تک کہ تمام پہلوؤں پر غور کر کے اس کی صداقت کے قائل نہ ہو جاتے۔

آیئے آج ہم پھر اس بات کا عہد کریں کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قائداعظم کے نقش قدم پر چلیں گے اور جو راستہ وہ معین کر گئے ہیں اس سے انحراف نہیں کریں گے۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی زآفتاب
لعل گردو در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
قرنہا باید کہ تا یک کود کے از فیض طبع
عالمے دانا شود یا شاعرے شیریں سخن
دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود

بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

روزنامہ نوائے وقت لاہور

۱۰ ستمبر ۱۹۶۹ء

maablib.org

اردو ..... قائد اعظم اور تحریک پاکستان

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اردو دنیا کی چند اہم زبانوں میں سے ہے۔ اقوام متحدہ نے اس کو گنتی کی چند اہم زبانوں میں شمار کیا ہے۔ اس اہم بین الاقوامی ادارے کے فیصلے کے مطابق یہ زبان تیسرے چوتھے نمبر پر ہے۔ اور انگریزی' چینی اور روسی کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ یہ بر عظیم ہندو پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کی مادری زبان ہے اور جن کروڑوں انسانوں کی یہ مادری زبان نہیں ہے وہ اس کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور اس کو اس طرح بولتے ہیں اور اس سے اس طرح کاروبار حیات کو چلاتے ہیں جیسے یہ ان کی مادری زبان ہے۔ کروڑوں انسان ایسے ہیں جو اس کی ادبی اور تہذیبی و ثقافتی اہمیت کے قائل ہیں اور تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھ کر اس زبان کو اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں یہ بر عظیم ہندو پاکستان سے باہر بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان کئی زبانوں کے امتزاج سے بنی ہے' اور کئی تہذیبوں کا سنگم اس میں نظر آتا ہے۔ اس لئے ماہرین لسانیات اس زبان سے گہری دلچسپی لیتے ہیں اور مغربی ممالک میں اس زبان کے لسانی پہلوؤں پر ماضی میں بھی قابل قدر کام ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اس زبان کا ادب دنیا کی ادبی روایت میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے شاعری' ناول' افسانہ اور تنقید و تحقیق کے میدانوں میں جو ادبی کارنامے اس زبان نے انجام دیئے ہیں وہ انسانیت کی ادبی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ یہ زبان ہندو مسلم تہذیب کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوئی ہے اس میں علاقائی تہذیبوں کا عکس بھی ملتا ہے لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی چھاپ اس پر بڑی گہری ہے۔ اسی چھاپ نے اس کو مسلمانوں کی زبان بنا دیا ہے۔ یہ اسلامی رنگ و آہنگ اس زبان میں کسی کی شعوری کوشش سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کی جڑیں تو اس عظیم کی تاریخ میں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اس عظیم میں فاتح کی حیثیت سے

آئے اور انہوں نے سرزمین پر ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک حکومت کی۔ وہ سب کے سب مسلمان تھے اور اسلام کا درد ان میں سے ہر ایک کے دل میں موجود تھا۔ ان کے بادشاہ بقول اقبال خیرالامم کے تاجدار تھے' جو آج بھی اس برعظیم کی خاک میں محو خواب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں نے اس زبان میں اسلام کا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ چنانچہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ غیر مسلم تک جب اس زبان میں کوئی کتاب لکھتے تھے تو اس کا آغاز خدا اور رسولؐ کے پاک نام سے کرتے تھے۔ حمد و نعت کے بغیر اس زبان میں کسی ادبی کام کو شروع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر جو دینی ادب اس زبان میں پیدا ہوا ہے اور اسلامی فکر کے مختلف پہلوؤں پر جو عظیم کارنامے اس میں انجام دیئے گئے ہیں وہ فکر اسلامی کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھے جاتے رہیں گے اور ہمارے صوفیائے کرام نے انسانیت اور انسان دوستی کو بنیاد بنا کر جو کام اس زبان میں کیا ہے وہ ہماری تاریخ و تہذیب کی پیشانی پر ہمیشہ ہمیشہ جھومر بن کر جگ مگ جگ مگ کرتا رہے گا۔

ان خصوصیات سے مالا مال ہماری یہ اردو زبان ہمارے اس وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ اس لئے کہ یہ اسلامی رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔ اس لئے یہ برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ' تہذیب و ثقافت کی علم بردار اور آئینہ دار ہے۔ اس لئے کہ یہ اس سرزمین کے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان ہے' اور جن کی مادری زبان نہیں ہے وہ اس کو اپنی مادری زبان سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ قومی وحدت کی علامت ہے۔ اس لئے کہ وہ ملت اسلامیہ کی یک جہتی کی نشانی ہے۔ اس لئے کہ اس کی رگوں میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا لہو ہے۔ اس لئے کہ وہ اس فکر و خیال کی امین ہے جس پر اس وطن عزیز کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کی تحریک اور دو قومی نظریے کی تشکیل میں اس زبان

نے بڑا اہم کام کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ قیام پاکستان کی تحریک میں جن بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا' ان میں ایک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ بھی تھا۔ بر عظیم کی تاریخ شاہد ہے کہ برادران وطن کی تنگ نظری اور ماضی پرستی نے زبان کے مسئلے کو سیاسی مسئلہ بنا دیا اور اپنے رجعت پسندانہ اقوال و افعال سے تقریباً" ڈیڑھ دو سو سال تک اس کو روز بروز زیادہ سے زیادہ الجھاتے رہے۔ تنگ نظری معقولیت کا خون کس طرح کرتی ہے اس کا اندازہ رجعت پسندانہ ہندو ذہنیت کے اس رویے سے ہو سکتا ہے جو اس نے زبان کے معاملے میں اختیار کیا۔ ماضی سے دلچسپی لینا اور اس کو سینے سے لگانا ایسی کوئی بری بات نہیں لیکن اگر اس رویے سے آنکھوں پر پٹی باندھ لی جائے اور تہذیب و ثقافت کے ان دھاروں کا احساس بھی باقی نہ رہے جو تاریخ کے منبع سے پھوٹتے ہیں' تو ظاہر ہے کہ انسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے گا' اور وہ راستے اسے نظر نہیں آئیں گے جو ترقی اور ارتقاء کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہندوؤں کی تاریخ کا تقریباً" گزشتہ دو ڈھائی صدی کا زمانہ ایسا ہے جس میں وہ اسی صورتحال سے دوچار رہے ہیں۔ پراچین بھارت کو ایک دفعہ پھر زندہ کرنے کی خواہش ان کے دلوں میں مچلتی رہی ہے۔ پیچھے کی طرف لوٹ جانے کی آرزو ان کے ذہنوں میں انگڑائیاں لیتی رہی ہے۔ ہندو ذہنیت تھی تو ہمیشہ سے ایسی لیکن مسلمانوں کے دور اقتدار میں کچھ دبی دبی سی رہی۔ مسلمانوں کو ملیچھ سمجھ کر ان سے علیحدگی اختیار کرنا ہندوؤں کے ایک بہت بڑے طبقے کے لئے دھرم ایمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار بر عظیم کی تاریخ میں برابر ہوتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب مسلمان انگریزوں کے مقابلے میں سپرانداز ہو گئے تو اس ہندو ذہنیت نے ایسے ایسے گل کھلائے کہ عقل اس پر آج بھی انگشت بدنداں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض سمجھدار اور ترقی پسند ہندوؤں نے اس رجعت پسندی کی مخالفت کی

لیکن رجعت کا یہ طوفان اتنا شدید تھا کہ ترقی پسندی اس میں خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلی۔

اس صورتحال نے زبان کے مسئلے کو بے حد پیچیدہ بنا دیا۔ آریہ سماج، شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت آمیز ہندی کو عام کرنے کی کوشش کی گئی جس کا مقصد اردو کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنا تھا۔ کیونکہ اس زبان پر اسلام کی چھاپ گہری تھی اور وہ ایک ایسی زبان تھی جو ترقی کرنے میں پیش پیش تھی۔ ہندو مسلمان سب اس کے دلدادہ تھے لیکن رجعت پسندوں کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ترقی کو روکنے کے لئے اور ایک مصنوعی زبان کو عام کرنے کے لئے مذہبی عصبیت کو ہوا دی گئی اور اس کام کے لئے ہندو خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی آنکھوں نے اس سلسلے میں عجیب عجیب تماشوں کو دیکھا۔ سیاست اس سے متاثر ہوئی اور مسلمانوں نے بھی علیحدگی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ خصوصاً اس وقت جب ان کی آنکھوں نے یہ دیکھا کہ سرتیج بہادر سپرو، پنڈت سندر لال اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کوششیں بھی تمام تر ناکام ہوتی جا رہی ہیں۔

سب سے پہلے انیسویں صدی میں سر سید احمد خان نے اس رجعت پسندانہ ہندو ذہنیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اس داستان کو اردو کے سب سے بڑے مجاہد بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی زبان سنئے۔

اس برعظیم کے مسلمانوں کی تمام تحریکوں یعنی علمی، ادبی اور سیاسی کا سرچشمہ سر سید احمد خان کی ذات تھی یوں تو مسلمانوں کا انحطاط و زوال پہلے سے شروع ہو گیا تھا مگر اس کا احساس عام طور پر نہیں ہوا تھا۔ لیکن گزشتہ صدی کے نصف کے چند سال بعد جب ہندوستان کی حکومت میں انقلاب پیدا ہوا تو مسلمان ہی سب سے زیادہ کچلے گئے۔ ایک طرف آقایان ملک کی نظر میں معتوب، مردود اور باغی ٹھہرے اور دوسری طرف برادران وطن نے نئی نئی قوت

اور آزادی کے زعم میں اور کچھ آقاؤں کی شہہ پا کر انہیں ذلیل و برباد کرنا شروع کیا۔ فاتح کے ہاتھوں مفتوح پر اتنا ظلم نہیں ہوتا جتنا قوت پانے کے بعد مفتوح کے ہاتھوں فاتح پر ہوتا ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا ہندوستان میں ہوا۔ وہ دونوں طرف سے راندہ تھے اور چکی کے دو پاٹوں میں پسے اور دبے جا رہے تھے۔ اس سے دل بجھ گئے تھے اور مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دو بڑی قوتوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اور یہ سمجھ چکے تھے کہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں مولوی سید احمد خان نے غیر معمولی دور اندیشی اور ہمت سے کام لے کر وہ کام کیا جو کسی اور سے نہ ہو سکا اور جس کی کسی کو توقع نہ تھی اور تمام مخالفتوں، مزاحمتوں اور مشکلات کو سر کر کے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے تکمیل تک پہنچا کے رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے باہمت جوان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں۔ اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کرتے ہیں۔ سرسید بھی انہیں برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے۔ ان کے بعد بھی جتنی اصلاحات، تعمیرات اور منصوبے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں آئے، جب ہم ان کی ابتدا کا سراغ ڈھونڈتے ہیں تو اسے سرسید احمد خان کی مساعی میں پاتے ہیں۔" (خطبات عبدالحق صفحہ ۴۹۹)

یہ سرسید ہی تھے جنہوں نے برعظیم کے مسلمانوں کی زبوں حالی کو محسوس کیا اور زبان کے مسئلے کو اہمیت دی کیونکہ یہ مسئلہ مسلمانوں کی تہذیب کی بنیاد تھا۔ انہوں نے اردو کی حمایت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو مسلمانوں کی تہذیب کی بنیاد ہے اور اگر اس زبان پر آنچ آئی تو مسلمان اس کو کسی حال میں بھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ جان کی بازی لگا دیں گے اور ہندوؤں کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ وہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے واضح طور پر علی گڑھ کی تعلیمی سروے کی رپورٹ میں لکھا۔

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو

ہو یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں۔ مگر جب میرے ہندو صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جس مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اس سے ہوئی۔"

اس طرح دو قومی نظریے کا تصور سب سے پہلے سرسید احمد خان نے پیش کیا اور اس کا آغاز زبان کے مسئلے سے ہوا۔ اردو زبان کے بارنے میں ہندوؤں کا رویہ معاندانہ نہ ہوتا تو شاید سرسید اتنی شدت سے اس کا اظہار نہ کرتے۔ اس طرح دیکھا جائے تو دو قومی نظریے کو پیش کرنے میں سرسید کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لئے تاریخی اور تہذیبی شعور کی ضرورت ہے۔ جو آج کل ہمارے ہاں عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ سرسید کی اہمیت کو پہچاننا اور ہماری تاریخ میں جو کارنامہ انہوں نے اس تہذیبی اور لسانی اعتبار سے انجام دیا ہے اس کا اندازہ لگانا ہر پاکستانی کے لئے ضروری ہے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

"اردو نے ہر قومی تحریک اور خاص کر پاکستان کے بنانے میں بڑی مدد کی ہے۔ بلکہ یہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی ابتدا ہی اردو تحریک سے شروع ہوئی ہے یہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ تقسیم ملک کی بنیاد اس نظریے پر تھی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ یہ نظریہ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کسی سیاسی اختلاف کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ یہ اس وقت وقوع میں آیا جب ہندوؤں کی طرف سے اردو کی مخالفت شروع ہوئی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انڈین نیشنل کانگریس کا وجود بھی نہ تھا۔ یعنی کانگریس کے قیام سے ۱۸ سال قبل ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے سرکاری دفتروں اور مدارس سے

اردو کے خارج کرنے کی مہم شروع کی۔ سرسید نے اس کا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ اس سے قبل وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور اس وقت تک انہوں نے جتنے کام کئے تھے، وہ عام ہندوستانیوں کے بھلائی کے تھے جن میں ہندو مسلمان کی مطلق کوئی تفریق نہ تھی۔ سرسید فرماتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو مل کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوششیں کرنا محال ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ اردو کے مسئلے نے دو قومی نظریے کی ابتدا کی جو آگے چل کر قیام پاکستان کی تحریک کی بنیاد بنا۔ جس زمانے میں قیام پاکستان کی تحریک چل رہی تھی اس زمانے میں تو اس مسئلے نے بڑی ہی پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ ٹنڈن اور سمپور نانند، جیسے ہندی کے حامی تو درکنار، اس نے تو گاندھی جی تک کو بے نقاب کر دیا اور وہ یہ بات تک کہنے کے لئے مجبور ہو گئے کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے اور اس کو مسلمان بادشاہوں نے پھیلایا ہے اور اب مسلمان ہی اس کو بولتے اور اس سے اپنا کام چلاتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اس صورتحال کی تصویر خاصے ڈرامائی انداز میں کھینچی ہے۔ انجمن ترقی اردو کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس ضمن میں اس واقعے کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جس نے انجمن کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے۔ ۱۹۳۰ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (جو اب بے غذا کے غذائی وزیر ہیں) مجھ سے حیدر آباد آکر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائے۔ چونکہ یہ ادبی

معاملہ تھا میں نے منظور کرلیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ **ساھیتہ پریشد**" تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ **پریشد** کی زبان کیا ہونی چاہئے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا "ہندوستانی۔" گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ ریزولیشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور پر یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا رہا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور ایک نیا نام تجویز کیا کہ یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے' بول چال میں نہیں۔ پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ تو فرمایا جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی؟ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہوجائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر انہوں نے جھنجھلا کر کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر انہوں نے ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندی اردو کے مسئلے نے کیا صورت اختیار کرلی تھی۔ خاصا تلخ ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

پاکستان کی تحریک زور پر تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے یہ محاذ سنبھال لیا

تھا۔ قائداعظم کی پشت پناہی انہیں حاصل تھی۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کے لئے جو جنگ قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ لڑ رہی تھی، وہ لسانی اور تہذیبی سطح پر انجمن ترقی اردو اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق لڑ رہے تھے۔ اس کی تفصیل انجمن کے رسالے "اردو" اور اخبار "ہماری زبان" کی فائلوں میں محفوظ ہے۔

میں نے اس لسانی جھگڑے کا ذکر ذرا تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ وہ تاریخی اور تہذیبی پس منظر ایک دفعہ پھر ہمارے سامنے آسکے جو تحریک پاکستان میں بہت نمایاں تھا اور جس نے ہماری قومی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے اور ہماری قوم کو تعمیر وطن کے ایک نئے راستے پر گامزن کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

یہ جھگڑا اپنے شباب پر تھا۔ جب ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے شہر لاہور میں قیام پاکستان کی قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی، اور اس کے بعد قیام پاکستان کی جدوجہد روز بروز تیز سے تر ہوتی گئی اردو کی تحریک کا اس میں خاصا ہاتھ تھا۔

قائداعظم اس زمانے میں برعظیم کے مسلمانوں کے متفقہ لیڈر تھے۔ ان کی عظیم قیادت پر مسلمانوں کو مکمل اعتماد تھا۔ اور وہ مسلمانوں کے اس قافلے کو منزل سے ہمکنار کرنے کے لئے ان تھک جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اسی کام کے لئے وقف کر دی تھیں۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں اتنی مقبولیت کسی اور رہنما کو حاصل نہ ہو سکی جیسی کہ قائداعظم کو حاصل ہوئی قائداعظم کی سیاسی بصیرت مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک قوم کی تعمیر و تشکیل کر رہے تھے۔ انہیں اس کے لئے ایک وطن بنانا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک قوم کو قوم بنانے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ قوم کے لئے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسی زبان ہے جس کو قومی زبان کہا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے تعمیری کام کیا۔ اردو کی تحریک کو ان کی پوری حمایت

حاصل تھی، اور وہ ان کے سیاسی پروگرام کا ایک اہم حصہ تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ ان کا رابطہ بہت گہرا تھا اس سے پوری طرح اتفاق تھا۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ پاکستانی قوم کی تعمیر و تشکیل کا کام اس وقت تک انجام نہیں پاسکتا جب تک اس کے پاس قومی زبان موجود نہ ہو، اور یہ زبان ان کے خیال میں صرف اردو زبان تھی۔

یہی سبب ہے کہ قائداعظم نے تحریک پاکستان کے زمانے میں خود اردو سیکھی۔ ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ وہ انگریزی پر پوری قدرت رکھتے تھے اور ان کا کام بڑی آسانی سے اس زبان میں چل سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے باقاعدہ کے ساتھ اردو کو اپنے کام میں استعمال کیا۔ ۱۹۴۶ء تک انہیں اردو بولنے کی ایسی مشق ہو گئی تھی کہ وہ اعتماد کے ساتھ اس زبان میں تقریر کر سکتے تھے۔ میں نے خود اس زمانے میں اردو بازار جامع مسجد دہلی کے ایک جلسہ عام میں ان کی تقریر اردو میں سنی ہے جب کیبنٹ مشن آیا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے تقریباً پینتالیس منٹ تک پوری تقریر اردو میں کی تھی، اور اس تقریر میں ان کی خطابت کا وہی انداز تھا جس کے لئے ان کی انگریزی تقریریں مشہور ہیں۔

قائداعظم کی اردو زبان سے اس دلچسپی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ قیام پاکستان کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کے ہر گھر میں اردو کا چرچا تھا۔ برعظیم کے ہر علاقے کے مسلمان اس کو اپنی زبان سمجھتے تھے اور اس کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ جگہ جگہ اردو کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں اردو کو پھیلانے اور عام کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے جن علاقوں میں اردو پر ستم ڈھائے جا رہے تھے وہاں اردو تحریک کا اثر سب سے زیادہ تھا۔ سی پی کے صوبے کو اس اعتبار سے منفرد حیثیت حاصل تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی سات آٹھ فیصد آبادی کے اس صوبے کے دارالحکومت کو مولوی عبدالحق صاحب ناگپور کی بجائے جاگ پور کہا کرتے تھے پنجاب، سندھ اور سرحد کے صوبوں کا یہ حال تھا کہ مردم

شماری کے موقع پر مسلمانوں نے اپنی مادری زبان' پنجابی' سندھی اور پشتو کے بجائے اردو لکھوائی تھی۔

اور علامہ اقبال نے اردو تحریک کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب کو کئی خط لکھے تھے اور ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"اس اہم معاملے میں (یعنی اردو تحریک) میں کلیتہ آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بہ حیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا' تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

(اقبال اور عبدالحق ص ۴۳)

"آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سرسید رحمتہ اللہ علیہ نے کی تھی۔"

(اقبال اور عبدالحق ص ۴۷)

"اردو کی اشاعت اور ترقی کے لئے آپ کا دلی میں نقل مکانی کرنا بہت ضروری ہے۔ معلوم نہیں آپ کے حالات ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔"

(اقبال اور عبدالحق ص ۴۷)

"میں نے سنا ہے کہ (مسلم) لیگ کی طرف سے آپ کو بھی لکھنؤ آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ براہ عنایت اس سفر کی زحمت ضرور گوارا فرمایئے۔ اردو کے متعلق اگر لیگ کے کھلے سیشن میں کوئی مناسب قرارداد منظور ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا اثر بہت اچھا ہو گا۔

(اقبال اور عبدالحق ص ۱۰)

اردو زبان کے تحفظ کے لئے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں ان کے لئے مسلمانوں کی آئندہ

نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔

(اقبال اور عبدالحق ص ۵۰)

علامہ نے ان جملوں میں یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ اردو اور اس کی تحریک سے انہی دلی وابستگی تھی۔ اور وہ اس زبان کو مسلمانوں کی زندگی میں قومی اعتبار سے ایک اہم کام انجام دیتے ہوئے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ لکھ کر نہ صرف اپنے جذبات و احساسات کو واضح کیا ہے بلکہ تمام اسلامیان ہند کے واردات قلبی و ذہنی اور قلب و جگر کا ترجمان اور عکاس ہوا کرتا تھا۔

یہ صورت حال تھی کہ ۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ابھر کر سامنے آئی۔ جو خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا اس کو قائداعظم کی سیاسی بصیرت نے حقیقت بنا دیا۔ اب برعظیم کے مسلمان ایک ملک کے مالک تھے۔ اس کے آزاد شہری تھے۔ جہاں وہ اپنی زبان اردو اور اپنی تہذیب کی حفاظت کر سکتے تھے۔ اب انہیں یہ خطرہ نہیں تھا کہ ان کی تہذیب اور زبان کو ختم کردیا جائے گا یا اس کی صورت مسخ کردی جائے گی۔

قائداعظم نے اپنی سیاسی بصیرت اور عوام کے تعاون سے قوم کے لئے جس مملکت کی تعمیر کی تھی اس کے تقاضوں کا انہیں پوری طرح احساس تھا۔ وہ اس بات کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے کہ یہ ایک قوم ہے جس کے لئے یہ وطن حاصل کیا گیا ہے۔ ایک زبان اس کی بنیادی ضرورت ہے جو اب بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک رشتے میں منسلک کر سکے اور جوان کے لئے وحدت یکجہتی اور یگانگت کی بنیاد بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے واضح طور پر ایک بار نہیں کئی بار یہ اعلان کیا کہ اس نئی مملکت پاکستان کی قومی زبان، اردو اور صرف اردو ہوگی اور ان کا یہ فیصلہ نہایت دانش مندانہ اور حقیقت پسندانہ فیصلہ تھا۔

لیکن پاکستان جس وقت سے وجود میں آیا اسی وقت سے بعض نادان اور جاہل لوگوں کے ہاتھوں براہ راست یا بالواسطہ اس کی مخالفت بھی ہوتی رہی۔ بعض دشمنان پاکستان کی چالوں کو نہ سمجھ سکے اور سطحی باتوں میں الجھ کر ایسی باتیں بھی کرنے لگے جو قومی زندگی کے لئے سم قاتل تھی۔ چنانچہ بنگال میں جو کچھ ہوا وہ نادانی' جہالت اور غداری کی ایک نہایت ہی المناک داستان ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ یہ ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

اس رویے سے ہمارے وطن عزیز میں جو تاریکی پھیلی اس میں قائداعظم کے خیالات زریں ہمارے لئے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں قومی زبان کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ یہ تھی۔

"میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی' اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ صریحاً" پاکستان کا دشمن ہے۔"

ان کی زندگی میں کسی کی جرات تھی کہ ذرا بھی چوں کرتا۔ سب نے اس کو تسلیم کیا' لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان کا سایہ ہمارے سر سے جلد اٹھ گیا' لیکن جن خیالات کی قندیلیں انہوں نے روشن کی تھیں وہ برابر روشن رہیں۔ قائد ملت لیاقت علی خان' خواجہ ناظم الدین فضل الرحمان اور سردار عبدالرب نشتر وغیرہ باوجود سیاسی مخالفت کے اردو کو قومی زبان بنانے کی حمایت کرتے رہے' لیکن سیاست وقت کے ساتھ ساتھ بگڑتی گئی۔ اس میں ہمارے بیرونی اور اندرونی دونوں دشمنوں کا ہاتھ تھا' مستقبل کا مورخ جب اس کی تفصیل لکھے گا تو اس کو سن کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کریں گے۔

اس صورتحال نے ہماری قوم کو مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر بھی مجبور کیا۔ چنانچہ اس

ملک کی دو قومی زبانیں قرار دے دی گئیں' ایک اردو دوسری بنگالی۔ اس سے جو نقصان ہماری قومی زندگی کو پہنچا اس کی تفصیل اندوہناک ہے۔ اس لئے میں اس کا ذکر یہاں کرنا نہیں چاہتا۔

وہ تو کہئے کہ اس سارے المیہ کے بعد ہماری بساط سیاست پر ایک ایسا شخص نمودار ہوا۔ جس نے اپنی ذہانت' دانائی اور بصیرت سے جگر لخت لخت کو جمع کرنے کی کوشش کی اور ہم جو سب کچھ کھو کر غیر یقینی کیفیت کے عالم میں پابہ زنجیر تھے' اس شخص نے ہمیں روشنی کی کرن دکھائی۔ ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ اور قوم کی تعمیر نو کے لئے ایسے اقدامات کئے جن کو تاریخ ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھے گی۔ اس نے ایک منتشر قوم کی شیرازہ بندی کی۔ اس کے پاس آئین نہیں تھا اس نے ایک باقاعدہ آئین دیا۔ اسمبلیاں بنائیں وزارتیں قائم کیں اور اس طرح ایک جمہوری نظام قائم کرکے ہماری قوم میں ایک استواری پیدا کی۔ ورنہ ہم تو بین الاقوامی سازشوں کے ہاتھوں ختم ہو چکے تھے۔

پاکستان کے اس نئے آئین میں واضح طور پر اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا اور پہلے دن ہی سے اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ خود بھٹو صاحب نے اور ان کے دوسرے وزیروں نے حلف تک اس قومی زبان اردو میں اٹھایا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اردو میں وہ مہارت پیدا کی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ بھٹو صاحب نے جتنی تقریریں اردو میں کی ہیں اتنی ہمارے کسی سیاسی رہنما نے نہیں کی ہوں گی اور گزشتہ چند سال میں تو اردو بولنے میں جو کمال انہوں نے حاصل کیا ہے وہ اس زبان کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی اور لگن کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اب اردو صحیح معنوں میں قانونی اور آئینی طور پر پاکستان کی قومی زبان ہے اور اس اعتبار سے اس کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ہے۔ کیونکہ موجودہ حکومت نے قومی سطح پر بعض

اعلانات کر کے اور کچھ اصلاحات نافذ کر کے کم از کم اصولی طور پر ان جھگڑوں، بحثوں اور سازشوں کا بڑی حد تک سدباب کر دیا ہے جو ہماری قومی زندگی کے لئے برسوں سے ایک عذاب بنے ہوئے تھے۔ نئی تعلیمی پالیسی کو جس طرح عملی صورت دی جا رہی ہے اس کے اثرات مجموعی طور پر ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کے لئے یقیناً" خوشگوار ہوں گے، اور بلاشبہ قومی زبان بھی اس سے متاثر ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں انگریزی کے اثرات بہت گہرے ہیں اور یہ اثرات بڑی حد تک قومی زبان کی ترقی میں حائل ہوئے ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ آج بھی حائل ہو رہے ہیں۔ دفتر اور عدالتوں کی اونچی سطح پر بیشتر کام انگریزی میں ہو رہا ہے۔ البتہ نچلی سطح پر قومی زبان اردو استعمال کی جا رہی ہے۔ نظام تعلیم میں بھی، جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے، ابھی تک انگریزی سے کام لیا جا رہا ہے، لیکن نچلی سطح پر بلکہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک اب انگریزی کی جگہ اردو نے لے لی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے ایم اے کی سطح تک امتحان کے جواب اردو میں لکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انگریزی کے اثرات ابھی تک خاصے گہرے ہیں اور ان اثرات کے کم ہونے کی بظاہر ابھی کوئی توقع نہیں۔

بات یہ ہے کہ انگریزی ڈیڑھ دو سال سے ہمارے سروں پر مسلط ہے اور مجموعی طور پر ذہنی اعتبار سے ہماری قوم انگریزی کے رنگ میں اس طرح رنگ چکی ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان نہیں۔ جہاں لوگوں کی تعلیم ابتدا ہی سے انگریزی ماحول میں ہوئی ہو جہاں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے انگریزی سے سابقہ ہو، جہاں ہر وقت انگریزی الفاظ اور انگریزی فقرے کانوں میں پڑتے ہوں، جہاں انگریزی اخبار، انگریزی رسالے، انگریزی کتابیں پڑھنا نہ صرف ضرورت ہو بلکہ فیشن میں داخل ہو گیا ہو۔ جہاں انگریزی لہجے میں اردو بولنے کو معیار سمجھا جاتا ہو، وہاں انگریزی سے چھٹکارا اتنا آسان نہیں جتنا کہ اردو کے بعض نادان دوست خیال

کرتے ہیں۔

تاریخ کا ہاتھ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اس کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہماری تاریخ نے جو اثرات ہم پر چھوڑے ہیں۔ ان کو ایک مستقل منصوبہ بندی ہی زائل کر سکتی ہے۔ اس کے لئے نظام تعلیم میں عملی طور پر بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ افسوس ہے کہ قومی زندگی کے گزشتہ تیس برسوں میں ہم اس سے محروم رہے ہیں۔ ہم سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ آزادی کے بعد بھی ہم اس نظام تعلیم کے ساتھ چمٹے رہے' سوڈیڑھ سو سال قبل میکالے نے جس کی منصوبہ بندی کی تھی اور جس کا مقصد انگریزوں کی حکومت کو چلانے کے لئے ایسے پڑھے لکھے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی جو انگریزی زبان' انگریزی تہذیب اور انگریزی طرز معاشرت کو افضل اور برتر سمجھتے ہوں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی میں بھی ہمیں اس کا احساس نہیں ہوا۔ ہم اس پر افسوس کریں یا شرم سے اپنی گردنیں جھکالیں کہ مغربی طرز کے اسکول اب بھی ہمارے ہاں باقی ہیں جن کو عیسائی مشنری چلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو ہماری تعلیم سے زیادہ اپنے مشن کو کامیاب بنانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ اسکول ابھی تک قومی تحویل میں بھی نہیں لئے گئے ہیں۔ ان اسکولوں کے چلانے والے ہم سے فیسوں اور جرمانوں کی صورت میں بھاری رقم وصول کرتے ہیں اور ہمارے بچوں کی شخصیت اور کردار پر مغربی رنگ کا ملمع چڑھا دیتے ہیں۔ اس کے نقوش ان پر اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ زندگی بھر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں طبقاتی تفریق کا احساس زیادہ نمایاں ہوتا ہے جس کو ختم کئے بغیر کوئی معاشرہ مثبت قومی کردار کو پیدا نہیں کر سکتا۔

اردو کے بعض نادان دوست اس صورتحال کو سمجھے بغیر یہ نعرے لگاتے ہیں کہ انگریزی کو ختم ہونا چاہئے۔ دفتروں سے اس کو یک قلم خارج کر دو۔ انگریزی مت بولو۔ کاروبار میں

انگریزی استعمال نہ کرو۔ بورڈ انگریزی میں نہ لگاؤ' وغیرہ وغیرہ' لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ اور سوائے اپنے لئے وقتی اور سستی شہرت کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

انگریزی یقیناً" ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے' لیکن اس زبان سے جذباتی طور پر نفرت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو تن آسان بنادیں' اور ان کی ذہنی کیفیت یہ ہوجائے کہ اب انہیں انگریزی جاننے' انگریزی پڑھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے اردو کو تو ظاہر ہے کہ وہ گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں' اس لئے اس میں مہارت حاصل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بیشتر نوجوان آج کل اسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ نہ انہیں انگریزی آتی ہے نہ اردو۔ ایسے لوگوں کی کیفیت تو یہ ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

نادانی ہوگی اگر ہم اس حقیقت کو فراموش کردیں گے کہ انگریزی اب ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ اور بین الاقوامی سطح پر کاروبار کو چلانے' اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور سائنسی و علمی تحقیق سے استفادہ کرنے کے لئے اس زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس معاملے میں تعصب برتنا ہماری قومی زندگی کے لئے بے حد مضر ہو سکتا ہے' زبانوں کے ساتھ تعصب برتنا مہذب قوموں کا شیوہ نہیں۔ البتہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو محسوس کرنا' اس کو علمی اعتبار سے مالا مال کرنا معراج کمال پر پہنچانا دفتروں میں رائج کرنا اور ذریعہ تعلیم بنانا افراد کا فرض اولین ہے اور اس کے لئے ایک متوازن ذہن' ایک جذب صادق اور ایک مثبت زاویہ نظر کی ضرورت ہے۔ کاش یہ متوازن ذہن یہ جذب صادق اور یہ مثبت زاویہ نظر ہماری قوم کے افراد میں موجود ہوتا۔

متوازن ذہن، جذب صادق اور مثبت زاویہ نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہماری کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ہم خود تو نہ کچھ کرتے ہیں نہ سوچتے ہیں، حکومتوں کو الزام دیتے ہیں، اپنے رہنماؤں کی پگڑیاں اچھالتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی زندگی کو انتشار سے دوچار کرتے ہیں۔ برسوں سے ہمارے ہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری قومی تاریخ میں ایسے دور بھی آئے ہیں جب ہم تعمیر تو درکنار حسرت تعمیر تک سے محروم رہے ہیں۔ قائداعظم سے لے کر قائد عوام تک اپنی قومی زندگی کے نشیب و فراز کی جو تصویر میں نے کھینچی ہے، اس کو سامنے رکھا جائے تو یہ اندازہ ہو گا کہ ہمارے تمام معقول رہنماؤں نے اپنی اپنی جگہ قومی تعمیر میں حصہ لیا۔ کبھی کبھی سیاسی پیچیدگیاں اور دشمنان پاکستان کی سازشوں کے باعث وہ مصلحت اندیشی سے کام لینے کے لئے ضرور مجبور ہوئے لیکن قوم کے ساتھ ان میں سے کسی نے جان کر دشمنی نہیں کی۔ کسی نے اس کی پیٹھ میں چھرا نہیں بھونکا۔ خصوصیت کے ساتھ قومی زبان کو رائج کرنے اور اس کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے کے سلسلے میں، میری ناچیز رائے میں سب کے پاس جذب صادق تھا اور سب اس جذبے سے سرشار تھے کہ پاکستان کو ایک عظیم قوم اور اس کی قومی زبان کو ایک عظیم زبان ہونا چاہئے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کام قیام پاکستان کے بعد اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے ہوا ہے وہ نہ ہوتا۔ بے شمار ادارے بنے اور ہماری حکومتوں نے ان سب کی سرپرستی کی۔ کراچی میں انجمن ترقی اردو میں از سر نو جان ڈالی گئی، اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو عزت اور احترام کے ساتھ اردو کی ترقی کا کام کرنے کے لئے سہولتیں فراہم کی گئیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں اردو کی علمی اور ادبی کتابیں انجمن نے شائع کیں۔ کراچی یونیورسٹی میں ادارہ تالیف و ترجمہ کا قیام عمل میں آیا جس نے سائنس کی ہزارہا اصطلاحات بنا کر شائع کر دیں۔ ترقی اردو بورڈ کی داغ بیل ڈالی گئی جس نے اردو کی عظیم لغت تیار کرنے اور اس کو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اردو

کی نادر و نایاب کتابیں بھی شائع کیں۔ لاہور میں پنجاب کی صوبائی حکومت نے مجلس زبان دفتری قائم کی جس نے دفتری اصطلاحات کو بنانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور یہ اصطلاحات کئی صورتوں میں شائع ہوئیں اور اب حکومت پنجاب نے ان اصطلاحات کو ایک باقاعدہ لغت کی صورت میں شائع کر دیا ہے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اس کی جلدیں فراہم کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت پنجاب نے مجلس ترقی ادب بھی قائم کی جس نے اردو ادب کی بے شمار نادر و نایاب کتابیں شائع کیں اور تقریباً" تمام کلاسیکی ادب کو محفوظ کر دیا۔ وفاقی حکومت پاکستان نے لاہور میں ایک مرکزی ترقی اردو بورڈ قائم کیا' جس نے مختلف علمی لسانی ادبی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کا عظیم منصوبہ بنایا اور ضخیم کتابیں شائع کر کے اردو کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج نے بھی وفاقی حکومت پاکستان اور حکومت پنجاب کی امداد سے اردو کی اشاعت کے عظیم منصوبے بنائے۔ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلوپیڈیا) کا کام گزشتہ پچیس سال سے جاری ہے اور خاصی تعداد میں ضخیم جلدیں تاریخ اور تہذیب پر شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی اٹھارہ جلدیں یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ ادبیات کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ یونیورسٹی کی مجلس یادگار غالب نے غالب کی تمام تصانیف کو نہایت اہتمام سے شائع کر دیا ہے اور اورینٹل کالج سے عربی' فارسی' اردو اور اسلامیات کے موضوع پر تقریباً" سو نادر و نایاب ضخیم کتابیں شائع کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمہ کا کام بھی قابل قدر ہے جس نے سائنسی اصطلاحات اور سائنس کی دوسری کتابوں کو شائع کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی اکیڈمی' اکیڈمی پنجاب' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' ادارہ ثقافت اسلامیہ' بزم اقبال اور اقبال اکیڈمی نے بھی بے شمار کتابیں شائع کر کے اردو کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ پشاور' کوئٹہ اور حیدر آباد میں پشتو اکیڈمی' سندھی ادبی بورڈ بلوچی

اکیڈمی نے بھی جو کام کیا ہے اس میں بھی اردو کا خاصا حصہ ہے۔

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ان اداروں کو وفاقی حکومت پاکستان اور صوبائی حکومتوں نے کتنی امداد دی ہوگی جس کی بدولت یہ علمی ادبی کارنامے انجام پائے۔ صحیح اعداد و شمار میرے پاس اس وقت نہیں ہیں لیکن وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی گرانٹ ان تمام علمی اداروں کو حکومت نے گزشتہ پچیس سال میں دی ہوگی۔ کیا یہ رقم آپ کے خیال میں قومی زبان اردو کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے کے لئے نہیں دی گئی؟

یہ احسان فراموشی ہوگی اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے کہ پاکستان کی مختلف حکومتوں نے قومی زبان کو فروغ دینے کے لئے کام نہیں کیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہر اعتبار سے حکومت نے اس زبان کو سہارا دیا۔ اور اس کو علمی زبان بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور آج ہم فخر کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اردو اپنے علمی ادبی سرمائے کی وجہ سے ایک عظیم زبان ہے اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن سے کسی ملک کی قومی زبان پہچانی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں اس زبان اور اس کے ادب کی اتنی دھوم نہ ہوتی، مختلف ممالک کی اہم یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہوتا اور اقوام متحدہ بین الاقوامی سطح پر اس کو گنتی کی چند زبانوں میں شمار نہ کرتی۔

افسوس ہے تو اس بات کا کہ قومی زبان کی حیثیت سے جو تقاضے ہم سے کئے گئے تھے وہ ہم نے پورے نہیں کئے۔ ہم میں سے کتنے لوگوں نے قومی زبان سے وہ دلچسپی لی جو زندہ قوم کے افراد کو اپنی زبان سے لینی چاہئے۔ کتنے لوگوں نے اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا اظہار کیا؟ کتنے خاندانوں نے اردو کی کتابیں خرید کر اپنے اپنے گھروں میں اردو پڑھنے کا ماحول پیدا کیا؟ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اردو کے اشاعتی اداروں، ناشروں، تاجروں، ادیبوں، شاعروں اور علمی کام کرنے والوں کی اپنے فکر و عمل سے ہمت افزائی کی؟

ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں گے تو یقیناً" ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی اور یہ احساس ہمارے دل میں کچوکے سے لگائے گا کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جو کچھ ہمیں اپنی قومی زبان کے لئے کرنا چاہئے تھا وہ ہم نے نہیں کیا۔ ہم نے شور زیادہ مچایا' طعنہ زنی زیادہ کی' غم زیادہ کھایا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ یا پھر دولت کمانا اور اس سے اپنی تجوریوں کو بھرنا شروع کر دیا اور بالآخر خود پرستی اور خود نمائی' خود غرضی اور خود ستائی تنگ نظری اور تعصب' مادہ پرستی اور مادیت کے سمندروں میں ایسے ڈوبے کہ دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود اپنی بھی خبر نہ رہی۔

اس صورت حال نے وطن کی محبت کو خاک میں ملا دیا قومی شعور کو ملیامیٹ کر دیا۔ افراد یا تو خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آئے یا پھر انہوں نے مطالبات کو اپنا شعار بنا لیا۔ اجتماعات' کانفرنسیں' جلسے جلوس صرف اس مقصد سے ترتیب دیئے جانے لگے کہ حکومت سے کچھ حاصل ہو جائے۔ ان عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ قومی زندگی میں تمام کام حکومتیں نہیں کرتیں' افراد کو بھی ان کاموں میں شریک ہونا پڑتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جس وقت تک افراد میں قومی شعور بیدار نہ ہو اور وہ قومی تعمیر میں مثبت زاویہ نظر کو اپنا شعار نہ بنا لیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ ہماری قومی زندگی کا المیہ ہے کہ ہم نے قومی زبان کے معاملے میں اس مثبت رویے کو اپنا شعار نہیں بنایا' اس کی قومی اہمیت کو محسوس نہیں کیا' اس سے خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اس خیال میں مگن بیٹھے رہے کہ ان مسائل کو حل کرنا صرف حکومت کی ذمہ داری ہے' یا پھر یہ سوچتے رہے کہ وہ کسی غیبی مدد یا جادو کے زور سے حل ہو جائیں گے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

میر صاحب کا پہلودار اور معنویت سے بھرپور شعر مجھے یاد آتا ہے کیا خوب کہا ہے۔

اس بزم خوش کے محرم ناآشنا ہیں سارے
کس سے کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

اورینٹل کالج میگزین لاہور (قائداعظم نمبر)

جناح اقبال اور تصور پاکستان

عبدالحمید کمالی

اس عنوان کے انتخاب کے معاملے میں تین باتوں نے میرے لئے مہمیز کا کام کیا۔ ان میں سب سے اہم تاریخ کا یہ لطیفہ غیبی ہے کہ لالہ لاجپت رائے کا سی آر داس کے نام ایک خط دیکھتے دیکھتے ہمارے ملی و مذہبی شعور کا سرچشمہ بن گیا۔ دوسری اہم بات قائداعظم جناح کی پاکستان مجلس دستور ساز میں صدارتی تقریر ہے جو اس قسم کے مذہبی شعور سے بالکل مبرا ہے۔ تیسری اہم بات ایک بڑا التباس ہے جس کے ذریعہ اقبال کو وطن ناآشنا قومیت کا امام قرار دیا گیا۔ ایک چوتھی بات بھی ہے، وہ یہ کہ ہر قوم کے چند اساطیر ہوتے ہیں جن میں اس کی صنمیات کی داستان ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ کہاوتوں کا روپ دھار لیا کرتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسی کہاوتوں کا رواج ہو گیا ہے۔ گو تخلیق پاکستان کے بارے میں ان سے گمراہ کن تاثر پیدا ہوتا ہے مگر یہی ہماری ملی یادداشت کا جزو بنتی جاتی ہیں۔

لاجپت رائے کا وہ مشہور خط جو ہمارے ملی شعور کا جزو بن گیا ہے اس طرح ہے: "..... گزشتہ چند ماہ سے میں نے اپنا بہت سا وقت مسلم قانون اور مسلم تاریخ پڑھنے میں صرف کیا ہے اور اب میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ ہندو مسلم ایکا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ موجودہ مسلم قائدین جو عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہیں بہت نیک نیت ہیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب اس اتحاد میں مطلقاً" حارج ہے۔ کلکتہ میں، میں نے آپ کو اپنی گفتگو جو حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی، سنائی تھی۔ حکیم صاحب سے زیادہ شریف النفس مسلمان ہندوستان میں کوئی نہیں۔ مگر کیا کوئی مسلمان قرآن سے انحراف کر سکتا ہے؟ میری آرزو صرف یہی ہو سکتی ہے کہ (کاش) میں نے قرآن کا مفہوم غلط سمجھا ہو!"

اجتہاد تو تھا یہ لا جپت رائے کا، مگر ہمارے ملی تخیلات میں اس کا پیوند اس طرح لگا ہے کہ گویا ہمارے دین کا یہی روحانی اصل اصول ہے۔ کسی عالم دین بلکہ خود اقبال نے کہیں اس قسم کی رائے کا اظہار نہیں کیا کہ اسلام اور قرآن برادران وطن کے ساتھ اتحاد کی راہ میں حارج ہیں۔ کسی سیاسی قائد مثلاً جوہر یا جناح نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہندو مسلم اتحاد کے نہ ہونے کا سبب قرآن اور اس کے احکامات ہیں۔

دوسری بات چودھری خلیق الزماں کی زبان سے سنئے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"۱۱ اگست سن ۴۷ء کو بحیثیت نامزد گورنر جنرل اور صدر مجلس دستور ساز پاکستان مسٹر جناح نے اولین موقع پر دو قومی نظریہ کو ترک کر دیا۔" ۲۔

قائد اعظم نے اس مجلس میں یہ خطبہ دیا تھا: "اب اگر ہم مملکت پاکستان کو خوش حال اور فارغ البال دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو کلیتاً" عوام کی خدمت میں خصوصاً" غریبوں کی خدمت میں لگ جانا چاہئے..... خواہ تمہارا رنگ، ذات اور دین کچھ ہی ہو مگر اب تم میں سے ہر ایک پاکستان کا شہری ہے جس کے وہی تمام حقوق اور ذمہ داریاں ہیں جو کسی اور کی ہو سکتی ہیں.... ہم کو اسی جذبہ سے کام کرنا ہے۔ تھوڑے عرصہ میں اکثریت اور اقلیت، ہندو قوم اور مسلم قوم کے قصے ختم ہو جائیں گے۔ خود مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی اور شیعہ، سنی وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، دیش، کھتری، بنگالی، مدراسی وغیرہ ہیں۔ یہ سب (تفرقات) دور ہو جائیں گے اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی آزادی میں یہی مختلف حالات حارج رہے، ورنہ ہم بہت پہلے آزاد ہو چکے ہوتے۔ آپ کسی مذہب یا عقیدہ کے ہوں، اس کو ریاست کے کام سے واسطہ نہیں۔"

تیسرا اہم عامل جس سے ملی شعور متاثر ہوا اقبال کے چند ابیات ہیں جن کی نشر و اشاعت، اقبال کے تمام ملی و مدنی نظریات سے کہیں زیادہ ہوئی ہے اور جن کی روشنی میں عامۃ الناس

سے "بے وطن قوم" بننے کو کہا جاتا ہے۔ وہ ابیات یہ ہیں۔

عجم ہنوز نداند رموز دین ورنہ
زدیوبند حسین احمد این چہ بوالعجی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبرز مقام محمد عربی است
مصطفیٰ برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است ۳۔

یوں نظر آتا ہے کہ ہم نے اقبال سے بس ان ہی شعروں کی حد تک استفادہ کیا ہے اور ان شعروں کو بھی ہم لالہ لاجپت رائے کے ارشادات کی روشنی میں معانی پہناتے ہیں اور ملت اسلامیہ میں وطن ناشناس قومیت کی آبیاری کرتے ہیں۔ مزید بر آں یوں معلوم ہوتا ہے کہ لاجپت رائے اور ان کے قماش کے غیر مسلم مفکر خدانخواستہ ہمارے ائمہ دین ہیں۔ ہم اپنی پوری سیاست، اجتماعی حرکیت، داعیات قومی اور شعور مذہبی کی شرح و تاویل ان ہی کے ڈالے ہوئے خطوط پر کرتے ہیں اور ان ہی کے مجوزہ قاعدوں اور مفروضات پر ہمارے مورخ آج کل تاریخ سازی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہماری ملی تاریخ کو یہ مسلم مورخین، بالخصوص پاکستان کے نئے مورخین، اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا امت محمدیہ اپنی تاسیس میں ایسی ہے کہ:

۱۔ دوسری ملتوں سے تعاون اس کی فطرت کے خلاف ہے، وہ بباطن اتحاد دشمن اور ہمسایہ آزار ہے۔

۲۔ اس کی پوری تاریخ تعاون کی شکست و ریخت سے عبارت ہے، جہاں کہیں اسلام نے غلبہ حاصل کیا اقوام سے برادری اور مساوات رخصت ہو گئی۔

۳۔ یہودیوں کی طرح مسلم شعور تمدن کو وطن سے کوئی نسبت نہیں ہے: ہر وطن میں

غیریت اس کا منصب ہے' اس لئے ناموس وطن اس کے لئے وقعت نہیں رکھتی۔

آخری بات جو اس مضمون کے عنوان کی وجہ ہے یہ ہے کہ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں' ہر قوم کے اپنے آغاز و نشاۃ سے متعلق کچھ نہ کچھ بصائر ہوتے ہیں جو اساطیر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی حقیقت یا روح دو چار کہاوتوں یا ضرب الامثال میں مجسم ہو کر دوام اختیار کر لیتی ہے۔ قیام پاکستان کے چوبیس پچیس برس بعد جب ہم اپنے ہاں کے امثال کا جائزہ لیتے ہیں تو کچھ اس قسم کی باتیں سنتے ہیں۔: "پاکستان کی بنیاد اسی دن پڑ گئی تھی جس دن محمد بن قاسم نے دیبل کی بندرگاہ میں قدم رکھا۔" "شاعر مشرق نے پاکستان کا خواب دیکھا اور قائداعظم نے اس کو حقیقت بنایا۔" ایک کہاوت خود شاعر مشرق کے بارے میں ہے: "پہلے وہ وطن پرست تھے مگر بعد میں اسلام پرست ہو گئے۔" اسی طرح قائداعظم کے بارے میں یوں ہے کہ "وہ پکے قوم پرست تھے' اقبال نے ان کی کایا پلٹ دی' جس سے وہ پاکستان کے داعی بن گئے۔"

پاکستان' اقبال اور جناح کے بارے میں اس قسم کے عامیانہ تخیلات دراصل اس دور کے صحافیانہ پروپیگنڈے کی یاد ہیں جب ملت اسلامیہ' ہند سن ۱۹۴۰ء اور سن ۱۹۴۶ء کے درمیان تحریک پاکستان چلا رہی تھی۔ اس قسم کی پرکشش اور ڈرامائی کہاوتیں عوام میں بہت جلد پھیل جاتی ہیں۔ اس لئے اس دور کا صحافی اور سیاسی پروپیگنڈا آسان راہوں پر چل پڑا تو کیا تعجب ہے؟

ہم اپنے موضوع سے کسی قدر گریز کرتے ہوئے حالات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یوں تو عبدالجبار خیری نے ۱۹۱۷ء میں اسٹاکہوم کی بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں تقسیم ہند کا خیال پیش کیا تھا' مگر اس کا سب سے زیادہ واضح اور معین خاکہ عبدالقدیر بدایونی نے ۱۹۲۰ء میں پیش کیا جب کہ خلافت اور سوراج کے لئے ہندو مسلم اتحاد کے تھپیڑے اٹھ اٹھ کر ایوان

حکومت سے ٹکرا رہے تھے۔ عبدالقدیر بدایونی نے ایک کھلے خط میں جو دراصل ایک مقالہ تھا گاندھی جی سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق ہو تو آپ کو افراد کی ذاتی رائے چھوڑ کر ہمارے قومی واسلامی نقطہ خیال پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جس بات کی ضرورت ہم محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ مذہب کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھا جائے تاکہ جانبین کے معتقدات ناجائز دخل اندازی سے محفوظ رہیں۔ علاوہ برین جو تہوار اور رسوم و جلوس آپ کے مخصوصات میں سے ہیں ان میں قطعاً" مسلمانوں کو شریک نہ کیا جائے۔ نہ آپ لوگ ہمارے مذہبی امور میں مخل ہوں، بلکہ **لکم دینکم** ولی دین پر عامل رہیں۔ اگر کچھ عرصہ ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے گا اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں، چاہے وہ قربانی کے متعلق ہو یا نماز، اذان وغیرہ کی بابت، مداخلت نہ کی جائے تو اس کا یہ اثر ہوگا کہ آج جو کشمکش ان دو قوموں میں موجود ہے وہ کم ہو جائے گی اور ملکی معاملات میں دونوں ایک دوسرے کے شریک ہو سکیں گے۔

"یہاں پر میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ مخالفت کی بنا صرف گاؤ کشی نہیں ہے بلکہ اردو ہندی جھگڑے، انتظام سلطنت میں حقوق کی مزاحمت، انتخاب جداگانہ سے انکار، سرکاری ملازمت کی کشمکش وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پر اتحاد کے موانع ہیں۔ اس لئے یہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد کہ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ رکھا جائے اور جانبین کے معتقدات سے تعارض نہ کیا جائے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایک زبردست کمیشن مساوی التعداد ہندوؤں اور مسلمانوں کے معتمد علیہ اشخاص کا مقرر کیا جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کرے۔

۱۔ ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بنا پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کا بڑے سے بڑا حصہ..... اس کی آبادی کا علیحدہ کر دیا جائے اور یہ حصہ اس قوم کا حلقہ اثر قرار دیا جائے۔ مثلاً

مسلمانوں کے لئے حسب ذیل تین صوبہ بنائے جاسکتے ہیں:

(ا) صوبہ سرحدی و مغربی پنجاب کے دس اضلاع: راولپنڈی' اٹک' جہلم' گجرات' شاہ پور' میانوالی' جھنگ' مظفر گڑھ' ڈیرہ غازی خاں اور ملتان یکجا کر کے ایک صوبہ بنایا جائے۔

(ب) بنگال میں بوگرہ' رنگ پور' دیناج پور' میسور' ندیا' فرید پور' ڈھاکہ' راج شاہی' میمن سنگھ' باقر گنج' نواکھالی اور پبڑا کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنایا جائے۔

(ج) سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے جدا کر کے تیسرا صوبہ بنایا جائے۔

(۲) یہ بات اصولاً تسلیم کرلی جائے کہ اس تقسیم کے بعد ہر حصہ ملک کا نظم و نسق اس کی کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لئے کیا جائے گا۔

(۳) قلیل التعداد اقوام کی حفاظت و ادائے مراسم مذہبی و حقوق ملازمت وغیرہ کے لئے قواعد مرتب کئے جائیں اور ان کی قومی' سیاسی اہمیت کی بنا پر حسب ضرورت دارالامن قائم کئے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ قوم ایک باا ثر قوم ہے لیکن کسی واحد ضلع میں وہ بلحاظ آبادی ہندوؤں یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے جو اس کا حلقہ اثر بنایا جا سکے اس لئے قومی اور پولیٹیکل اہمیت کی بنا پر ان کے لئے ایک دارالامن قائم کیا جائے۔ لدھیانہ اور امرتسر اس کے لئے بہت موزوں ہیں۔ ان مقامات کا نظام حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے۔ سیالکوٹ سکھوں کا ماویٰ و ملجیٰ قرار دیا جائے اور ان کو وہاں وہی حقوق دیئے جائیں جو سکھوں کو امرتسر' لدھیانہ میں حاصل ہیں۔ اسی طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کی ضرورت ہوگی۔

(۴) تبادلہ آبادی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ قلیل التعداد اقوام کے افراد جو کسی خاص وجہ سے ترک وطن کر کے خود اپنی قوم کے حلقہ اثر میں جانا چاہیں وہ بغیر زیادہ

نقصان کے تبدیل سکونت کر سکیں۔

(۵) مجوزہ کمیشن کا فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت میں ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے سامنے بطور ملکی مطالبہ کے عمل درآمد کے لئے پیش کیا جائے۔

(٦) جس وقت تک اس طرح کا معاہدہ نہ ہو جائے۔

(ا) مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کی مخالفت کی جائے۔

(ب) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب آبادی کی بناء پر قرار دیا جائے۔

(ج) مذہبی مناقشات کے انسداد کے لئے قومی پنچائتیں قائم کی جائیں جن میں ہندو مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہو اور ہر قوم کی پنچائت کے لئے وہی لوگ منتخب کئے جائیں جو درحقیقت معتمد علیہ ہوں۔"

عبدالقدیر بدایونی کی یہ تجاویز مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں ذوالقرنین' بدایوں میں شائع ہوئیں۔ پھر ان کو مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے باہتمام مقتدا خان شروانی ۱۹۲۵ء میں شائع کیا گیا۔ بدایونی کی سیاسی بصیرت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ ان تجاویز کے ستائیس برس بعد وی پی مینن ماؤنٹ بیٹن اسکیم کے تحت جو پاکستان معرض وجود میں آیا وہ بحیثیت مجموعی ان خطوں پر مشتمل تھا جو انہوں نے مسلم آبادی کے اقتدار کے لئے مشخص کئے تھے۔ ان تجاویز میں تبادلہ آبادی کی بھی پیش بینی کی گئی تھی۔ پھر سکھوں کے لئے ایک دارالامن بھی تجویز کیا گیا تھا۔ سکھوں نے مشرقی پنجاب کو تقسیم کروا کر ایک صوبہ اپنے لئے وضع کیا۔ یہ بات ۱۹٦۵ء میں ہوئی گویا ان کے لئے دارالامن کی ایک شکل ہوئی۔ عبدالقدیر بدایونی ایک بڑے عالم تھے، لیکن عملی سیاست کی دنیا سے دور تھے۔ ۱۹۳۲ء سے وہ حیدر آباد کے مفتی عدالت العالیہ رہے۔ بہرحال بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ اسکیم سیاسی اقدامات کا جزو نہ بنی۔ تاآنکہ مسلم سیاست نے ۱۹۳۰ء کے بعد خود ایسے ڈھرے پر آگئی کہ بالاخر دو وفاقوں کی تجویز کی صورت میں

پاکستان کا قیام اس کا نصب العین بن گیا۔ نصب العین کے اس تعین میں جناح اور اقبال کا فیصلہ کن حصہ ہے گو دیگر قائدین مثلاً شعیب قریشی اور خلیق الزمان کے حصہ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تحریک پاکستان اس طرح بہرحال ہندوستان کے سیاسی تعامل کی پیداوار ہے۔ اس تحریک کو اس بات سے کوئی علاقہ نہیں کہ محمد بن قاسم نے دیبل میں قدم رکھا تھا۔ اس خصوص میں اس سچی بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو سماج نے عرب اور بعد ازاں ترک، افغان اور مغل ادوار حکومت میں اپنی انفرادیت، مزاج اور تمدن کی کم و بیش پوری طرح حفاظت کی۔ دوسری طرف مسلمانوں کا بھی یہی حال رہا۔ ہندوستان میں وہ ہندو تہذیب کی وسعتوں میں کھوئے جانے سے بچ گئے۔ ہر دور میں انہوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ان سے قبل یہاں یہ ہوا کیا ہے کہ جو تہذیب بھی باہر سے آئی یا جو قوم بھی وارد ہوئی وہ ہندو بدھی تہذیب کے بہاؤ میں آہستہ آہستہ گم ہو گئی۔ اس طرح ایک اور صرف ایک ملک گیر تمدنی بہاؤ اس برصغیر کی تاریخ میں تمام مزاحمتوں اور دشواریوں کے باوجود جاری رہا۔ اسلام کی آمد سے اس تاریخی سیل کی ماہیت میں انقلاب آفریں تبدیلی ہوئی۔ دو ایسے تہذیبی دائروں کا باہمی تعامل شروع ہوا، بالخصوص شہاب الدین غوری (۱۲۰۶ء) کے زمانہ سے کہ ان میں سے ہر ایک اتنا طاقتور تھا کہ دوسرے میں جذب نہ ہو سکا۔ مگر اس سے پاکستان کا تصور اخذ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ ان ہر دو تہذیبوں نے باہمی میل جول کے ذریعہ ایسے کردار و اخلاق کو بھی نشوونما پانے کا موقع دیا کہ ان کا باہمی تعمیری تعامل بحیثیت مجموعی مختلف شکلوں سے آگے بڑھتا گیا۔ مغلوں کا دور آنے تک یہ اتنی ترقی کر گیا تھا کہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایبک (۱۲۱۰ء) سے شیر شاہ (۱۵۴۵ء) تک سیاسی اقتدار کی لگام ہمیشہ ایک قبیلہ یا قوم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ فیروز تغلق (۱۳۸۸ء) کے زمانہ تک یہ اقتدار ترک قبائل کا تھا۔ ان کے اقتدار میں کوئی اور گروہ شریک نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے یہ اقتدار کسی قدر مخلوط

رہا۔ پھر افغانوں کا ہو گیا۔ مغلوں کے عہد میں ہمایوں (۱۵۵۵ء) کے دور سے اقتدار کے ہیکل میں فیصلہ کن تبدیلی ہوئی۔ یہ دو طاقتی اقتدار ہو گیا۔ تورانی اور ایرانی اس کے شریک بن گئے۔ پھر اکبر (۱۶۰۵ء) کے زمانے میں یہ متغیر ہو کر سہ طاقتی اقتدار بن گیا۔ راجپوت بھی اس کے شریک ہو گئے۔ یہ رجحان اکبر کے بعد اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اس طرح مغل عہد سہ طاقتی اقتدار و حکومت کا مظہر تھا۔ خود اورنگزیب (۱۷۰۷ء) کے عہد میں بھی تورانی' ایرانی اور راجپوت اقتدار میں فرق نہیں آیا۔ صرف اتنا ہوا کہ مرہٹوں نے بھی جن کا رتبہ ورنوں کے نظام میں بہت نیچے تھا بحیثیت قوم اس اقتدار میں شریک ہونا چاہا۔ چنانچہ اس سہ طاقتی اقتدار سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ مرہٹوں کو مٹانے میں یہ اقتدار ناکام رہا۔ اورنگزیب کے کچھ عرصہ بعد وہ بھرپوری قوت سے ابھرے۔ اس دور میں عام مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ محض رعیت تھے۔ ان کا کام تو بس لگان دینا تھا یا سپاہی فراہم کرنا یا پھر منشی گری کرنا۔ مغل دور میں اقتدار سہ طاقتی ہونے کے سبب درباری سیاست پچھلے ادوار کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ تھی۔ اس میں ایرانی' تورانی اور راجپوت امراء کے مختلف جتھے ہو جاتے تھے اور اس طرح طاقت کا توازن اندرونی طور پر بدلتا رہتا تھا۔ اہل ہند کا کام' عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان' محض اتنا ہوتا تھا کہ اس توازن کے بدلتے ہوئے برجوں کا تماشہ دیکھا کریں۔

آج ہمارے مورخین کا ایک گروہ ان درباری چپقلشوں میں ہندوستان کی نظری تمدنی' فکری' عمرانی اور مذہبی تاریخ کو محصور کر دینا چاہتا تھا اور وہاں سے پاکستان کا تصور اخذ کرنا چاہتا ہے۔ ان کے مقدمات اور نتائج کا ذخیرہ بڑا بودا ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ ہند اس اقتداری سیاست سے ایسے ہی باہر تھی جیسے ہندو جاتی۔ خواہ ترک قبائل کا قبضہ ہو یا افغان قبائل کا یا مغل سہ طاقتی سیاست' اس پورے عہد میں اقتدار نہ اسلامی تہذیب کا مظہر تھا' نہ

اسلام کے سماجی نظام کا اور نہ ہندی مسلمانوں کی حکمرانی کا۔ سب حکومت ترک خاندانوں کی تھی تب بھی مسلمانان ہند رعایا تھے اور جب اقتدار سہ طاقتی ہو گیا اور ایرانی' تورانی اور راجپوت امراء اس کے اجزائے ترکیبی بن گئے تب بھی وہ محض رعایا ہی رہے۔ جب مغل حکومت کا شیرازہ بکھر گیا تو بعض علاقوں میں ایرانی امراء نے اقتدار سنبھالا اور بعض علاقوں میں تورانیوں نے اور راجپوت اپنے صحرا کی وسعتوں میں گم ہو گئے۔ صرف مرہٹے میدان میں رہ گئے۔ وہ واقعی ایک قوم تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔ ان کی تاخت و تاراج کے ہاتھوں پوری رعیت دکن سے بنگال تک پراگندہ تھی۔ وہ اقتدار چاہتے تھے اور مغل بادشاہ کی دیوانی کے فرائض اور وکالت ان کا آئینی نصب العین تھا۔ فرنگی سیاست تورانی اور ایرانی امراء کو بساط کے مہروں کی طرح استعمال کرتی ہوئی بازی لے گئی اور کمپنی مغلوں کے وسیع علاقوں میں دیوان دار ہو گئی۔ یہ سب کچھ ایسے ماحول میں ہوا جب ہندوستان میں سوائے مرہٹوں اور سکھوں کے نہ تو ہندوؤں میں اور نہ مسلمانوں میں قومیت کا احساس تھا چہ جائیکہ آزادی کا خیال ہوتا۔

آزادی اور قومیت کے محرکات ہندوستان کے لئے بالکل جدید تھے۔ یہاں کی آبادیوں اور مختلف علاقوں میں یہ محرکات اس وقت پیدا ہونے شروع ہوئے جب فرنگی تسلط پورے طور پر قائم ہو چکا تھا۔ ان محرکات کی تخم ریزی ہمارے سیاسی قائدین کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی آبیاری بھی انہوں نے ہی کی۔ نیا برصغیر ان ہی کا سینچا ہوا باغ ہے۔ پاکستان کا تصور اسی باغ کا ثمر شیریں ہے۔ چنانچہ تحریک پاکستان ایسی تحریک ہے جو ہندوستان کے مخصوص حالات اور حصول آزادی یعنی جمہوری اداروں کے قیام و انصرام کے باہم تصادم و تطابق سے وجود میں آئی۔ اس تحریک سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ زندہ قوتوں کا عمل ہے جس میں کوئی لمحہ دوسرے لمحہ کی بازگشت نہیں۔ پاکستان کا قیام تاریخ ہند کا تازہ نقش

ہے۔ اس لئے اس کے محرکات کو پچھلے اور ادوار میں تلاش کرنا فضول ہے اور محض ایک رومانوی رجعت ہے۔

عبدالقدیر جیسے عالم اگر ہندوستان کی سیاسی تنظیم نو یا تقسیم کا نظریہ ۱۹۲۰ء میں پیش کرنے کے قابل ہوئے تو یہ صرف اسی وقت ہوسکا جب جمہوریت، اتحاد اور آزادی کے محرکات تکوینی قوت بنتے جا رہے تھے اور وہ اس لئے کہ ہمارے سیاسی قائدین اور بیدار مغز مفکرین نے اس برصغیر کی خاک سے ایک نیا عالم خلق کیا جو اپنی تقویم میں پرانی دنیا سے قطعاً" مختلف تھا۔ اس آفرینش میں جناح اور اقبال کا مقام بہت بلند ہے۔ جناح کی پوری زندگی اسی انقلاب کے آغاز، نشاۃ اور انصرام و انجام سے آخر تک وابستہ رہی۔ سیاسی جدوجہد کے آغاز سے آزادی کے حصول تک وہ امیر کارواں رہے۔ جناح ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے، جب کہ ابھی یہاں کوئی سیاسی ہلچل نہیں تھی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی۔ اس کا مقصد حکومت اور تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنا اور ملازمتوں کو سودیشی بنانا تھا۔ جناح اس زمانہ میں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے انٹرینس کیا اور بیرسٹری کے لئے انگلستان گئے۔ وہاں چار سال رہے۔ بیس سال کی عمر میں سند حاصل کی اور ۱۸۹۶ء میں وطن لوٹ آئے۔ یہاں پر ان کا سب سے پہلی بار ذکر ایک اپیل کے سلسلے میں آتا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں تلک اور بمبئی کے دوسرے زعما نے ہندو مسلمان اتحاد کی اپیل شائع کی۔ اس میں اس نوعمر بیرسٹر کا بھی نام تھا۔ ان کو وکالت کے پیشہ میں جمنے کے لئے سخت جدوجہد کرنا پڑی، مگر اس عرصہ میں وہ قومی کاموں کی طرف بھی متوجہ رہے۔ ان کی ابتدائی سیاسی تربیت دادا بھائی نوروجی اور گوکھلے کی صحبت میں ہوئی۔ یہ برصغیر ان پرانے مدبروں کا بہت ہی زیادہ زیر بار احسان ہے۔ انہوں نے ہی انگریزی شہنشاہیت کو سیاسی اصلاحات کے راستہ پر ڈالا تھا۔ ۱۹۰۶ء تک ان جیسے لوگوں کی وجہ سے کانگریس اتنی ترقی کر چکی تھی کہ خود ارادیت کو اپنا نصب العین

قرار دے دیا۔ جناح کانگریس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۰ء میں منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ جناح کا مقام اتنا بلند ہو چکا تھا کہ بمبئی کے مسلمانوں نے انہیں کونسل کے لئے منتخب کر کے بھیجا۔

اقبال، جناح کے ہم عصر ہیں۔ دونوں میں ایک آدھ سال کا فرق ہے۔ اقبال سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ انٹر تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور آگئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انہوں نے بی اے اور ایم اے کیا۔ وہ ادبیات اور فلسفہ کے طالب علم تھے۔ اس تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ آئندہ چل کر ان کو قوموں کی باطنی زندگی اور ثقافتوں کی ماہیت، نیز تاریخ کی حرکیت کے بارے میں گہری بصیرت حاصل ہوئی۔ ان کی بصیرت بڑے نازک موقعوں پر ہندوستان بالخصوص مسلمانان ہند کی رہنمائی کا باعث ہوئی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ استاد مقرر ہوئے اور اس طرح حلقہ ملازمت میں داخل ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ ان کی پہلی مشہور نظم ہمالہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کی لے یہ بتاتی تھی کہ یہ فطری شاعری سے کچھ زیادہ ہے، محض مناظر فطرت کی عکاسی نہیں بلکہ ایک پیام ہے۔ اگرچہ وہ ملازمت میں آگئے تھے مگر شاعری ان مقاصد کی بالکل ضد تھی جو اس غیر ملکی حکومت کے مفید مطلب تھے۔ ان کے کلام میں بالکل نئے انداز کا سوز و گداز تھا، نیا عشق اور نئی مہجوری تھی۔ وہ ایک انسان تازہ کی شاعری تھی جو بیداری، حریت، خود ارادیت، غیرت قومی اور وطن دوستی سی قدروں کے قوام سے نئے آدم کا ہیولا تیار کر رہی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ کی روانگی تک ان کی کئی نظمیں مثلاً "تصویر درد"، "سر گزشت آدم"، "ترانہ ہندی"، "جگنو"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "نیا شوالہ" ملک گیر بیداری کا رجزیہ نشان بن چکی تھیں۔ وہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان اور جرمنی میں رہے۔ بیرسٹری کی سند اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس دور میں بھی ان کا کلام اہل وطن کے لئے غذائے روح تھا۔ "محبت"، "پیام"، "طلبہ

علی گڑھ کے نام"، "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا" وغیرہ وغیرہ باشندگان ہند کے لئے جدوجہد، ذوق نمو، حرکت مسلسل اور خلاقیت کا پیغام تھے۔ ان کا کلام خیال اور وجدان کے سانچے تبدیل کر رہا تھا۔ آنے والے سیاسی اور قومی انقلاب کے لئے نئے نئے استعاروں، میزانوں، پیمانوں، کنایوں، اشاروں اور علامتوں سے روحانی تہذیب کر رہا تھا۔ یورپ کے قیام نے انہیں اقوام مغرب کے ذوق لطیف، روحانی اساسے، تہذیبی عوامل، نیز قوائے محرکہ کے باطنی تجربہ کا موقع فراہم کیا۔ کیوں نہ ہو؟ مفکر تھے شاعر تھے اور ضروری تربیت سے آراستہ تھے۔

ان کی دوررس نظر اس تہذیب کے ان گوشوں تک پہنچی جن سے اس کے کارخانہ، وجود میں ہمہ ہمی قائم ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یورپ میں جہاں احترام آدمیت ہے وہاں جلب منفعت کی بھٹی میں پوری آدمیت جل رہی ہے۔ اور مفاد پرستی کو ہیئت اجتماعی کے اصول کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ سیاست و معیشت میں وہ ایک طرف جمہوریت پسند ہے تو دوسری طرف استعماریت کا دیو استبداد۔ ملکوتی صفات اور ابلیسی خصائص کا یہ سنگم، اقبال نے محسوس کیا "وطنیت" کو اعلیٰ ترین قدر اور دیوتا بنانے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اب اپنے کلام کے ذریعہ قوموں کی تشکیل جدید پر زور دیا۔ وہ ہندوستان کو وطنیت سے بچانا چاہتے تھے، وطن دوستی سے نہیں۔ انسانی آبادیوں کی روحانی اور اخلاقی اصولوں پر نظم نو ان کی فکر کا نصب العین بن گئی۔ "شکوہ" و "جواب شکوہ"، "شمع و شاعر" اور "اسرار و رموز" کی بنائے تصنیف یہی محرک ہے۔ آخر الذکر میں انہوں نے ملت اسلامیہ کی روحانی اساس واضح کی۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے ہندوستان کی تشکیل وطنیت پر نہ ہو بلکہ روحانیت پر ہو:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

جناح کی طرح اقبال بھی "ہندو مسلم اتحاد" کو برصغیر کی ترقی' سیاسی اٹھان اور آزادی کے لئے بنیادی شرط سمجھتے تھے۔ شروع ہی سے اقبال کا یہ مسلک تھا۔ جناح اور اقبال کے اس مسلک اور ان کی بعد کی سیاسی و فکری زندگی میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

تمام قومی رہنما جو اس برصغیر کو غیر ملکی استعمار سے نجات دلانا چاہتے تھے وہ اس اتحاد کے لئے پورے طور پر کوشش کر رہے تھے۔ آج ہم اس نصب العین کی اہمیت کا اندازہ شاید پورے طور پر نہ کر سکیں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ پوری جدوجہد آزادی کئی ارتقائی منزلوں سے گزری ہے۔ اس کی پہلی منزل تو یہ تھی کہ غیر ملکی حکومت باشندگان ملک کو' آہستہ آہستہ سہی' حکومت کے کاروبار میں شریک کرے۔ دوسری منزل یہ تھی کہ نمائندہ ادارے قائم ہوں۔ تیسری یہ تھی کہ ان اداروں کے اختیارات میں اضافہ ہو۔ ان منازل کے بعد کہیں یہ منزل آتی تھی کہ آزاد ہند اور اس کی آئینی صورتوں کو اس طرح متعین کیا جائے کہ تمام اقوام ہند آزادی سے مستفیض ہو سکیں۔

ان منازل کا حصول صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ متحدہ عوامی طاقت اس غیر ملکی حکومت سے ٹکر لے اور ہر مرحلہ میں کچھ نہ کچھ اختیار و اقتدار حاصل کرے۔ اسی لئے ہمارے بیدار مغز رہنما اس اتحاد کے لئے کوشاں تھے۔ عبدالرشید گنگوہی جو قاسم نانوتوی کے بعد دیوبند کے صدر ہوئے انہوں نے ۱۸۸۵ء میں ہی مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کا مشورہ دے دیا تھا۔

غیر ملکی حکومت جس نے ۱۸۵۷ء میں مغل تخت و تاج کے سقوط سے آئینی استحکام حاصل کیا' اپنی ایک مخصوص منطق رکھتی تھی۔ یہ حکومت دفتر شاہی کا ایک بہت بڑا نظام تھی جس میں دیسی ملازمین کی بھی بہت بڑی تعداد ہوا کرتی تھی۔ یہ نظام ہی اس کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ ان ملازمین کے ذریعہ ہر جگہ اس نے یہ عام خیال کم از کم ۱۸۳۴ء سے ہی وسیع پیمانہ

پر پھیلانا شروع کر دیا تھا کہ انگریزوں کا وجود ہندوستان میں ازبس ضروری ہے اور یہ کہ ان کی آمد نے ہندو تہذیب کو دوبارہ جی اٹھنے کا موقع دیا۔ مسلمانوں میں یہ عام خیال پھیلایا کہ اگر فرنگی نہ آتے تو مرہٹے اور سکھ انہیں نیست و نابود کر دیتے۔ سقوط بنگال کے بعد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے نظام تعلیم کا جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اس نظام میں کئی خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ لوگ یورپی خیالات اور تصورات سے واقف ہوئے مگر اس میں پچھلے ادوار کی تاریخ کو مسخ کیا گیا تھا۔ اس پورے نظام کا سیاسی منشا اس خیال کی اشاعت و ترویج تھی کہ انگریزی راج اس ملک کی مختلف آبادیوں کے لئے خیر و برکت ہے۔ ۱۸۷۰ء تک تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس خیال کی اس شدت سے تبلیغ کی گئی کہ انگریزی مدرسوں کے یہ پڑھے ہوئے لوگ اس حکومت کو باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ اسی دور میں جو فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوا شمالی ہندوستان کے عام باشندوں کی زبان کو جو سب ہی لوگ بلا لحاظ مذہب اور قوم بولتے تھے دو رسم الخط میں لکھوایا گیا' ایک دیوناگری اور دوسرا فارسی۔ اس طرح سے دو مختلف زبانوں کی ترویج کی گئی' ایک ہندوؤں کے لئے' دوسری مسلمانوں کے لئے۔ جہاں اس ترویج کا منشاء یہ تھا کہ پرانے نظام حکومت و سیاست سے رشتہ توڑا جائے وہاں یہ بھی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کیا جائے تاکہ انگریزی راج کا وظیفہ بحیثیت ثالث کے اور بھی زیادہ نمایاں ہو۔ جہاں تک عوام الناس کا تعلق تھا ان کے خیال میں جو کچھ تبدیلی ہوئی تھی وہ بس اتنی تھی کہ ایک بادشاہت گئی اور دوسری آئی۔ ان وفاداریوں کا معیار "حق نمک" ہوا کرتا تھا۔ اسی حق نمک پر جو بسلسلہ' ملازمت ہوتا تھا دیسی ملازموں نیز دیسی فوجیوں کی وفاداری استوار ہوا کرتی تھی۔ اسی کے ذریعہ کمپنی نے اپنا اقتدار اس اجنبی ماحول میں نہ صرف قائم رکھا بلکہ آگے بڑھایا اور اب یہی اس حکومت کے استحکام کا بھی ذریعہ تھا جو قیصر ہند کے نام سے قائم تھی۔ اس ماحول میں جو سیاست سمجھ میں

آتی تھی وہ بس یہ تھی کہ ہر فرد اور طبقہ زیادہ سے زیادہ حکمرانوں کا اعتماد حاصل کرے' ان کے دربار میں رسوخ پیدا کرے' عہدوں اور مرتبوں کا طالب ہو۔ سرکاری ملازمین قوم میں یہی سیاست پھیلاتے تھے۔ اس طرح اس طرح سے دیسی شرفاء کا ایک نیا طبقہ جنم لے رہا تھا جس کا ایمان تھا کہ انگریزی اقتدار دائمی ہے۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی ملک میں فساد ڈالنا ہے۔ سارا اختیار فرنگی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ ہر گروہ کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ ایسی عام فضا میں کسی سیاسی اور قومی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

مگر اسی خاک سے بلند ہمت لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اس کے زمین اور آسمان بدلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ قومی رہنما تھے۔ انہوں نے مختلف اصلاحی تحریکیں چلائیں اختیارات جاری کئے' قومی تعلیم کو قومی ہاتھوں میں لینے کے لئے مدرسے قائم کئے' نیز بلدیاتی اور شہری اداروں میں عوامی نمائندوں کو شریک کرنے کے بھی جدوجہد کی۔ ہندو مسلم اتحاد کو انہوں نے قومی نصب العین قرار دیا تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات آئے کہ ان کے زندہ رہنے کے لئے کسی تیسری طاقت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نصب العین ۱۸۸۵ء سے قومی بیداری کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ جب جناح ۱۸۹۷ء کے بعد ملکی سیاسیات میں آئے اور کانگریس کے ۱۹۰۵ سے سرگرم کارکن بن گئے تو یہی نصب العین ان کی جدوجہد کا رہنما تھا۔ قومی شاعر اقبال کا بھی یہی نصب العین تھا۔ قومی امنگوں کے سامنے اہل دربار کو پہلی شکست ۱۸۹۲ء کی اصلاحات سے ہو چکی تھی۔ دوسری شکست کے آثار ۱۹۰۳ء سے ہی ہویدا تھے' ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان گوکھلے اور دادا بھائی نوروجی کی سیاست نے منٹو اور مارلے کو مزید اصلاحات دینے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک انقلابی ارتقاء تھا۔ ۱۹۰۵ء تک کانگریس اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ "سوراج" کو اپنا نصب العین قرار دے۔ اب مسلمانوں کے ان قائدین کی آنکھیں کھلیں جو انتخابات کے خلاف تھے' جو انگریزی اقتدار کو لاینفک سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ ہندوؤں

اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے تحفظ صرف انگریزی حکومت کے استحکام پر منتہی ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ وقار الملک اور محسن الملک تھے جو حیدر آباد میں بہت اونچے عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے بھاگ دوڑ کی، نواب سلیم اللہ آغا خان اور دیگر معززین کے ساتھ مل کر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور حکومت سے مل کر بالاخر ۱۹۰۹ میں اصلاحات سے قبل مسلمانوں کے لئے علیحدہ انتخابات کا حق منوا لیا۔ اس سلسلہ میں امیر علی نے لندن میں بہت کام کیا۔ لندن میں اس مسلم لیگ کی ایک شاخ ۱۹۰۸ء میں قائم کی گئی۔ جو امیر علی کی رہنمائی میں علیحدہ انتخابات کے لئے کوشاں ہوئی۔ اقبال اس زمانہ میں لندن ہی میں تھے۔ چنانچہ لندن کی شاخ کے وہ رکن ہو گئے۔ بہرحال اس گروہ نے جس کی بنیاد سرسید نے ڈالی تھی اس طرح مسلمانوں کی ایک تاریخی خدمت انجام دی۔ اس کے بعد اس گروہ کا زوال ہو تا گیا۔ مسلم لیگ میں بیدار مغز لوگ آتے گئے یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء تک اس میں تبدیلی آگئی اور اس نے بھی سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ محمد علی جناح اس تبدیلی کے بڑے محرکوں میں سے تھے وہ مسلم لیگ کے اجلاس میں پہلی مرتبہ شریک ہوئے تھے۔ اس اجلاس کی متعدد قراردادوں پر وہ اثر انداز ہوئے۔ اب مسلم لیگ ان شرفاء کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ تھی جو سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے رشتہ الفت زیادہ مستحکم رکھنا چاہئے تاکہ ان کا مرتبہ بلند ہو۔ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ خود اردایت کا حصول اب نوجوان مسلمانوں کا نصب العین تھا۔ جناح ۱۹۱۳ء میں گوکھلے کے ساتھ انگلستان چھٹیاں گزارنے گئے۔ وہاں اصلاحات کے مسئلہ پر بھی ارباب حکومت سے بات چیت کی اور مسلم لیگ کے بھی رکن بن گئے۔ وہاں سے واپسی پر انہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کو اور قریب لانے کے لئے اپنی کوششیں مرکوز کر دیں۔ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ایک ساتھ بمبئی میں ہوئے۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھا۔ حکومت اور رجعت پسند اور

جاگیردار، تعلقدار اور درباردار اس اشتراک و تعاون کے خلاف تل گئے۔ مگر یہ اجلاس کامیابی سے ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اسی طرح ساتھ ساتھ اجلاس ہوئے۔ وہاں مشہور و معروف میثاق لکھنؤ وجود میں آیا۔ اب اہل ہند زیادہ زوردار طریقہ پر حکومت خود اختیاری کے حصول کی گفتگو کرنے لگے تھے۔ اہل ملک کے تیور بتاتے تھے کہ وہ کچھ کرکے رہیں گے۔ فساد پسند طاقتیں بہت تیزی سے دب رہی تھیں۔ آخر کار ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء میں مانٹیگو نے نئی پالیسی کا برطانوی پارلیمان میں اعلان کیا کہ حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستان کو اس طرح بتدریج حکومت خود اختیاری دی جائے کہ آخر کار ایسی حکومت قائم ہو جو وہاں کے عوام کے سامنے جوابدہ ہو۔ اس سے صرف سات برس پہلے منٹو، مارلے نے پارلیمان میں کہا تھا کہ اصلاحات سے ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت یا خودمختاری کا نظام رائج کیا جائے۔ میں آخری شخص ہوں گا جو اس قسم کی بات سوچے۔ ہم تو صرف اتنا موقع دے رہے ہیں کہ لوگ کونسلوں کے ذریعہ اپنی آواز ہم تک پہنچائیں، حکومت اور دانشور طبقے کے درمیان ربط و ضبط میں اضافہ شہنشاہیت کو مزید استحکام دینے اور تقویت بخشنے کا باعث ہو۔ اٹھ سال کے قلیل عرصہ میں مانٹیگو کا یہ اعلان کہ آخر کار حکومت ہندوستانیوں کو سونپنی ہے دراصل ہندو مسلم اتحاد کی عظیم الشان فتح ہوئے۔ ایسے خرقہ پوش جن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی فرنگی راج سے مسلمانوں کو راضی کرنے کے لئے فتوؤں سے مسلح ہو کر آگے بڑھے۔ دوسری طرف تخریب پسند عناصر اور فرقہ پرست ادیب اور شاعر ہندوؤں کو سنبھالنے کے لئے بڑھے اور انہیں مسلمانوں سے ڈرایا، اس کے لئے سیاسی افواہیں استعمال کی گئیں۔ توہمات اور لالچ کے ہتھیار استعمال کئے گئے کہ مسلمانوں کا خروج غلبہ حاصل کرنے اور افغانوں وغیرہ سے مل کر تخت دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے ہے۔ ۱۹۳۰ء تک جو صوفیا اور علما مسلم عوام کو بھٹکانے کے لئے کام کرتے رہے ان کے بالمقابل عبدالباری فرنگی محلی اور

اجمیری مدرسہ کے ناظم معین الدین مذہب اسلام کو واضح کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا دور مسلمانوں پر بڑا قیامت کا تھا۔ "مذہب" کے نام پر انگریزیوں سے وفاداری اور مذہب کے نام پر قومی تحریکوں سے وابستگی' وہ ان دو متضاد روؤں کے درمیان گھر گئے تھے۔ ایسے مشکل وقت پر اقبال نے مسلمانوں کی فکری قیادت کی۔ جناح اپنی صاف سیدھی نپی تلی سیاست میں مصروف تھے جس کا مقصد ہندو مسلمانوں میں آئینی اور دستوری سمجھوتوں او پائیدار اتحاد کا قیام تھا۔ اقبال نے اپنے مدراس کے خطبات کے ذریعہ دین کی روح واضح کی او ثقافت اسلامیہ کے اصول بھی۔ مگر جولائی ۱۹۱۸ء میں جو اصلاحات آئیں وہ بہت ہی زیادہ مایوس کن تھیں۔ نومبر ۱۹۱۸ء تک انگریزی اور ان کے اتحادی جنگ عظیم جیت چکے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کے کانگریس کے اجلاس نے ان اصلاحات کو پورے طور پر مسترد کر دیا۔ حکومت کا رویہ سخت ہو گیا۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ ترکی سالمیت کی بابت ہندوستانی مسلمانوں سے کئے ہوئے وعدوں سے برطانوی حکومت پھر جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل مرکزی اسمبلی کے سامنے آیا۔ عوامی نمائندوں کی آواز کے خلاف یہ قانون بن گیا۔ جناح' نائر' مالویہ اور مظہرالحق نے مرکزی اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح جناح پہلے ترک موالات کے ارباب میں سے ہیں۔

اگر انقلاب فرانس کا آغاز **بیسٹیل** کے پٹ کھولنے سے ہوا تو برصغیر کا حقیقی انقلاب رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ملک اور اس کے عوام کے اٹھ کھڑے ہونے سے ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد نے واضح طور پر برطانوی استبدادیت سے بھرپور ٹکرلی اور اس کے بعد تو عوامی اتحاد اور جوش و خروش کے ایسے نظارے دیکھنے میں آئے کہ اس فلک کج رفتار نے کم دیکھے ہوں گے۔ اب خلافتی سوراجی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا جس کی قیادت علی برادران' موہن داس کر چند گاندھی' خلیق الزماں' محمد اکرم خاں اور ظفر علی خاں کر رہے تھے۔

اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے حکومت، تعلقداروں اور راجاؤں کے گروہ نکل آئے۔ ان کی تائید میں فرسودہ ذہنیت کے صوفیا اور علما اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ۱۹۰۹ء کی بات ہے۔ نیز ۱۹۳۰ء کے خطبہ کے ذریعہ قومیت اور اتحاد پر اپنے افکار روشن دلائل کے ساتھ واضح کر کے رہنمائی کی۔ برصغیر اور بالخصوص مسلمانان ہند جس روحانی بحران اور کشمکش میں مبتلا تھے اس میں جہاں جناح کی سی سیاست ہی ضرورت تھی وہاں اس فکری رہنمائی کی بھی ضرورت تھی جو آخر کار اقبال سے حاصل ہوئی۔

قبل اس کے ہم برصغیر میں اتحاد و اشتراک کے موضوع پر اقبال کے نظریہ کو واضح کریں یہ پس منظر بھی پورے طور پر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ صوفیا اور علما کا جو معتدبہ گروہ اپنی نادانی سے یا حکومت کے اشارہ پر جس قسم کے خیالات اور نظریات نیز مذہبی فتوؤں کی نشر و اشاعت میں مشغول تھا وہ کچھ اس قسم کے ہوتے تھے: "کافر کے ساتھ صرف اس وقتِ اتحاد مذہبا" جائز ہے جب اس کی چٹیا مومن کے ہاتھ میں ہو۔" اس سلسلہ میں وہ "سیر الکبیر" "المبسوط" "فتاوی قاضی خان" "فتاوی عالمگیری" وغیرہ وغیرہ سے سندیں لاتے تھے۔ "کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں شرکت کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں اور اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں خواہ متبوع ہوں یا دونوں (مسلمان اور وہ) قوت عمل میں برابر ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں۔" کوئی تعجب نہیں کہ اس قسم کے مذہبی فتوؤں نے اچھے اچھے ہندوؤں کو مسلمانوں کے مذہب سے دہشت زدہ کر دیا ہو اور انہیں مہاسبھائی بنا دیا ہو۔

انگریزی مال کے بائیکاٹ کے خلاف ان علما نے یہ فتویٰ دیا کہ تجارت مباح ہے اور اگر ترک مباح پر کوئی مجبور کرے تو اس مباح پر عمل کرنا اور زیادہ تاکیدی ہو جاتا ہے۔ تحریک آزادی کے خلاف یہ فتویٰ دیا "چونکہ قدیم سے مذہب اور قانون جملہ مسیحی لوگوں کا یہ ہے کہ کسی کی ملت اور مذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی مذہبی آزادی میں

دست درازی کرتے ہیں اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن و حفاظت میں رکھتے ہیں' لہٰذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں' جو کہ مملوکہ اور مقبوضہ اہل مسیح ہے' رہنا اور ان کی رعیت بنا درست ہے۔" مطلب یہ کہ ان کے خلاف اٹھنا درست ہے۔ پھر ان حضرات نے مزید یہ بیان کیا کہ "جو آزادی شارع کو مطلوب ہے وہ یہ کہ "خالص مسلمانوں کی قوت و شوکت کے حصول کی امید ہو اور یہاں ایسی آزادی کی ہرگز امید نہیں۔ جو آزادی حاصل ہوگی وہ کفر اور اسلام کے معجون مرکب کو ہوگی۔ جو ہرگز مطلوب شارع نہیں اور اصولیین و فقہا کا مسئلہ مسلمہ ہے کہ .... مجموعہ حلال و حرام کا حرام ہی ہوتا ہے اور یہی مسئلہ عقلی بھی ہے بلکہ اگر صرف جزو مباح پر نظر کی جاوے مگروہ ذریعہ ہو جاوے کسی مقصود غیر مباح کا سو بقاعدہ شرعیہ مقدمتہ الحرام خود وہ جزو مباح بھی غیر مباح ہو جاتا ہے۔" "چونکہ مسلم و مشرک کے معجون مرکب سے تسلط کفار بھی حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ مرکب خلاف مطلب شرعیہ ہے۔ مسلمانوں کی اس میں شرکت غیر مباح ہے۔" "موالات مطلقاً" ہر کافر مشرک سے حرام ہے اگرچہ ذمی مطیع الاسلام ہو۔" دین کی یہ تشریح مسلمانوں کو فرنگیوں کی غلامی پر راضی کرتی تھی' حصول آزادی کو خلاف شرع بتاتی تھی اور مسلمانوں کو صرف یہ باور کرواتی تھی کہ مقصود شریعت غلبہ و شوکت اسلام حاصل کرنا ہے تاکہ کافر مطیع و فرمانبردار ہو اور وہ بھی اس وقت جب کہ بزور اسے مقصود حاصل کرنے کی قدرت ہو ورنہ خاموشی اور اطاعت اس حکومت نصرانی کی عین شرع ہے۔ ان فتوؤں اور ارشادات سے یقیناً" مسلمانوں کا نفسی انتشار اور مذہبی نراج میں مبتلا ہو جانا ضروری تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ایسا ادب بار بار ان میں گردش کرتا تھا جس پر اس زمانہ کے بڑے عظیم الشان علما و مشائخ کے دستخط ہوتے تھے۔ تبدیل احکام الرحمن و اختراع احکام الشیطان سے ہاتھ اٹھاؤ اور مشرکین سے اتحاد توڑو' دیوبند وغیرہم مرتدین کا ساتھ چھوڑو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پاک تمہیں اپنے

سایہ میں لے۔ دنیا نہ ملے نہ ملے دین ملے توان کے صدقہ میں ملے۔" جمعیت علمائے ہند اور ایسے حضرات جیسے عبدالماجد دریا آبادی، عبدالباری فرنگی محلی، معین الدین اجمیری غیرہ تھے وہ ان تحریروں اور تقریروں کا جواب دیتے رہتے تھے۔ مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کے بنیادی رویہ کی وضاحت کی جائے۔ آزادی کے حامی علمائے کرام زیادہ سے زیادہ بات بتاتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کا قبضہ ختم ہونے سے بلاد اسلامیہ مشرق وسطیٰ سے برطانیہ کی گرفت ختم ہو جائے گی اور یہ امر شوکت اسلام کا باعث ہو گا۔ اس وجہ سے آزادی ہند کی تحریک عین شرع شریف کے مطالبہ میں سے ہے۔ لیکن یہ بالواسطہ فائدہ مسلمانوں کے لئے کافی وجہ تسلی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سے مہمات مسائل پیدا ہوتے تھے۔ ان کے حل کے لئے اقبال کے سے مفکر کی ضرورت تھی۔ اقبال کے چھ لکچروں کی اہمیت اگرچہ اپنی جگہ مستقل ہے مگر اس کا اندازہ کچھ اس زمانہ کے مذہبی ادب سے ہی ہو سکا ہے جب یہ لکچر دیئے گئے تھے۔ ان لکچرز میں اقبال نے دین کے بنیادی رویہ کی وضاحت کی اور آزادی کے مقصد کو براہ راست دین اسلام کی اساسات سے ثابت کیا۔ انہوں نے بتلایا کہ خداوند نے انسان کو آزاد شخصیت کا مالک بنایا ہے اور اس کو ذمہ داری سے مکلف کیا ہے۔ انسان کا معاشرتی نظام از روئے شریعت جمہوریت ہے جو آزاد بالذات انسانوں کا مدینتہ الفاضلہ ہے۔ نیز انہوں نے اسلام کے قانون (فقہ) کی تشکیل جدید پر زور دیا۔ فقہ کی سابقہ طرفہ طرازیاں تو بادشاہان کے کام آتی تھیں اور ان ہی کے ذریعہ صوفیا اور علما کا یہ بڑا گروہ ہندوستان پر انگریزی حکومت کی درستگی ثابت کر رہا تھا۔ اقبال نے فقہ کی نئے سرے سے تدوین، اجتہاد اور استنتاج کے اصول واضح کئے تاکہ فقہ اسلامی پھر سے اپنا رشتہ دور اول کے اسلام سے جوڑ سکے اور اس کے دائمی اصولوں سے حیات حاصل کر سکے اور ملت اسلام اپنے ضمیر سے ہم آہنگ ہو کر صواب و ناصواب کا شرعی اندازہ لگا کر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکے۔

نیز حصول آزادی کی مذہبی فرضیت اور معاشرتی نظام کی صحت مند بنیادوں پر استقلال کے لئے جدوجہد کر سکے۔ ان کے یہ خطبات سچ پوچھئے تو فقہ اکبر اور اصول فقہ کے ابواب پر مشتمل تھے۔ ان پر ان کو بجا طور پر ناز تھا۔ ان کے نتائج کا اہم ترین حصہ خود کلام پاک (قرآن مجید)' احادیث رسول اور مستند افکار اسلامی سے ماخوذ تھا۔ اس اصولی کام کے بعد وہ ہندو مسلم اتحاد کے مسائل پر متوجہ ہوئے اور ۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ میں انہوں نے نظریہ قومیت پر اپنا معرکتہ الآرا خطبہ پڑھا۔ ان کے نظریہ میں ان تمام خدشات کا حل تھا جو رجعت پسند مسلمہ مذہبی ادب اس زمانہ میں پیش کرتا تھا اور جس کی بنیاد پر فرنگی حکومت سے مسلمانوں کی وفاداری کا جواز پیش کیا جاتا تھا۔ اس طرح اقبال کے وجود سے تحریک آزادی اور مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی معنویت میں اضافہ ہوا۔

اقبال کا نظریہ وہی تھا جس کا اظہار بعد میں جناح نے پاکستان مجلس دستور ساز میں کیا۔ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد سن ۱۹۳۰ء میں زیادہ جامعیت کے ساتھ اسی نظریہ کو واضح کیا تھا۔ یہ نظریہ نامیاتی تھا۔ میں اسے کثیرالجواہریا سالماتی نظریہ قومیت کہوں گا۔ آج بیالس سال بعد بھی حالات کے بہاؤ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ نظریہ قومیت دائمی قدروں کا حامل ہے۔ یہی ہندوستان کی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ بھارت اور پاکستان' دونوں مملکتوں میں 'قومی استحکام کے لئے کام ہو رہا ہے مگر ہنوز دلی دور است۔ صرف اقبال کے سالماتی نظریہ قومیت سے ان مملکتوں میں وہ نصب العین تحقیق پذیر ہو سکتے ہیں۔ تحریک آزادی جن کا مظاہر تھی۔

قومیت کی تاسیس دو نظریات پر ممکن ہے۔ ایک تو وہ جس کی روح خالص جمہوری ہو اور دوسرا وہ جس کا باطن استبداد ہو۔ پہلا نوری اور دوسرا ناری نظریہ قومیت ہے۔ نوری نظریہ میں تمام جائز تفرقات کی رعایت ہے جب کہ ناری نظریہ سب کو سوخت کر دیتا ہے۔ ناری نظریہ دراصل قوم کو ایک دھارا تصور کرتا ہے اور افراد کو قطرہ اور سب کو اس دھارے میں فنا

ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ "قطرہ و دریا" کی تشبیہ کو ہند کی روحانی تہذیب میں مرکزی مقام حاصل رہا ہے۔ اور نیشنل کانگریس نے اسی تشبیہ کو گویا ہندوستانی قومیت کی نمود دستور سازی کا قالب قرار دیا چنانچہ کانگریسی جدوجہد میں "قومی دھارے" کی اصطلاح خاص کر سن ۱۹۳۰ء سے مرکزی مقام حاصل کرتی گئی مگر اسی نسبت سے ہندوستانی قومیت کا حصول ناممکن سے ناممکن تر ہوتا گیا۔ اقبال کا الہ آباد کا خطبہ دراصل سالماتی قومیت کے نظریہ کی معرکتہ الارا اور کلاسیکی تشریح ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "ہندوستانی قوم کی وحدت کی تلاش کثرت کی نفی میں نہیں بلکہ اس کثرت کے توافق اور تعاون میں کرنی چاہئے۔ حقیقتیں خواہ وہ کیسی ہی ناگوار معلوم ہوں صحیح تدبر ان کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ عملی راہ یہ نہیں کہ ہم اشیا کی ایسی حالت فرض کریں جو ناپید ہو بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کو ایسا ہی تسلیم کریں جیسے کہ وہ واقعتاً" ہیں۔ پھر اس کے ذریعہ سے خیر کثیر کے لئے کوشش کریں۔" حقیقت یہ ہے کہ وہ کیفیت جسے ایک "قومی دھارا" کہتے ہیں ہندوستان میں وجود ہی نہیں رکھتی تھی چنانچہ نہ تو یہ کبھی مہم جو بادشاہوں کے راستہ میں حائل ہوئی نہ ہی اس نے فرنگی سامراجیت کی مزاحمت کی۔ لیکن بعد از غلامی حصول آزادی کے شعور نے اس کی اہمیت کو واضح کیا کہ حریت کے حصول نیز خود جمہوری اداروں کو چلانے کے لئے ایک عمومی مدنی اتصال و اتحاد ناگزیر شرط ہے۔ اقبال آگے چل کر کہتے ہیں: "اگر ہندوستان میں تعاون کا کوئی موثر اصول دریافت ہو سکا تو یہ اس قدیم سرزمین میں امن اور باہمی خیر سگالی کا باعث ہوگا۔" یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقوام یورپ کی تشکیل پہلے ہوئی اور ان میں جمہوریت بعد میں آئی۔ ذمہ دار اور عوامی نظام سیاست سے بہت پہلے "انگریز" "فرانسیسی" "جرمن" "ولندیزی" وغیرہ اقوام کا وجود ہو چکا تھا۔ چنانچہ قومی شعور کی نمود کے بعد ان میں سلطانی، جمہور کا عہد آیا۔ ہندوستان کی حالت بہت مختلف تھی یہاں کی زرعی معاشرت جس میں ہر گاؤں ایک اکائی تھی انسان کو بالعموم اپنی زمین،

اپنے کھیت، اپنے پیشے اور اپنے گاؤں تک محدود رکھتی تھی۔ اس قصباتی دائرہ سے زیادہ وسیع اس کی زندگی کا کوئی مجلسی دائرہ نہ ہوتا تھا۔ اگر یہاں مختلف زبانوں، مذہبوں اور ثقافتوں کا وجود نہ بھی ہوتا تو بھی ایک قومی دھارا نہ ہوتا۔ ہندوستان کا مسئلہ یہ تھا کہ یہاں پر اجتماعی وحدت کے وسیع تر شعور اور جمہوریت کی ترویج ایک ساتھ ہوئی تھی بلکہ خود جمہوریت اور اس کے اداروں کے ذریعہ ہی سے اس کو وجود میں آنا تھا۔ اس کے مسلسل و متواتر عمل و نفوذ سے وہ وحدت خیال، آہنگ اور تعاون فروغ پاسکتا تھا جو اس سرزمین میں ایسا اجتماعی شعور پیدا کرتا کہ اس کے خوش آئند مستقبل کا ضامن ہوتا۔

کانگریس کی یہ خواب پسندی تھی کہ وہ ایک قومی دھارا فرض کرکے سب کو اس میں بلا رو رعایت ڈال دینا چاہتی تھی اور اس طرح کانگریس کی تدبیر منزل میں محسوس طور پر جمہوریت کی بجائے استبدادیت کی روح کارفرما ہوگئی تھی جس سے فرقہ واریت میں اور زیادہ تناؤ پیدا ہوجاتا تھا۔ چنانچہ اقبال نے کہا کہ "یہ مشاہدہ کرنا بڑا تکلیف دہ ہے کہ ہم آہنگی کے کسی اصول کو دریافت کرنے میں ہماری کوششیں ناکام رہی ہیں۔ وہ کیوں ناکام رہی ہیں؟ شاید اس لئے کہ ہم ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں اور اندر ہی اندر ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں۔" اقبال ایک رجائیت پسند مفکر تھے۔ اسی خطبہ میں انہوں نے آگے چل کر کہا:

"ہماری ناکامیوں کے اسباب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں، میں اب بھی پر امید ہوں کہ حالات کا رخ کسی نہ کسی قسم کے داخلی آہنگ کے پیدا کرنے کی طرف ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے کہ ہندی مسلمانوں کو اپنی ثقافت اور روایات کے خطوط پر اپنے اقطاع وطن میں پورا اور مکمل ترقی کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ اپنا سب کچھ آزادی ہند کے لئے داؤں پر لگادیں۔"

جیسا کہ عرض کیا جاسکا ہے ہندوستان میں جمہوریت کی آمد محض سیاسی مسئلہ نہیں تھی کہ

حکومت کے اداروں کو بہتر بنایا جائے۔ یہاں جمہوریت کا عمل دراصل ایک ایسا مجلسی و مدنی نظام لانے کی کوشش تھی۔ جس میں وہ پیش رفت اور تعاون گردش میں آجائے جو پورے ذیلی براعظم کی تمام آبادیوں کو ایک قوم میں پرو دے۔ اسلامیان ہند کے ارباب فکر نے سنجیدگی سے اس مسئلہ کی طرف توجہ دی اور انہوں نے اس کا حل اس اصول میں دریافت کیا کہ ہر گروہ کو اپنی مخصوص انفرادیت کو مٹائے بغیر جمہوری اداروں کے واسطہ سے قومیت ہند میں مجتمع کیا جائے۔ اس اصول کی نظریاتی تکمیل و تشریح کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ یہ ایسا حیات پرور اصول تھا کہ مختلف اقطاع ہند اور ان کی آبادیاں ایک لڑی میں آسکتے تھے۔ نیز مختلف ملتیں اس سیاسی وحدت میں آسکتی تھیں جن کا تانا بانا اصول جمہوریت و خود ارادیت سے تیار ہوتا تھا۔ سیاسی زاویہ نگاہ سے مسلم مدبرین کو یہ اصول بصورت وفاق نظر آتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں ہی مسلم لیگ نے وفاقیت کو وحدت قومی کی آئینی شکل قرار دیا تھا۔ اقبال کا سن ۱۹۳۰ء کا خطبہ اسی وفاقیت کے تمام امکانات کی شرح و **بسط** پر مشتمل تھا۔ اس میں انہوں نے سالماتی قومیت کو اس کا اصول حرکیت قرار دیا تھا۔ میثاق لکھنؤ سن ۱۹۱۶ء سے نہرو رپورٹ سن ۱۹۲۸ء تک خود کانگریس بھی کسی نہ کسی قسم کی سالمیت سے بے بہرہ نہیں تھی۔ وہ خود بھی اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی چنانچہ نہرو رپورٹ کو سالماتی قومیت کی کانگریس کی جانب سے آخری دستاویز کہا جاسکتا ہے جس میں آبادیوں کا ثقافت و زبان و مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے سے علیحدہ علاقائی وحدت بنانے کا اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کا نقطہ نظر اس کے ایک اقتباس سے ظاہر ہے جس کا حوالہ اقبال نے اپنے اس خطبہ میں دیا تھا۔ "قومیت کے وسیع نقطہ نظر سے اگر یہ کہا جائے کہ فرقہ وارانہ صوبے نہ مشخص کئے جائیں تو یہ ایسا ہے کہ کہا جائے کہ بین الاقوامی نقطہ نظر سے علیحدہ قوموں کا وجود نہیں ہونا چاہئے۔ اس قسم کے ادعات اگرچہ صداقت سے خالی نہیں ہیں مگر بڑے سے بڑا بین الاقوامیت پسند بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہیں

رہ سکتا کہ بلا مکمل قومی خود اختیاری بین الاقوامی ریاست کا حصول ناممکن ہے۔ اسی طرح سے مکمل ثقافتی خود ارادیت کے بغیر..... اور فرقہ واریت اپنے مستحسن پہلوؤں کے لحاظ سے خود ثقافت ہے..... ایک ہم آہنگ قوم کا حصول ناممکن ہے۔" مسلمانوں کی وفاقیت پسندی کی اس سے بہتر وکالت شائد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خطبہ میں اقبال کہتے ہیں کہ "اس طرح سے یہ صاف ظاہر ہے کہ باوجود اس کے کہ ہندوستان میں آب و ہوا، نسلوں، زبانوں، عقائد اور سماجی ڈھانچے کا بے شمار تنوع پایا جاتا ہے خود اختیار ریاستوں کا زبان، نسل تاریخ مذہب اور اقتصادی مفادات کی عینیت کی اساس پر قیام ہی ایک اور صرف ایک راہ ہے جس کے ذریعہ ہندوستان ایک پائیدار دستوری ہیئت اختیار کر سکتا ہے۔" اس ضمن میں یہ قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی دستوری ہیئت ہندوستان کو ایک وحدانی شکل میں نہیں بلکہ نامیاتی کلیت میں تبدیل کر سکتی تھی جہاں ایک متوافق اور متوازن اجتماعیت کا پودا برگ و بار لاتا۔ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو تک کانگریس کے نصب العین میں اس قسم کے عضوی کل کی گنجائش موجود تھی جو ہندوستان کی مختلف لسانی، مذہبی، خطہ واری آبادیوں کو ایک بے رنگ یکسانیت کی بجائے سب رنگ کلیت میں لے آئے۔ اس میں شک نہیں کہ نہرو رپورٹ سے مسلمانوں کو شکایات تھیں مگر وہ اس قسم کی تھیں کہ تھوڑے بہت تغیر و تبدیل سے دور ہو سکتی تھیں۔ سب سے اہم بات اس میں یہ تھی کہ یہ آپس کے سمجھوتے کی ٹھوس بنیاد بن سکتی تھی اس لئے کہ اس میں وسعت قلبی سے ثقافتی، فرقہ واری اور تمدنی بنیادوں پر صوبوں یا ریاستوں کے قیام کو تسلیم کر لیا گیا تھا مگر سن ۱۹۳۰ء کے اجلاس لاہور میں جہاں پنڈت جواہر لال نہرو کو سالانہ صدر بنایا گیا تھا کانگریس نے اس رپورٹ کو راوی برد کر دیا اور ایک مفروضہ "قومی دھارے" میں سب کو جذب کرنے کی بنیاد پر کانگریس کی سیاست کی داغ بیل پڑ گئی۔ اسی دور میں اقبال نے اپنے الہ آباد والے خطبہ کے ذریعہ مسلم نقطہ نظر کی نہ صرف وضاحت و

ترجمانی کی بلکہ اس کی مستحکم نظریاتی اساس واضح کی۔

کانگریسی زعما مخلوط انتخابات کو متحدہ قومیت کے حصول کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ تمام روشن خیال مسلمانوں کا بھی یہی خیال تھا۔ صوبوں کی ثقافتی و لسانی بنیادوں پر تقسیم کے اصول پر زور دیتے ہوئے اقبال نے کہا "اس سے یہ مباحثہ کہ انتخابات فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوں یا مخلوط، غیر ضروری ہو جائے گا۔" انہوں نے مزید فرمایا کہ "مسلمانان ہند کو اس امر میں کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ انتخابات صرف علاقہ واری بنیاد پر ہوں اگر صوبے اس طرح بنائے جائیں کہ ان میں زبان، نسل و ثقافت اور مذہب کی وحدت کی علی العموم یکساں آبادیاں ہوں۔" یہاں اقبال نے ایسی بات کہہ دی کہ جو اس شفیع لیگ کے مسلک کے خلاف تھی جس نے سن ۲۸۔۱۹۲۹ء میں مسلمانوں کی کل جماعتوں کا کنونشن دہلی بلایا تھا اور جس نے فرقہ وارانہ انتخابات کو ہندوستان کی دستوری زندگی نیز آئندہ دستوری سازی کے لئے سنگ بنیاد بنایا تھا اور اس طرح اصل مسلم لیگ سے جس کے قائد جناح تھے رشتہ توڑ لیا تھا۔ شفیع لیگ سرکار پرستوں کے حلقے کی جانب سے قائم ہوئی تھی۔ اس حلقے کا قومی تحریکوں سے بہت کم واسطہ تھا۔ آج تک تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کے مجاہدین اقبال کو اس بات پر دوش دیتے ہیں کہ وہ شفیع لیگ میں شامل ہو گئے تھے اور انہوں نے کل جماعتی کنونشن دہلی سن ۲۹۔۱۹۲۸ء میں شرکت کی تھی۔ اقبال دراصل عملی سیاست داں نہیں تھے۔ وہ اس کنونشن میں ضرور شریک ہوئے لیکن اس کنونشن میں کلکتہ سے واپسی پر محمد علی جوہر بھی شریک ہوئے تھے۔ مگر محمد علی جوہر کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کنونشن اور اجتماع کا ملی تحریک سے کیا ربط ہے اور آزادی ملک سے اس کو کتنی دلچسپی ہے۔ جہاں تک خود اقبال کا تعلق ہے وہ کبھی کنونشن کے بانیوں کے ہاتھ میں نہیں گئے اور تقریباً" ایک سال بعد انہوں نے مذکورہ بالا الہ آباد کے تاریخی خطبہ میں مخلوط انتخابات کی، تائید کر کے گویا اصل مسلم لیگ کی حمایت کی اور آزادی کی جدوجہد

کرنے والے مجاہدین سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علیحدہ انتخابات کبھی عوام کو غیر فرقہ وارانہ انداز میں سوچنے کا موقع نہیں دے سکتے اور ایسی سیاسی جماعتوں کے قیام کو ناممکن بنا دیتے ہیں جن میں تنگ فرقہ واری سطح سے بلند ہو کر عام اور ہمہ گیر مسائل پر انسانی یا ملک گیر سطح پر سوچا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جناح نے ہمیشہ مخلوط انتخابات کی حمایت کی اور اقبال جیسے مفکر نے بھی ان کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اقبال نے اپنی سیاسی زندگی میں عملاً ہمیشہ سرکار پرستوں کو مایوس کیا اور قومی مجاہدین کا ساتھ دیا۔ چنانچہ گول میز کانفرنس کے موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کانفرنس میں جہاں چند اصلی لیڈروں کو مدعو کیا گیا تھا وہاں بہت ہی بھاری تعداد ایسے لوگوں کی بلائی گئی تھی جو ہندوستان میں بدیسی حکمرانوں کے آلہ کار تھے۔ سر فضل حسین نے اقبال کو بھی نامزد کروایا۔ اقبال اگرچہ بہت بڑے سیاسی قائد نہیں تھے مگر ہندوستان میں عظمت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور مسلمانوں میں بہرحال ان کا بہت وزن تھا۔ انہوں نے محمد علی جوہر اور محمد علی جناح کی طرح ایمانداری سے ہندوستان کا نقطہ نظر پیش کیا اور جب انہوں نے کانفرنس کا مایوس کن رنگ دیکھا تو واپس آگئے۔ سر فضل حسین نے جو ان کے طالب علمی کے زمانے میں ہم جماعت اور دوست تھے بڑے تاسف کا اظہار کیا کہ اس شخص کی ترقی کے لئے ہم کوشش کرتے رہتے ہیں اور یہ ہمیں مایوس کرتا رہتا ہے۔ اقبال کے ذاتی ارتقاء میں ان کانفرنسوں کی اہمیت بہت عظیم ہے۔ اقبال کو عمیق نظر سے "سیاسی زندگی" کو جاننے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا موقع ملا اور وہ عظیم سیاسی مفکر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔

بہرحال اقبال کا یہ قطعی خیال کہ صوبوں اور ریاستوں کو کامل خود اختیاری حاصل ہو تاکہ وہ اپنی ثقافت اور روایت اور اخلاقی شعور کے مطابق پھل پھول سکیں اور کل ملک گیر وفاق میں حیات پرور حصہ لے سکیں کہ ان اکائیوں کی ایک وفاقی جمعیت سے جسد اجتماعی کا وہ خمیر

اٹھ سکتا ہے جو گوناگوں نزاکتوں اور امتیازات سے رچا ہوا ہو کر ہم آہنگ قوم پیدا کرے۔ اقبال سے پیشتر مسلم زعما اس اصول کو اقلیتوں کے لئے تحفظات کا نام دیتے تھے۔ اس طرح سے غیر محسوس طور پر وہ اکثریت کو "قومی دھارا" مانے لیتے تھے۔ اقبال کی فکر نے پہلی مرتبہ یہ واضح کیا کہ ہندوستان میں حالات ایسے ہیں جہاں "اکثریت" اور "اقلیت" جیسے تصورات ساقط الاعتبار ہو جاتے ہیں، ان کا کوئی دائرہ اطلاق باقی نہیں رہتا، چنانچہ ان کے ذریعہ سے مدنی صورت گری کا حاصل محض استبدادیت ہے۔ فکر اقبال کی رہنمائی میں ملت اسلامیہ ہندیہ سمجھنے کے قابل ہوئی کہ جہاں ایسے امتیازات اور ممیز آبادیاں ہوں جیسے کہ ہندوستان میں ہیں تو ان کو ایک دوسرے کے مقابلے میں اکثریت و اقلیت قرار دینا ناقابل عبور مشکلات کا باعث ہو کر صرف فساد و نزاع ہی پیدا کر سکتا ہے اس سے قومی یگانگت کا تخیل کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ رفتہ رفتہ اقبال کے ان ہی خیالات نے واضح طور پر اپنے موقف کو مرتب و منظم کر کے اس کو مثبت شکل دی۔

"متوافق قومیت" جس کے لئے مسلم حلقے شروع ہی سے سرگرم عمل تھے چونکہ جمہوریت کی پیداوار تھی اس لئے جمہوریت کے ذریعہ ہی سے حاصل ہو سکتی تھی چنانچہ یہ حلقے ایسے ہندوستان گیر میثاق کو کل قومی ارتقا کی بنیاد قرار دیتے تھے جو ہندو مسلم راضی نامہ کی صورت میں ہو اور جس کو ہر قسم کے دستوری تبدیل و تغیر اور آئینی ردوبدل پر فوقیت حاصل ہو۔ اس قسم کا میثاق عمومی، سوچا سمجھا ہوا کل ہند راضی نامہ ..... یہ مسلمانوں کی تصوریت پسندی یا یوں کہئے عقلیت پسندی تھی۔ محمد علی جناح اس دستوری عقلیت پسندی یا میثاقیت کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ سن ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ ان ہی کی کوششوں کا ثمر تھا۔ دراصل ملت اسلامیہ کے رہنما اس مفروضہ پر کام کر رہے تھے کہ ایک دائمی سمجھوتہ ممکن ہے حالانکہ جماعتوں کے درمیان تمام سمجھوتے عارضی، موقتی یا معیادی ہوا کرتے ہیں، وہ نوا **هيسس** فطرت یا

تاریخ کی خود کار قوتوں کی جگہ نہیں لیا کرتے۔ مسلم قائدین بلاشبہ خلوص سے سمجھوتہ چاہتے تھے مگر واقعتاً" کسی دائمی سمجھوتے یا تصفیہ کا خیال دنیائے تاریخ میں غیر حقیقت پسندی سے زیادہ کچھ مفہوم نہیں رکھتا۔

یہ بڑی زیادتی ہوگی اگر کسی قسم کے سمجھوتہ کو جیسا کہ یہ رہنما چاہتے تھے ایک عام معاہدہ تصور کیا جائے۔ مسلم قائدین فی الحقیقت ایک "معاہدہ عمرانی" کی قسم کے میثاق کے لئے سرگرداں تھے مگر خود معاہدہ عمرانی ایک منطقی مفروضہ ہے جو سماجی اداروں کو عقلی جواز بخشتا ہے۔ از خود یہ معاہدہ اس طرح وجود میں نہیں آیا کہ لوگ یا ان کے نمائندے جمع ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہنے اور اس کے لئے ایک نظم عمرانی کرنے کے لئے راضی نامہ کر لیا ہو۔ اسی وجہ سے معاہدہ عمرانی ایک قانونی فسانہ ہے اور محض ذہنی وجود ہونے کی وجہ سے ناقابل تغیر واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا نئے جمہوری دور اور متحدہ قومیت کے آغاز و انصرام کے لئے مسلم قائدین اسی سطح اور معیار کے معاہدہ کے لئے کوشاں تھے، مگر چونکہ اس قسم کا معاہدہ محض منطقی وجود ہی کا متحمل ہو سکتا ہے سوائے عقلی جواز کے اس کو ناقابل تغیر یا دائمی بنانے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کی ان کاوشوں کو میں نے عقلیت پسندی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ پورا دور مسلم سیاست پر کسی نہ کسی شکل اور درجہ میں سن ۱۹۴۶ء تک چھایا رہا۔

میثاق لکھنؤ سن ۱۹۱۶ء سے مسلمانوں نے ایک فائدہ یہ حاصل کیا کہ سارے ہندوستان کی مجالس قانون ساز میں اقلیتی صوبوں کی حد تک ان کا پاسنگ بڑھ گیا کانگریس اور دوسری غیر مسلم جماعتوں سے اپنے لئے علیحدہ انتخابات کا حق منظور کروایا مگر ان کے پاس صرف دو اکثریتی صوبے تھے اس پاسنگ کے عوض ان صوبوں میں اپنی اکثریت قربان کر دی۔ بنگال میں اقلیت میں آگئے اور پنجاب میں محض مساوات پر۔ اس طرح سے وہ خود ہی پورے ملک میں خود

ساختہ اقلیت بن گئے۔

لیکن بہرحال یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بڑی سیاسی جماعتوں کے اس معاہدہ کے بعد پورے ملک میں ایک خوشگوار فضا قائم ہو گئی اور خلافت و سوراج کی تحریکیں ۲۱-۱۹۲۰ء میں ایسا دور لے آئیں کہ معلوم ہتا تھا کہ اختلاف ثقافت و مذہب کے باوجود ایک ہی روح ہے جو سارے عوام میں جاری و ساری ہے اور وہ ہے روح ہند۔ محض باہمی خیر سگالی کے ذریعہ جس میں کوئی لین تھا نہ دین ایسا عظیم اور ملک گیر اتحاد اس خطہ زمین کی چار ہزار سالہ تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا مگر اس اتحاد میں ایک دشنہ بھی پنہاں تھا جس نے اس کے سارے وجود کو آئندہ پارہ پارہ کر دیا۔ ملک کی سیاست میں اب تک مذہب کو دخل نہیں تھا۔ مسلمانوں نے خلافت کی تحریک مذہب کی بنا پر چلائی اور ہندوؤں نے ان سے تعاون کیا۔ مسلمانوں نے اپنی طرف سے گاؤ کشی پر پابندی لگانا بخوشی منظور کیا اور پھر سوراج کو بھی اس تحریک میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح سے خلافت سوراج تحریکیں ایک ساتھ سارے ہندوستان میں چلیں چنانچہ ہر گروہ کا اپنا اپنا مذہب اس تعاون کی بنیاد تھا۔ یہ نیم سیاسی مذہبی فضا تھی جو ساری ملت پر چھا گئی۔

اس اتحاد میں ایک ماورائیت تھی۔ تمام رعایتوں' تنازعوں' تقاضوں اور حقیقتوں سے بلند یہ ایسا ہی ماورئی اتحاد تھا جیسا صوفیانہ حال جس میں کوئی "سدھ" نہ ہو۔ اس کا مادہ محض "باہمی خیر سگالی" کا سریاں تھا۔ خیر سگالی ایک جذبہ بن سکتی ہے مگر جب حال سے انسان قال میں لوٹتا ہے تو اس وقت ماورائیت' بے غرضی اور خلوص ٹھوس باتوں کا جواب نہیں ہوتے۔ روح وحدت کی بے مثال پرواز کے اس خلافتی۔ سوراجی دور میں دنیائے حقیقت جوں کی توں تھی صرف جذبہ کی تاثیر سے ہندی عوام ایک جان دو قالب بلکہ ایک جان و ایک قالب ہو گئے تھے۔

اصلی اور حقیقی اتحاد روز مرہ کی زندگی میں اتحاد ہے۔ یہ باہمی تعامل و کشمکش میں ہم آہنگی

پیدا کرنے سے عبارت ہوتا ہے۔ جب مختلف وجوہات سے تحریکیں کمزور پڑ گئیں یا واپس لے لی گئیں تو عوام روزانہ کی زندگی میں لوٹ آئے۔ یہ زندگی جس میں زبانوں، ذاتوں، رہن سہن، ثقافتوں اور علاقوں کے فصل تھے۔ یہ حقیقی دنیا تقسیم و افتراق کی دنیا تھی۔ اس دنیا میں صرف حقائق کی بنیاد پر ہی اتحاد پیدا کیا جا سکتا تھا۔

سیاسی قائدین سیاسی سمجھوتے کو اس کا حل سمجھتے تھے لیکن ہر سیاسی سمجھوتہ صرف اس وقت تک قیمت رکھتا ہے جب تک وہ سیاسی جماعتیں جنہوں نے اس کو اختراع کیا تھا عوام میں مقبول ہوں یا جب تک کہ وہ جماعتیں اپنی حکمت عملی میں تبدیلی نہ کریں۔ جب عوام میں ان کی مقبولیت گھٹ جاتی ہے یا ان کی حکمت عملی میں فرق آجاتا ہے تو اس کی کوئی ضمانت نہیں رہتی کہ وہ سمجھوتہ قائم رہے گا۔ اس لئے سیاسی سمجھوتہ کبھی اس معاہدہ عمرانی کی جگہ نہیں لے سکتا جو عقلی مفکرین یا رومان پسندوں کے نزدیک پر کشش نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب مظاہرے ختم ہو گئے اور حالات معمول پر آگئے تو مسلمانوں میں لکھنؤ پیکٹ سے بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ سوامی شردھانند وائسرائے سے مل کر آئے اور انہوں نے یہ تحریکیں شروع کر دیں۔ عوام مذہب کے لئے قربانی دینا خلافتی و سوراجی دور میں سیکھ چکے تھے اس لئے دونوں تحریکیں خوب چلیں اور یہ دونوں ہی مسلمانوں کے خلاف چلائی گئیں۔ اگر شدھی کا مقصد صرف تبلیغ ہوتا اور سنگٹھن کا مقصد صرف فوجی جذبہ اور فوجی تربیت ہوتی تو غالباً" مسلمانوں کو اعتراض نہ ہوتا مگر یہ تحریکیں صرف نفرت، مسلمانوں سے نفرت اور ان کو نیچا دکھانے کے لئے چلائی گئیں۔ نتیجہ ہوا کہ فرقہ واریت تیز ہوئی۔ آپس کے فاصلے بڑھ گئے اور بڑھ کر دشمنی میں تبدیل ہو گئے اور یہاں وہاں جگہ جگہ بلوے اور فساد ہونے لگے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے صرف جمہوریت اور اس کے اداروں میں مسلسل وجود میں آنے والے باہمی تعامل کے ذریعہ سے ان بٹے ہوئے آدمیوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جو عوامی قائدین قومی سطح پر سوچتے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ "فرقہ وارانہ انتخاب" اس عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ عوام کے نمائندے فرقہ وارانہ بنیادوں پر منتخب ہوتے ہیں۔ اس بنا پر سیاسی پیش رفت میں مختلف مذہبی ولسانی گروہوں کو آپس میں تعامل کا موقع نہیں ملتا نیز ان انتخابات سے یہ شبہ ملتی ہے کہ امیدوار یا سیاسی جماعتیں فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار کر ووٹ حاصل کریں چنانچہ ۲۸۔۱۹۲۷ء تک قومی رہنما اس نتیجہ تک قطعی طور پر پہنچ گئے کہ اس رکاوٹ کو دور کر کے مخلوط انتخابات رائج کرنا چاہئے۔

مخلوط انتخابات کے لئے ایسے ضابطہ کی تلاش جو سب کے لئے قابل اطمینان ہو جناح کا اس زمانہ میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس ضابطہ کی ہیئت اگرچہ تصوریت پر قائم تھی مگر اس کے مافیہ میں حقیقت پسندی کا بھی بڑا عنصر شامل تھا۔ جناح تجاویز میں یہ تھا کہ اگر مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کا آبادی نیز کسی قدر پاسنگ کے ساتھ تحفظ کر دیا جائے تو مسلمان مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے بشرطیکہ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے لحاظ سے ان کی نشستیں اس طرح محفوظ کر دی جائیں کہ وہاں پر ان کی اکثریت میں فرق نہ آئے نیز مرکزی مقننہ میں ان کے لئے ایک تہائی نشستوں کا تحفظ ہو۔ ۱۹۲۷ء میں کانگریس نے ان تجاویز کو منظور کر لیا۔ یوں سمجھئے کہ میثاق لکھنؤ کے بعد یہ دوسرا میثاق وجود میں آیا۔

مخلوط انتخابات کی یہ تجویز سچ پوچھئے تو سالماتی یا کثیر الاضلاعی قومیت کی طرف بہت بڑا اقدام تھا۔ اس کی کثیر الجواہری ہیئت قائمہ میں مسلمانوں کی نشستوں کے تحفظ سے مسلمانان ہند کے ملی و انفرادی وجود کی صیانت کا بندوبست تھا اور مخلوط انتخابات کے ذریعہ سیاسی پیش رفت کی بنا

ڈال کر مشترکہ قومیت کے حصول کا موقع نکلتا تھا۔ ان انتخابات کا تیسرا پہلو مدنی توازن تھا۔ اگر مختلف صوبوں یا ریاستوں میں مسلمان اقلیت میں نمائندگی پاتے تھے تو چند ایک میں اکثریت میں بھی آتے تھے۔ اس طرح سے اگر مسلمان اپنے آپ کو ملت واحدہ جانیں تو پورے ملک میں وہ دو متضاد یا متخالف موقف میں تھے اور اس طرح بحیثیت مجموعی بربنائے حالات اعتدال اور افہام و تفہیم کی راہ اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ یہی حال ہندوؤں کا بھی تھا۔ اور یہ سب بر بنائے آبادی اور علاقہ واری نمائندگی تھا۔ اس طرح سے جو قومیت وجود میں آسکتی تھی وہ "قومی دھارا والی" ہونے کی بجائے "باہمی توازن والی" قومیت ہوتی۔ جناح نے اپنی ان تجاویز کے ذریعہ، جن کے اندر مخلوط انتخاب کے یہ سب پہلو ایک دوسرے سے لاینفک طور پر منسلک تھے، ایک حقیقی اور واقعاتی قومیت کے ارتقاء کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ ان تجاویز میں نکتہ کی بات یہ تھی کہ خالی خولی "معاہدہ عمرانی" کو نہیں بلکہ "طاقتوں کے توازن" کو معاشرتی اور قومی نظم کی اساس بنایا گیا تھا۔ یوں خیال کیجئے کہ اس طرح مسلم سیاست جناح کی قیادت میں سیاسی جماعتوں کے سمجھوتے کی بجائے آہستہ آہستہ "طاقتوں کے توازن" والی حقیقت کی طرف چل پڑی۔ جناح اسی دور میں سفیر امن کے خطاب سے یاد کئے گئے۔ سن ۱۹۲۷ء کے میثاق کے ایک سال بعد نہرو کمیٹی نے ہندوستان کا کل جماعتی بنیاد پر دستور تیار کیا۔ اس نے مسلم اکثریتی صوبوں کی تشکیل منظور کر لی، مگر مخلوط انتخابات سے مختلف گروہوں کی نشستوں کے تحفظ کا اصول خارج کر دیا نیز مرکز میں سب کو صرف آبادی کے لحاظ سے نشستیں دینے کے اصول کو ملحوظ رکھا۔ یہ سن ۱۹۲۷ء کے میثاق کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔ اس تاریخی واقعہ سے سیاسی جماعتوں کے سمجھوتے کی بے وقعتی سامنے آتی ہے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمجھوتے خواہ کتنے ہی معقول دلائل سے کئے جائیں "طاقت" اور اس کے "توازن" کی جگہ نہیں لے سکتے۔

اگر سن ۱۹۲۷ء کا میثاق مسلم سیاسیات میں توازن طاقت کے اسی اصول کی طرف پہلا قدم تھا تو اقبال کا خطبہ سن ۱۹۳۰ء دوسرا بڑا موثر قدم تھا۔ اس میں انہوں نے نہایت مدلل طور پر بتایا تھا کہ اتحاد کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے شمال مغربی ریاست کی تشکیل کو جس میں بلحاظ آبادی مسلمان اکثریت میں ہوں ناگزیر قرار دیا۔ اقبال کا خیال تھا کہ یہ ریاست وفاقی ہند میں ایسے سیاسی توازن کا باعث ہوگی جس میں ہر فریق کے غلبہ و استیلا کی تعدیل ہو سکے گی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "کل جماعتی مسلم کانفرنس دہلی کا مطالبہ کہ ہند کے حدود میں ایک مسلم ہند وجود میں آئے بالکل درست ہے۔ وہ اسی ہم آہنگ قومیت کے شریفانہ جذبہ کی پیداوار ہے جو اپنی **تشکیلی** اکائیوں کی فردیت کو نہیں کچلتی بلکہ انہیں ابھرنے اور اپنے وجود کے امکانات کو روبہ کار لانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ایوان اس قرارداد کی تائید کرے گا۔ بلکہ میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان ایک واحد ریاست میں ضم ہوجائیں۔" اقبال نے اس طرح وفاق ہند کے دائرہ میں وحدت مغربی پاکستان کا تصور پیش کیا جس کا عملی جامہ پہننا قیام پاکستان کے بعد ممکن ہو سکا اور متذکرہ بالا تمام صوبے ایک واحد صوبے کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہاں تک کہا کہ "حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے حدود کے اندر حاصل ہو یا اس سے باہر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مربوط شمال مغربی مسلم ریاست مسلمانوں بالخصوص شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں کی قطعی تقدیر معلوم ہوتی ہے۔" "یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی مگر اس نے یہ کہہ کر مسترد کردی کہ اس کو عملی جامہ پہنایا گیا تو ایک ناقابل انتظام وسیع ریاست قائم ہوجائے گی۔" اس سلسلہ میں واضح رہے کہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں دستوری و آئینی تجاویز کے اندر وفاق میں شامل اکائیوں کے لئے ریاست کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ اقبال نے نہرو کمیٹی کے اس

استرداد کے بارے میں یوں تبصرہ کیا کہ "اگر ریاست کے رقبہ کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات درست ہے مگر جہاں تک آبادی کا تعلق ہے یہ ہند کے کئی دوسرے موجودہ صوبوں کی آبادیوں سے کم ہے۔" اس صوبہ یا ریاست کے وجود کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "اس کے تصور سے ہندوؤں یا انگریزوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے بحیثیت ایک تمدنی قوت اسلام کی زندگی کا یہاں بڑی حد تک مدار اس کے ایک مخصوص خطے میں ارتکاز پذیر ہو جانے پر ہے۔"

قوت کے توازن کے تصور کو اقبال نے اس طرح بہت بین طور پر واضح کیا۔ ہند کی دستوری سیاست میں واقعتاً" یہ ایک بڑی اختراع اور نیا وجدان تھا جس میں معاہدوں اور میثاقوں کی بجائے تمدنی و سیاسی قوتوں کے توازن پر آئندہ دستوری نظام کا رخ معین کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ ان کے نظریہ کے مطابق مسلمانوں کی قوت کا ہندوستان کے ایک بڑے خطے یعنی شمال مغربی ہندوستان میں ارتکاز سے وفاق ہند میں ایک ایسا توازن قوت پیدا ہوتا جس کے بعد نہ تو ہندوؤں سے مسلمانوں کو نہ ہی مسلمانوں کو ہندوؤں سے ڈر لگتا۔ نیز اس کے بعد یا اس کے ذریعہ سے یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ محض آبادی کی بنیاد پر انتخابات کے اصول پر عمل در آمد کر کے شریفانہ قومیت کو مقرون حقیقت بنایا جائے۔ خود شریفانہ قومیت کے تصور کو اقبال نے بہت عمیق اور بلیغ بنا دیا اور اس طرح ہند کے سیاسی و مدنی افکار میں اضافہ کا باعث ہوئے۔ انہوں نے اس کو منفی احساسات و عاطفات سے پاک کر کے مثبت جذبات و محرکات پر استوار کیا۔

ہندو اور مسلم زعما "متوافق قومت" کو صرف خوف اور عدم اعتماد کا مداوا سمجھتے تھے۔ ان کی دانست میں متوافق قومیت ناخوشگوار حالات میں "وحدانی قومیت" کا ثانوی بدل تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ باشندگان ہند میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں اور مختلف گروہوں میں بے اعتمادی کی فضا ہے اس لئے وحدانی قومیت فی الحال ناقابل عمل ہے۔

اس کا بدل صرف وفاقی قومیت فراہم کر سکتی ہے جس میں تحفظات کے وسیع نظام کے ذریعہ ایسی خوشگوار فضا پیدا کی جاسکتی ہے جو رفتہ رفتہ وحدانی قومیت کی تخم ریزی کرے۔ چنانچہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہند کے باسی رفتہ رفتہ قومیت شناس ہوتے جارہے ہیں۔ اس قومیت شناسی کی اولین منزل وفاقی قومیت ہے اور نہایت وحدانی قومیت۔ اقبال کی فکر نے اس خیال کا ابطال کیا۔ وفاقی قومیت کو ثانوی یا عبوری منزل قرار دینے کی بجائے انہوں نے اس کو قومیت کی آخری، اعلیٰ اور ارفع منزل قرار دیا جسکی بنیاد ڈر، خوف، تعصب یا بے اعتمادی جیسے عارضی جذبات پر نہیں بلکہ مثبت عاطفات، عالیہ محرکات اور شریف جذبات پر ہے۔ ہر ملت، ہر امتیازی جماعت یا آبادی خواہ مذہبی ہو لسانی ہو یا علاقائی مثبت حیات کے داعیہ سے منور ہے۔ اس کے اپنے امکانات وجود ہیں جو اس کو مستمر رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کی اپنی عینیت، منفرد ثقافت، مخصوص تاریخ ہوتی ہے، اس کی اپنی گہرائیاں ہوتی ہیں اور اپنے باطن کے شعور سے اس کی ہستی جگمگاتی ہے۔ جب تک اس کی ذات میں اپنے وجود کا التزام ہے اس میں عمرانی خلاقیت موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کو اپنی "اجتماعی خودی" کے لئے نئے نئے تجربات کر کے روحانیت، اخلاقیات، مودت، مروت، انسانی فلاح و بہبود کے نئے نئے تجربات کا موقع ملتا رہنا چاہئے۔ وفاقیت اس طرح کی زندہ منفرد آبادیوں کی مربوط اور حرکی تنظیم ہے۔ چنانچہ وفاقی قومیت ہی ہندوستان کی خلاق قوتوں کا سرچشمہ بن سکتی تھی کہ اس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف وحدانی قومیت سراسر شکست و تخریب پر قائم ہے۔ یہ ایک منفی رویہ ہے جو ہر گروہ کا قاتل ہے اور مدنیت کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کا مستقبل بھیانک ہے اور انجام کار پورے ملک کی روحانی خودکشی ہے۔

اقبال ہندو سماج کی باطنی قوتوں سے واقف تھے۔ جاوید نامہ میں روح ہند بھی ہے اور ہندی رشی کے ارشادات بھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو سماج اپنی باطنی قوتوں کو روبہ کار لائے اور اپنی ثقافتی قوتوں کو مثبت انداز میں مستقبل کی صورت گری کی طرف متوجہ کرے۔ اس پر ان کی بھرپور تنقیدیں ہیں مگر ان کا ہدف اس کا موجودہ ڈھانچہ ہے اس کے مثبت تغیر اور اس میں سے شریف انسانیت کی نمود سے وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے ان کے موجودہ سماجی ڈھانچہ پر اس سے بھی زیادہ سخت تنقیدیں کیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسلام اپنا اطلاق چاہتا ہے، مسلمانوں کو اس کے عمرانی مضمرات واضح کر کے دنیا کے سامنے لانے ہیں، اس کا اپنا سماجی انصاف کا نظام ہے۔ چنانچہ وفاق ہند میں ایک بڑی ریاست، شمال مغربی مسلم ریاست، کی تجویز سے ان کا منشا جہاں توازن قوت پیدا کرنا تھا وہاں اس سے بھی بلند مقصد ان کے پیش نظر تھا اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تمدنی خودی کے نئے سرے سے وجدان کا موقع ملے وہ خود شناسی کی منزل میں قدم رکھیں اور اسلامی نظام حیات، طرز معیشت، اور عدل عمرانی کا تجربہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اقبال کے ہاں کثیر المراکز وفاقی قومیت کا نقشہ کچھ اس طرح تھا کہ وفاق کے ایک حصہ میں مسلمان اپنی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو آزمارہے ہیں اور ہندو، اپنی نیشدھ اور بھگوت گیتا کے وارث، دوسرے حصوں میں۔ اس طرح سے پورا وفاق ہند اپنی اخلاقی قوتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کو نئے نئے تجربات سے مالا مال کر رہا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے قیام کے بعد اقبال کے خیالات از کار رفتہ نہیں ہو گئے۔ دونوں مملکتوں میں موقع ہے کہ عوامی قیادت اپنے اپنے ہاں اقبال کے نظریات کی روشنی میں قومی استحکام پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ بات ہو جائے تو یہ برصغیر سماجی و اخلاقی قوتوں کی خلاقیت کی سب سے بڑی تجربہ گاہ ہو گا جہاں سے انسانوں کو نئی راہیں اور نئی منزلیں مل سکتی ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے اقبال

کے افکار سے عملی زندگی کی راہیں متعین ہوتی تھیں اور اب بھی ہو سکتی ہیں۔

اپنے ان نئے نظریات کے سبب اقبال پنڈت جواہر لال نہرو کے سوشلزم کو پورے ہند کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔ جواہر لال نہرو کی سوشلزم ہند کے عظیم الشان امکانات کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھی ان کی اشتراکیت بس اتنی ہی تھی کہ سب مسئلوں کی تہہ میں اقتصادی مسئلہ ہے۔ اہل ہند میں جو باہم اختلافات اور امتیازات پائے جاتے ہیں وہ تاریخ ساز قوتوں کی وجہ سے نہیں ہیں اور نہ ہی مثبت آدرشوں اور محرکات پر مبنی ہیں بلکہ وہ محض اقتصادی ناہمواری اور مسابقت کی وجہ سے ہیں۔ ہندوستان میں عدم اعتماد اور نفرت جو مختلف آبادیوں میں ایک دوسرے کے بارے میں پائی جاتی تھی ایک عبوری بات ہو سکتی تھی لیکن نہرو اس کو اصلی بات سمجھ کر ایک اچھی معاشی پالیسی کو اس کا علاج تصور کرتے تھے۔ مگر بات صرف اتنی نہ تھی، بہت تہہ دار تھی۔ ہر جماعت ایک بھرپور ماضی کی وارث تھی۔ ہر گروہ ایک خاص اخلاقی قوت کا نشان تھا اور مستقبل کے لئے عظیم امکانات کا حامل تھا۔ نہرو نے ہندوستان کی اخلاقی و روحانی قوتوں کے مختلف سرچشموں اور ان کی منفرد حیثیتوں کے تاریخی و عینی پس منظر کی اہمیت محسوس نہیں کی اور نہ ان کے مختلف امکانات کا پورے طور پر جائزہ لیا۔ اس لئے ان کی تشخیص اور خیالات کو اقبال بڑی تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے۔

نہرو کا اپنے خیالات میں غلو کا یہ عالم تھا کہ انہیں محض تعصب کے علاوہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا کوئی جاندار پہلو نظر نہ آتا تھا۔ بس ایک مضبوط معاشی حکمت عملی یا منصوبہ بندی کی انہیں دھن تھی جس کے لئے مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالباً" اسی لئے وہ ایک قومی دھارا والی سیاست پر چل پڑے۔ اپنی دانست میں وہ یہ سمجھے کہ میں ایک "اقتصادی قومیت" کی طرح اندازی کر رہا ہوں۔ ان کی یہی سیاست کہ ہند میں سب ایک ہیں۔ ایک دوسرے کی طرح ہیں انہیں صرف معاشی یوجناؤں (منصوبوں) کی ضرورت ہے، ہند کی آئندہ

سیاست اور موجودہ عمرانی، مدنی اور فرقہ وارانہ نزاع کا باعث ہوئی۔

وفاقی یا نامیاتی قومیت، ان کی "اقتصادی قومیت" کے برخلاف ایک حقیقت پسندانہ رویہ تھا جس میں ایک طرف عارضی تعصّبات و تنگ نظری اور تنگ انسانیت قسم کے تعاملات کے خلاف قوت کے اصول کی تعمیل تھی تو دوسری طرف تمام اخلاقی و روحانی انفرادیوں کی رعایت تھی جس سے ایک شریفانہ مدنی تعامل ناشی ہو سکتا تھا۔ اس نامیاتی قومیت کی لازمی شکل ایک ایسی دستوری ہیئت تھی جس میں مرکز کے پاس بین الریاستی امور ہوں اور باقی تمام شعبے اور اختیارات وفاق میں شامل اکائیوں یا ریاستوں کے پاس ہوں۔ مسلم سیاستدان اس وفاقی آئین کو ناگزیر جان چکے تھے۔ چنانچہ سن ۱۹۲۴ء سے وہ اسی انداز میں سوچ رہے تھے جب مسلم لیگ نے اس کے بارے میں ایک قرارداد پاس کی تھی۔ سن ۱۹۲۸ء میں کل جماعتی موتمر (کلکتہ کنونشن) میں جناح نے نہرو رپورٹ پر یہ ترمیم پیش کی کہ جو محکمے وفاق کے لئے بیان کئے گئے ہیں ان کے علاوہ تمام امور پر اختیارات وفاقی ریاستوں کے لئے گردانے جائیں۔ اس موتمر نے ان کی دیگر تجاویز کی طرح اس کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ اقبال کے تاریخی خطبہ کا باقی حصہ اسی مسئلہ سے متعلق تھا اور صاف صاف انہوں نے بیان کیا کہ ہندوستان کی آئندہ ہیئت میں وفاقی ریاستوں کے لئے تمام **مابقٰی** اختیارات تسلیم کر لئے جائیں۔ صرف اسی سے طاقت کا وہ توازن پیدا ہو سکتا ہے جو حقائق کے مطابق ہے اور غلبہ و استیلا کی فرقہ وارانہ کوششوں کا توڑ ہے۔ نیز اسی اصول کے ذریعہ تمام وفاقی ریاستوں کو اپنے روحانی ورثہ کی بنیاد پر پروان چڑھنے کا موقع مل سکتا ہے۔

سن ۱۹۳۰ء میں نہرو رپورٹ کو دریا برد کر دینے کے بعد طاقتور مرکزی حکومت گویا کانگریس کا بنیادی نصب العین بن گئی۔ اس طرح سے مسلم قیادت اور کانگریس دونوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں پایا۔ دستوری سطح پر یہ ایک جنگ تھی جو دو مکاتب

خیال کی جنگ معلوم ہوتی تھی۔ کانگریس بااختیار مرکز کی حامی تھی اور مسلمان خودمختار ریاستوں کے۔ بااختیار مرکز سے مراد ایسی وفاقی حکومت تھی جس کے پاس وہ تمام اختیارات ہوں جو وفاقی ریاستوں کو تفویض نہ کئے گئے ہوں۔ جب کہ خود مختار صوبوں یا ریاستوں سے مراد ایسی وفاقی اکائیاں تھیں جن کے پاس وہ اختیارات ہوں جو بین الریاستی امور کے زمرہ میں نہ آتے ہوں۔ کانگریس سندھ کی علیحدگی، سرحد میں اصلاحات وغیرہ کی حمایت کرتی تھی، اس کا رویہ مسلم صوبوں کے قیام کے بارے میں الغرض ہمدردانہ تھا۔ مگر بااختیار مرکز سے نیچے آنے کو وہ تیار نہ ہوتی تھی۔ فرقہ واری مسئلہ کے حل کے لئے اس طرح وہ ایک مقتدر مرکز کے گرد لسانی و تمدنی و مذہبی بنیادوں پر ریاستوں کے قیام کو کافی سمجھتی تھی۔ مگر اس صورت میں مقتدر مرکز کے سامنے ریاستوں کی اہمیت سوائے کاغذی پیرہن کے کچھ نہیں رہتی جس کو پہن کر لوگ مرکز کے پاس آیا کریں۔ چنانچہ سن ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد مسلم زعما نے مبینہ طور پر اپنی دستوری منزل فعال ریاستوں یا صوبوں کا قیام قرار دیا کہ صرف اس اصول پر کل ہند وفاق وجود میں آئے۔

بااختیار مرکز کو قومی نصب العین قرار دے کر گویا کانگریس نے نامیاتی قومیت کو بے اثر بنا دیا تھا اور مقرون طور پر وحدانی قومیت کو اپنا لیا تھا۔ جس کے صاف معنی یہ تھے کہ جس گروہ کی مرکز میں اکثریت ہو وہی پورے ہندوستان کا اصلی اور حقیقی مالک ہوگا۔ اس طرح سے اس دھارمک سیاست میں اتحاد کی بجائے افتراق کا بھرپور انتظام ہوگیا۔ چنانچہ کانگریس کی سیاست کاری تنگ نظر ہندوؤں کا شیوالہ بن گئی اور روشن خیال مسلمان اس سے سخت بددل ہونے لگے۔ یہ سن ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کی سیاست بالخصوص سن ۱۹۳۷ کی سیاست کا خصوصی رجحان تھا۔

کانگریس کے نقطہ نظر سے قومی دھارا عوام کی امنگوں سے عبارت معلوم ہوتا تھا جو معاشی

شعور پر مبنی ہو سکتا تھا لیکن چونکہ عوام میں معاشی شعور کی کمی تھی اس قسم کی امنگوں کا زندگی میں فعال ہونا صرف ہوائی بات تھی۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ قومی دھارا جس کے آگے پیچھے کوئی اور سماجی مواد نہ تھا سوائے اس ٹھوس حقیقت کے کچھ نہ ہو سکتا تھا کہ لوگ اسے ایک زبان بولنے، ایک قسم کے تہوار منانے، ایک طرح کے رواج، میل جول، لوک ریت وغیرہ وغیرہ سے تعبیر کریں۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ غالب آبادی کے تمدنی پھیلاؤ میں سب تمدن غائب ہو جائیں اور اسی کے سماجی سیلاب میں بہہ جائیں۔ چنانچہ ایک قومی دھارے کی تحریک ملک گیر، جارحیت پسند ہندویت کی علامت بن گئی۔ اس طرح اندر ہی اندر کانگریس مہاسبھائی ذہنیت کے لوگوں کا اڈا بن گئی۔ ایک ''اقتصادی قومیت'' کے جنم دینے کی کوشش میں کانگریس نے یوں مہاسبھائی قومیت کے عفریت کو پروان چڑھایا جس کے سامنے گاندھی جی اور نہرو جی بھی بعد میں بے بس ہو گئے۔ کانگریس نے تطہیر کی کوشش نہیں کی۔ ''اقتصادی قومیت'' کے تصوری خاکے کے پیچھے اس نے ہندو تہذیب کی روحانی قدروں کو واضح کر کے عوام کے سامنے پیش کرنے کی کبھی پروا نہیں کی کیونکہ اس سے اس کے ہر مذہب و ملت وغیرہ سے بالا ہونے کے نام پر بٹا لگتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو عوام جن میں اپنے ملی وجود کے اثبات کے لئے بے قراری تھی تشنہ کام رہ گئے اور محض جارحیت و نفرت کے عاطفات کو مہابھارت کا احیا سمجھ بیٹھے۔ گاندھی جی کبھی کبھی رام راج کا ذکر کرتے تھے مگر کانگریسی مفکرین نے اس کے عمیق تصورات کو واضح کرنے اور عوام میں عام کرنے کا بیڑا نہیں اٹھایا یہ سن ۱۹۳۷ء تک کے حالات ہیں۔ اس دور میں اقبال کے خیالات نے ایسی فضا مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی کہ اسلامی نظام حیات پر غور کرنے کی ان میں لگن پیدا ہوئی اور مسلم دانشوروں کا ایک بڑا حصہ اس کام میں لگ گیا کہ اسلام کی روحانیت کو واضح کریں۔ اس اعتبار سے مسلم عوام فرقہ واریت کی شریفانہ منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس کا آئندہ فائدہ یہ ہوا کہ تقسیم

ہند کے ابتدائی جنونی دور کے بعد پاکستان میں فرقہ واری صورت حال قابل فخر رہی۔ کم از کم ایسے بلوے اور فسادات نہیں ہوئے جو بدقسمتی سے ہندوستان کی روز مرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ اس کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب سن ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے لباس میں مہاسبھائی ذہنیت کے افراد چلتے پھرتے نظر آئے اور انہوں نے پنچائیت سے لے کر بلدیہ اور بلدیہ سے لے کر صوبائی حکومت تک ایسے ایسے کام کیے کہ ہر طرف مسلمان بلبلا اٹھے۔ کانگریس کی پوری تنظیم میں ہر طرف نیچے سے ثانوی بلکہ صوبائی سطح تک ایسے افراد چھا گئے تھے جنہیں خود کانگریس کے نظریہ حیات کی لاج نہ تھی۔ اس پر بھی کانگریس نے اپنے داخلی تزکیہ کی بجائے کوشش یہ کی کہ مسلمانوں میں کانگریس اور اس کے نصب العین کو مقبول بنایا جائے۔ مشکل سے کوئی عام مسلمان ایسا ہوگا جس کو کانگریس کے ان مقاصد سے اختلاف ہو کہ ملک آزاد ہو' کسانوں اور مزدوروں کی بہبود کے لئے کام کئے جائیں اور صنعتی ترقی دی جائے۔ یہ معاشی شعور تھا اور اسی پر کانگریس سارے لوگوں کو متحد کرنے کی مدعی تھی مگر توجہ اس نے زیادہ تر مسلمانوں پر دی کہ ان ہی میں یہ شعور جگایا جائے۔ ہندوؤں کی حد تک وہ اس سے مطمئن تھی کہ اسے ان کے اندر مقبولیت حاصل تھی۔ چنانچہ اپنی اس پالیسی کے تحت اس نے یہ کوشش بڑے پیمانے پر شروع کی کہ مسلمانوں کو براہ راست کانگریس میں لایا جائے۔ ہندوستانی عوام کو وہ متجانس بنا کر ایک ہی پلیٹ فارم پر اکھٹا کرنا چاہتی تھی۔ ۱۹ مارچ سن ۱۹۳۷ء اس برصغیر کی تاریخ میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ تمام کانگریس اراکین اسمبلی کا آل انڈیا نیشنل کنونشن طلب کر کے نہرو نے کہا: "تعجب ہے کہ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلمانوں کو علیحدہ گروہ تصور کر کے ہندوؤں سے سمجھوتے کا خواب دیکھتے ہیں۔ یہ انداز فکر قرون وسطٰی میں رائج ہو تو ہو موجودہ زمانے میں اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ آج کل ہر چیز پر اقتصادی نقطہ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک افلاس' بے کاری اور قومی آزادی کا سوال

ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور مسیحوں میں کوئی فرق نہیں چوٹی کے فرقہ پرست لیڈر ہر وقت حصے بخرے اور بٹوارے کی باتیں کرتے ہیں ہمیں تو وہی مشترکہ مسائل کارفرما نظر آتے ہیں۔"

اقبال نے ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو اس کے رد عمل کے طور پر جناح کو لکھا: "بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون پر آمادہ ہیں لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بڑی حد تک خود ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تنظیم پر ہے ... آل انڈیا نیشنل کنونشن کا جواب دینا بہت ضروری ہے آپ کو چاہئے کہ فوراً" ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں اس میں یہ حقیقت بیان کریں کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ ہستی کے مالک ہیں.."

جون سن ۱۹۳۷ء کو انہوں نے ایک اور معرکتہ الارا خط لکھا: "میں سمجھتا ہوں کہ نیا آئین جس کی رو سے ہندوستان میں ایک متحدہ فیڈریشن قائم ہوگا بالکل مایوس کن ہے ..... جب تک مسلم اکثریت کے صوبوں کا علیحدہ فیڈریشن قائم نہ ہو ہندوستان میں امن قائم نہیں رہ سکتا .... ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ بحالت موجودہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دیں۔ اکثریت اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے باہمی مفاد کے لئے یہ بہترین طرز عمل ثابت ہوگا۔" یہ خط بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل اس خط میں نہ کہ سن ۱۹۳۰ء کے خطبہ میں اقبال نے پاکستان کی تجویز پیش کی۔ اس میں اقبال نے سن ۱۹۳۵ء کے آئین کا تجربہ کیا تھا اور اس کے سیاسی مضمرات واضح کر کے فلسفیانہ بصیرت سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ فیڈرل بی اسکیم ضرور نافذ ہوگی اور مسلمانوں کو اس کے لئے ہندوستان میں دو فیڈریشن کا مطالبہ کرنا چاہئے اور اس کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ اقبال کا یہ پورا خط سن ۱۹۳۵ء کے آئین کے حدود میں ہے اور آنے

والے دو تین سال کی سیاسی سرگرمیوں نے ثابت کر دیا کہ وہی آئینی خطرات سامنے آئے جن کا ذکر اقبال نے کیا تھا اور اگرچہ اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے مگر مسلم زعما انہیں کے خطوط پر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ پاکستان اسی دور کا ایک بروزی ارتقاء ہے۔ جس کے انکشاف سے مسلم قیادت نے اپنے ان مفروضات سے نجات حاصل کی جن پر سن ۱۹۱۶ء سے اس کی قیادت اور آئین مدنی کا مدار تھا۔ یہ بروزی ارتقاء ۱۹۳۸ - ۱۹۳۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔

کانگریس کی مسلم رابطہ تحریک مسلمانان ہند کے ان مسلمات کے خلاف تھی کہ ہندو اور مسلم نمائندہ قائدین جمع ہوں اور ایک مستقل معاہدہ کرلیں جس کی بنیاد پر اتحاد کی مضبوط عمارت کھڑی کی جائے اور پھر مشترکہ جدوجہد کر کے ہندوستان کو آزاد کروایا جائے۔ اس نئی پالیسی نے جو جواہر لال کی قیادت میں بڑے زور شور سے شروع کی گئی تھی کہ بلا کسی معاہدہ کے مسلمانوں کو کانگریس میں ضم کیا جائے کانگریس کے وقار کو مسلمانوں میں مجروح کیا۔ کانگریس کے اس طرز عمل نے ہی جو سر تا سر مسلم سیاسی مسلمات کے خلاف تھا نئے دور سیاست کا آغاز کیا۔ اسی دور نے جناح کو قائد اعظم بنایا اور مسلمانوں کو نیا نصب العین دیا۔ کانگریس کی یہ پالیسی سیاسی آداب کے بھی خلاف تھی۔ جناح نے مرکزی اسمبلی میں سن ۱۹۳۴ء سے لے کر سن ۱۹۳۷ء تک اپنے گروپ کے ساتھ کانگریس کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے یہ توقع کی جاتی تھی کہ سن ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگریس، جناح اور ان کی جماعت سے تعاون کرے گی۔ صوبائی انتخاب میں جو مسلم نمائندے منتخب ہوئے تھے ان کی ۸۰ فیصد سے زیادہ تعداد جناح کی قیادت پر مجتمع ہو چکی تھی۔ خود انتخابات کے دوران اکثر مقامات پر کانگریس نے مسلم لیگ کی حمایت کی تھی اور مسلم لیگ نے کانگریس کی۔ دونوں نے یہ انتخابات سرکار پرستوں کے خلاف جیتے تھے توقع تھی کہ یہ سیاسی اتحاد ملک کی ترقی کا باعث ہو گا۔ یہ بات خاص طور پر اس لئے بھی متوقع تھی کہ جناح اپنی جماعت کے ساتھ خود کانگریس کی طرح ہی ترقی پسند تھے

مگر جب کانگریس نے صوبوں میں حکومت بنانا منظور کر لیا تو حکومت تنہا بنائی اور مسلم نمائندوں کی اس بڑی جماعت کو حزب اختلاف میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر مسلم رابطہ تحریک چلا کر حکومت کے خلاف نہیں بلکہ اس مسلم نمائندہ جماعت کے خلاف محاذ کھول دیا۔ یہ محاذ ایک جماعت کے خلاف نہیں تھا بلکہ خود اس تصور کے خلاف تھا کہ مسلمانوں کی کوئی علیحدہ تنظیم ہو۔

اس طرح سے اس عظیم جنگ کا آغاز ہوا جو کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی اور اس جنگ میں کانگریس نے رجعت پسندوں بلکہ سرکار پرستوں سے بھی اتحاد کرنے میں عار محسوس نہیں کیا جس سے ملک کے سیاسی اخلاق میں بہت بڑی گراوٹ پیدا ہوئی جس کا نقصان آئندہ ہندوؤں اور مسلمانوں نیز بعد میں بھارت اور پاکستان کو اٹھانا پڑا۔ کانگریس نے اس بات کی کوشش کی کہ خالص مسلم صوبوں میں سرکار پرستوں اور مقامی انداز میں سوچنے والوں کے ساتھ مخلوط حکومت بنائے۔ اس کوشش میں کانگریس ناکام نہیں ہوئی۔ ایسے موقع پر محمد علی جناح گویا فریق ثانی کے سپہ سالار تھے۔ مسلمانان ہند کی نظریں ان پر مرکوز ہو گئیں کہ وہ کسی طرح اس غیر معین اور بے شرط قومیت سے نجات دلاتے ہیں جس کے لئے کانگریس نے اپنی تمام مہم کا آغاز کیا تھا۔

جناح نے اس جنگ کے لئے دو اصول وضع کئے۔ مسلمانوں کی نمائندہ ایک اور صرف ایک سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ ہو، مسلمان اس کی صورت میں جمع ہوں اور اسی کے ذریعہ سے اپنی قوت کے بل پر کوئی پائیدار سمجھوتہ کریں۔ یہ وہی اصول ہے جس کی طرف مسلم قیادت شروع ہی سے مائل رہی۔ جناح نے اس کو باقاعدہ اصول کار بنا لیا اور قرار دیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اس کے علاوہ کسی مسلمان کو کسی فریق سے گفتگو کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس اصول پر انہوں نے سختی سے عمل کیا اور ہندی سیاست میں یہ ان

کی غیر معمولی اختراع ہے۔ مخالفین اس کو مسٹر جناح کی ہٹ قرار دیتے تھے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے میثاقیت کی بنیاد پر اپنا مقام متعین کروانے کی جو شروع سے پالیسی اختیار کی تھی یہ اصول اسی کا لازمی نتیجہ اور عملی شکل تھا۔ یعنی چوٹی کے مسلمان جو مسلم لیگ میں نہیں تھے مثلاً ابوالکلام آزاد' حسین احمد مدنی' رفیع احمد قدوائی وغیرہ بیشک قابل لحاظ ہستیاں تھیں مگر ہندوستان گیر "میثاق مدن" کو عملی جامہ پہنانے کا طریقہ یہی تھا کہ مسلمان ایک اور صرف ایک "جماعت" کی صورت میں منظم ہو کر ہی ایسے میثاق کے فریق بنیں جس پر مستقبل کے ہندوستان کی اساس رکھی جائے۔ اس لئے نہایت غیر جذباتی انداز میں جناح نے ابوالکلام آزاد جیسے پرانے سیاس کو کوئی حیثیت دینے سے انکار کر دیا اور ان کے بارے میں ہمیشہ سن ۱۹۳۷ء کے بعد سے یہ کہا کہ انہیں مسلمانوں کی ترجمانی کرنے یا ان کی طرف سے بولنے کا حق نہیں ہے۔

جس وقت کانگریس نے سن ۳۸-۱۹۳۷ء میں مسلم رابطہ تحریک شروع کی وہ میثاقی مدنیت کو اپنے نصب العین سے خارج کر چکی تھی۔ جیسا کہ اوپر گزرا جواہر لال کی ترقی پسند سیاست کا یہ منطقی حاصل تھا۔ اب میں کانگریس کی اس پالیسی کی نسبت کچھ بیان کروں گا۔ جیسا کہ سب ہی لوگ جانتے ہیں جواہر لال بجائے خود بہت بڑے مفکر تھے۔ ان کی فکر بہت زیادہ جدید تھی۔ سیاست میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو فرقہ واری مسئلہ کہیں نظر نہیں آتا تھا اور اس بات نے واقعی مسلم عوام کو چراغ پا کر دیا تھا مگر کانگریس کو غیر میثاق پسند قومیت کی طرف لا کر گویا انہوں نے درحقیقت ایک بڑی تاریخی بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔ قومیں میثاقوں سے نہیں بنا کرتیں اس لئے وہ کسی "معاہدہ عمرانی" کے بغیر متحدہ ہند اور ہندی قومیت چاہتے تھے۔ ان کی مسلم رابطہ تحریک اسی بات کا مظہر تھی اس قسم کا "معاہدہ عمرانی" جیسا کہ مسلم عوام اور ان کے قائدین چاہتے تھے' سچ پوچھئے تو' ایک بنیادی بات چاہتا تھا وہ یہ

کہ دونوں فریق اس معاہدہ پر عمل کرتے ہیں یا نہیں یہ دیکھنے کے لئے ایک تیسرا فریق ہمیشہ موجود رہے۔ دراصل میثاقی قومیت کا یہ تخیل ایک خیال سے زیادہ حقیقت سمجھا جائے تو اس کی تہہ میں یہ نظریہ کارفرما تھا' خواہ کتنا ہی لاشعوری کیوں نہ ہو کہ انگریز اس ملک میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ ہمیشہ ہی ثالت کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ ریمزے میکڈانلڈ کا فرقہ واری اوارڈ اس کی مثال تھا لیکن جب کہ تمام سیاسی جماعتیں عرصے سے مکمل سوراج کو ہندوستان کا قومی نصب العین قرار دے چکی تھیں یہ تصور خود بخود ناقابل عمل اور فرسودہ ہو گیا تھا۔ خود مختاری کے حصول کے بعد میثاقی قومیت کی کوئی وقعت یا واقعاتی قیمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وجہ سے کانگریس کی نئی ابھرتی ہوئی قیادت جو موجودہ زمانہ اور اس کے تقاضوں سے خوب واقف تھی وہ ٹھیک ہی راستہ پر تھی۔ اس نے مسلمانوں کو براہ راست کانگریس میں بھرتی کرنے اور پوری ملت کو کانگریس میں جذب کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو وہ سیاسی حقیقت کے عین مطابق تھا۔ مگر کانگریس کی یہ غیر میثاقی اور غیر مشروط انضمامی پالیسی ہی سب مسلمانوں کو تقسیم ہند کے تصور کی طرف لے گئی۔

مسلم رابطہ تحریک کے ساتھ ساتھ اب کانگریس کی نظریں صوبائی حکومتوں کے علاوہ مرکزی حکومت پر بھی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال' جناح گاندھی وغیرہ نیز مسلم لیگ اور کانگریس نے گول میز کانفرنس میں فیڈرل حکومت کے دستوری خاکہ کی جس میں ریاستوں کے والیان کو بھی نامزد نمائندہ بھیجنے کا حق دیا گیا تھا مذمت کی تھی۔ اس کے ذریعہ کبھی روشن خیال حکومت نہ بن پاتی اور ہندوستان کے مرکز پر فرنگی راج کے حامیوں اور رجعت پسندوں کا غلبہ ہوتا۔ اس لئے یہ توقع کی جاتی تھی کہ جب تک مرکزی دستور میں تبدیلی نہیں کی جاتی مرکز کی آئینی اسکیم (وفاقی حکومت) کو ہندوستان کی قومی جماعتیں نافذ نہ ہونے دیں گی کیونکہ ریاستوں کو وفاقی اسکیم میں ایک تہائی کا حصہ حاصل تھا' مگر کانگریس نے اپنی پالیسی میں لچک

پیدا کی اور وہ اس طرح کہ سن ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے کانگریس نے اندازہ لگایا کہ ریاستوں میں کانگریس کی تحریک چلا کر والیان ریاست کو منتخب نمائندے بھیجنے کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ریاستوں میں اصلاحات کی تحریک تیز کی۔ والیان ریاست ان تحریکوں کا بہت دنوں تک مقابلہ نہیں کر سکتے تھے خود ریاستوں کے اندر وہ نمائندہ حکومتیں قائم کرنے پر مجبور ہو جاتے نیز وفاقی ایوان میں منتخب نمائندوں کو بھیجنے پر مجبور ہو جاتے اس معاملہ میں واقعی کانگریس نیتا قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے سن ۱۹۳۵ء کی رجعت پسند آئینی اسکیم ہی میں سے حکومت خود اختیاری کا راستہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ کانگریس اب اس کا انتظار بھی نہ کرنا چاہتی تھی جب سے کہ وفاقی اسکیم میں ریاستوں کے نمائندے منتخب ہو کر آنے لگیں۔

اب وہ اس مرکزی حکومت میں آنے کی سوچنے لگی تھی جو وائسرائے کونسل پر مشتمل ہوتی تھی اور جس کا دائرہ اقتدار برطانوی ہند کے صوبوں پر تھا۔ مسلمانوں کو کانگریسی حکومت کا صوبوں میں تجربہ تھا جیسا کہ اوپر گزرا کانگریس کے روپ میں یعنی اقتصادی قومیت کی آڑ میں یہاں مہا سبھائیت سے مسلمانوں کا سامنا ہوا۔ اب مرکزی حکومت یعنی وائسرائے کونسل پر کانگریس کے قبضہ کے تصور ہی سے طرح طرح کے اندیشے مسلمانوں میں پیدا ہوتے تھے۔ وہ سمجھے کہ مرکزی حکومت کے طاقتور وسیلے کو بھی کانگریس اس قومی دھارے میں ان کو جذب کرنے کے لئے استعمال کرے گی جو ان کی انفرادی حیثیت کو بالکل ختم کردے گا۔ یہ پوری پالیسی ان کو میثاقی قومیت کے بنیادی تخیل کے خلاف ایک محاذ معلوم ہوئی تاکہ تمام مسلم سیاسی جماعتوں کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر ان کو اقتصادی قومیت کے نام پر مہا سبھائی قومیت کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ چنانچہ مسلم نمائندوں، جماعتوں بلکہ کل ملت اسلامیہ کی یہ پالیسی ہو گئی کہ وفاقی اسکیم میں مزاحمت پیدا کی جائے اور اس کے نفاذ کو جس حد تک ہو سکے ملتوی کروایا جائے۔ ان کا ذہن اس طرف کام کرنے لگا کہ مسلم صوبوں سے کہا جائے کہ اگر

کانگریس وائسرائے کونسل میں اپنا ڈیرا جماتی ہے تو مسلم اکثریت کے صوبے مزاحمت کریں گے۔ مطلب یہ کہ اول تو ایسی حکومت نہ بننے دی جائے لیکن اگر ایسی حکومت بنے تو وائسرائے پھر ان کے لئے کوئی دوسرا انتظام کریں یعنی یا تو انتظام خود سنبھالیں یا دوسری انتظامیہ کونسل ترتیب دیں۔ اسی طرح اگر وفاقی اسکیم کے نفاذ کا وقت آگیا تو وائسرائے ایک نہیں بلکہ دو یا تین وفاق قائم کریں، بہرحال ایک وفاق پر وہ کسی طرح راضی نہ ہوں۔ مستقبل کا انہوں نے اس راہ سے یہ نصب العین مقرر کیا کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر جائیں تو ان وفاقوں کو اقتدار سونپ کر جائیں۔ یہ ساری فکر جو ۱۹۳۷ء سے شروع ہوئی سن ۱۹۴۰ء تک پختہ ہوئی اور ۲۳ مارچ سن ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان کی صورت میں مدون ہو کر مسلم ہند کا نصب العین قرار پائی۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی کہ نصب العین کے علاوہ موجود الوقت سیاسی ماحول سے نمٹنے کے لئے بھی ایک باضابطہ پالیسی یا نظریہ کی ضرورت تھی جس سے مرکزی حکومت کے مسئلہ سے نمٹا جا سکے کیونکہ آئین سن ۱۹۳۵ء کا مرکز سے متعلق حصہ کا نفاذ ہی آئندہ کے لئے اقلیم ہند کی مقرون منزل تھی۔ اس سلسلہ میں پالیسی وضع کرنے کا سہرا جناح کے سرے ہے۔ انہوں نے یہ حکمت عملی قرار دی کہ مرکز میں قومی حکومت کے قیام پر زور دیا جائے جو سارے ہندوستان کے ممیز گروہوں یا ملتوں کی نمائندہ حکومت ہو۔ صرف یہی تجویز سن ۱۹۳۵ء کے آئین کی موجودگی میں چل سکتی تھی تاکہ مسلمان کانگریس یا واحد قومی دھارے والے اقتدار سے بچ سکیں۔ اس تجویز میں ایک خوبی تھی وہ یہ کہ اس طرح جو حکومت قائم ہوتی وہ سب فرقوں کی نمائندہ ہوتی۔ اس میں دو نقص بھی تھے وہ یہ کہ اس عام اصول سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ کہ اکثریتی پارٹی کے قائد کو بلا کر کہا جائے کہ وہ کابینہ ترتیب دے۔ یہ مخلوط حکومت ہوتی کہ اس میں یک جہتی ہونا بھی ضروری نہ ہوتا یا اس کی

شکل کونسل کی سی ہوتی جس میں یک جہتی پیدا کرنے کا کام سربراہ حکومت یعنی وائسرائے کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس طرح سے خود "قومی حکومت" کا یہ تصور اس اصول پر مبنی تھا کہ اقتدار اصلاً" وائسرائے کے ہاتھ میں ہے جو اپنے اراکین کونسل کو نامزد کرنے کا اختیار رکھتا ہے نیز اراکین کونسل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے وہ اختیارات خاص کا بھی حامل ہے۔ بہرحال ایک خود مختار جمہوری ملک میں یہ تصور نہیں چل سکتا تھا۔ اس میں معنویت صرف اسی وقت تک رہ سکتی تھی جب تک کہ ملک کا اقتدار غیروں کے پاس ہو۔ قومی حکومت کا یہ تصور اس لئے قرین صحت تھا کہ یہ سن ۱۹۳۵ء کے آئین کے عین مطابق تھا۔ چونکہ آئینی انتشار کی اجازت نہیں ہو سکتی تھی اور کوئی صوبہ وائسرائے کونسل کے اقتدار سے منحرف نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ایسے ایک سے زیادہ وفاق قائم ہوتے ہندوستان میں مرکز میں ایک ہی حکومت کا اقتدار ہوتا اس لئے جناح نے قومی حکومت کا تصور ایجاد کر کے مثبت تدبیر منزل کا ثبوت دیا۔ اس تدبیر پر انہوں نے یہ کہ نہ صرف سختی سے عمل کیا بلکہ پوری دیانت سے عمل کیا چنانچہ جب کانگریس سن ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" کی مہم کے بعد نظر بند کر دی گئی تھی تب بھی انہوں نے مرکز میں مسلم لیگ کے اشتراک سے کونسل بنوانے کی کوشش نہیں کی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ستمبر سن ۱۹۳۹ء میں جب جنگ کا آغاز ہوا تو برطانوی حکومت خود اس کی کوشاں ہوئی کہ ہندوستان کے مرکز میں نمائندہ حکومت قائم ہو جائے جو اس ملک کے کل وسائل کو انصرام جنگ میں لگا دے۔ جوں جوں جنگ کی صورتحال اتحادیوں کے خلاف ہوتی جاتی تھی برطانیہ کی مرکز میں نمائندہ حکومت کے قیام کی کوشش بھی بڑھتی جاتی تھی۔ فرانس کے جون ۱۹۴۰ء میں سقوط کے بعد لندن کے ایوان حکومت میں اس کی ضرورت اور زیادہ شدت سے محسوس کی گئی کہ ہندوستان میں ایک حد تک نمائندہ حکومت وجود میں

آجائے۔ اس عرصہ میں کانگریس نے صورتحال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور مرکز میں کانگریس کی حکومت قائم کرنے کے لئے تگ و دو کی مگر بہرحال کانگریس ایک ذمہ دار جماعت تھی۔ اس نے مستقبل کے بارے میں برطانوی حکومت سے کوئی پختہ وعدہ لئے بغیر حکومت قبول کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ جو حکومت بنائی جائے اسے تمام و کمال اقتدار حاصل ہو، مگر حکومت برطانیہ دفاعی مسائل کو وائسرائے کا محفوظ اختیار ہی رکھنا چاہتی تھی اور وہ اسے کسی طور حوالہ کرنا نہ چاہتی تھی۔ چونکہ اس قسم کی حکومت کا اقتدار جو دفاعی مسائل پر حاوی نہ ہو جب کہ پوری حکومت اپنے پورے وسائل دفاع یا جنگ کے لئے وقف کر رہی ہو برائے نام ہوتا کانگریس نے ایسی حکومت بنانا پسند نہیں کیا سرکریس مشن سن ۱۹۴۲ء بھی اسی لئے ناکام ہوا۔ پورے عرصہ میں جناح نے عظیم الشان کامیابی یہ حاصل کی کہ قومی حکومت نہ کہ اکثریتی پارٹی کی حکومت قائم کرنے کے اصول پر خود کانگریس بھی آگئی۔ چنانچہ سرکریس سے بات چیت کے دوران کانگریس نے "قومی حکومت" کا نظریہ ہی سامنے رکھا۔ علاوہ ازیں جب شملہ کانفرنس سن ۱۹۴۵ء میں ہوئی تو بھی اسی اصول کی بنیاد پر کانگریس بات چیت کے لئے آگے بڑھی۔ کرپس مشن کے وقت بہت سے سیاستدانوں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کرپس مشن کے منصوبہ کو قبول کر کے مرکز میں حکومت قائم کرنے کے لئے قدم آگے بڑھائے۔ کرپس منصوبہ میں اس کی پوری گنجائش تھی کہ آئندہ جو صوبے ہندی وفاق میں شامل نہ ہونا چاہیں وہ علیحدہ وفاقی حکومت بنا سکتے ہیں۔ یہ خوش آئند بات تھی مگر جناح نے بحیثیت مجموعی تنہا ہی یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایسی کسی حکومت کی کوشش نہیں کریں گے جس میں کانگریس نہ ہو یا بالفاظ دیگر جو قومی حکومت نہ ہو اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندے شریک نہ ہوں۔ بہرحال خود قومی حکومت کے تصور کو کانگریسی سیاست میں تسلیم کر لیا جانا جناح کی بہت بڑی سیاسی فتح تھی۔ یہ ایسی فتح تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ

ہندوستان میں سن ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت ایسی کوئی نمائندہ حکومت قائم نہیں کی جائے گی، کسی بھی سیاسی جماعت کی نہیں، جس کو ملک پر اقتدار کی اجارہ داری حاصل ہو جائے۔ چنانچہ وہ وقت آیا جب اگست سن ۱۹۴۶ء میں نہرو نے عبوری حکومت بنائی تو مسلم لیگ یا مسلمانوں کے لئے اس حکومت میں جگہ مخصوص کرنی پڑی جس کو بعد میں مسلم لیگ نے پر کیا۔

مسلمانوں کے حق میں "قومی حکومت" کا اختراع اور اس کی قبولیت مثبت تبدیلی تھی جس کی پناہ میں تحریک پاکستان زوروں سے جاری تھی۔ پاکستان کی اس تحریک کو مہا سبھائی ذہنیت نے سن ۴۲-۱۹۴۱ء سے ہی تیزی سے قبول کرنا شروع کر دیا۔ دراصل ہندوؤں میں اس زمانہ میں کبھی طبقے ہوتے تھے۔ ایک وسیع المشرب طبقہ بھی تھا جس کی نمائندگی راج گوپال اچاری کرتے تھے۔ اس طبقہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر مسلمان ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو تقسیم کی بنیاد پر ان سے سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ آزادی کی منزل قریب آئے۔ یہ طبقہ قریب قریب بے اثر تھا۔ دوسرا طبقہ روشن خیالوں کا تھا جو سچ مچ اقتصادی قومیت کو بھی بامعنی شئے سمجھتا تھا اس کی علامت نہرو تھے۔ یہ تقسیم کو فرقہ وارانہ زہر کی پیداوار قرار دے کر بہر نوع مخالفت کرتا تھا۔ تیسرا طبقہ اکھنڈ بھارتی مہا سبھائیوں کا تھا جو زمانہ کی رو کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ ہندوستان کو عہد مہا بھارت میں لے جانا چاہتے تھے، مگر ایسے مہا سبھائیوں کی بہرحال زیادہ تعداد تھی جن کا خیال تھا کہ چند زمین کے ٹکڑے مسلمانوں کو دے دینے کے بعد کل بھارت میں اپنی اجارہ داری بڑی سہولت سے قائم ہو جائے گی۔ ان سمجھداروں کا گڑھ کانگریس تھی اگرچہ ہندو مہا سبھا میں بھی ان کی تعداد خاصی تھی ان لوگوں میں اقتصادی قومیت کی خوبو تک نہ تھی۔ اس طبقہ کی بعد میں علامت سردار ولبھ بھائی پٹیل بنے۔ یہی طبقہ رفتہ رفتہ کانگریس پر غالب آگیا اور نظریہ تقسیم کا حامی بن گیا۔ مسلمانوں کا نظریہ پاکستان ان چاروں اقسام سے مختلف تھا۔ اقبال، جناح اور مسلم قیادت اس کو میثاقی قومیت کا نعم البدل تصور کرتے تھے۔

نہرو کی طرح مسلم قیادت کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ فرنگی راج کے رخصت ہونے کے بعد میثاقی قومیت ناممکن بات ہوگی اس لئے انہوں نے تقسیم کا اصول ایجاد کیا' تاکہ مملکتوں کی صورت میں میثاقیت کو زندہ رکھا جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جو ایک طرف مسلمانوں کے لئے روک ہو کہ ہندوؤں یا غیر مسلموں کو اپنے تہذیبی دائرہ میں جذب کریں اور دوسری طرف ہندوؤں کے لئے یہ ممکن نہ ہو کہ وہ مسلمانوں کو اپنے تہذیبی دائرہ میں جذب کریں۔

اگر میثاقیت ہوتی تو اس سے بلند چیز یعنی فرنگی اقتدار اس کی بقا کا سرچشمہ ہوتا' لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کے نزدیک یہ دو مملکتیں یا وفاق ہی ہو سکتے تھے جو اقلیم ہند میں وجود میں آتے اور ہندوؤں کو مسلمانوں میں اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں تحلیل وفنا کے عمل سے بچا کر انفرادی ارتقاء اور باہمی تعاون کا موقع فراہم کرتے۔ ان وفاقوں کا اثر پورا ہندوستان گیر ہوتا اور اس طرح سے دونوں مملکتوں کے اندر رفتہ رفتہ روشن خیال نامیاتی قومیت یا وحدت اجتماعی وجود میں آتی۔ یہی سبب ہے کہ پوری تحریک پاکستان کا ملی نقطہ ماسکہ وحدت ہند کا تصور تھا کہ پورا برصغیر ایک ہے کیونکہ اس میں ایک ہی قسم کی متبائن ثقافتی و تمدنی فرقوں کا یہاں سے وہاں تک پھیلاؤ ہے مگر سیاسی اور مذہبی اعتبار سے اس وحدت کی تقویم دو مملکتوں سے ہوتی ہے اور یہ دونوں مملکتیں ایک دوسرے سے باہمی تعامل کے ذریعہ ان تہذیبی انفرادیتوں کی ضمانت دے سکتی ہیں جو یہاں کی آبادیوں میں پائی جاتی ہیں۔

پاکستان کی مندرجہ بالا نظریاتی اساس ہی تھی جس کی بنیاد پر آزاد ہند کے لئے جناح اور مسلم لیگ نے ۱۶ مئی سن ۱۹۴۶ء کا وزارتی منصوبہ قبول کر لیا تھا۔ اس منصوبے کی جان تین ذیلی وفاق تھے۔ ان وفاقوں کو اپنا دستور بنانے کا حق دیا گیا تھا اور اس کے بعد مرکز کا دستور بنانے کی نوبت آتی تھی یہ دستور انگریزی راج کے رخصت ہونے کے دس برس بعد تک نافذ رہتا اور تب اس پر صوبوں یا وفاقوں کی خواہش پر نظر ثانی ہو سکتی تھی جیسا کہ ظاہر ہے نظریہ

پاکستان ہند کی سیاسی تقسیم کا نظریہ تھا نہ کہ اس برصغیر کو الگ الگ ٹکڑوں میں باٹنے کا۔ اس کا مقصد اس کی انفرادی خصوصیت کا تحفظ تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کو یہ وزارتی منصوبہ منظور کر لینے میں کوئی عار نہ ہوا جب کہ اس کا منشا ایسے میثاقی مرکز کا قیام تھا جس میں ذیلی وفاقوں کو اتنا وزن حاصل ہو کہ مرکز ان ذیلی وفاقوں پر حاوی نہ ہو سکے۔

اس موقع پر نہرو نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ انہوں نے بڑی صفائی سے اس خیال کی اشاعت کی کہ ایک مقتدر اعلیٰ دستور ساز مجلس کو اپنی مرضی سے آئین سازی سے کون روک سکتا ہے اور وہ کیسے وزارتی منصوبے کے قائم کردہ تعینات میں ہی کام کرنے کے لئے مجبور کی جا سکتی ہے۔ یہ بات آئندہ کے ہندوستان کے بارے میں جامع اشارہ تھی۔ ہندوستان کو ایک ہی سیاسی وحدت رکھنے کے بعد یہ توقع رکھنا کہ یہاں کے دستور ساز وزارتی پلان پر صحیفہ آسمانی کی طرح عمل کریں گے ایک غیر حقیقت پسندانہ نقطہ نظر تھا اگر پہلی دستور سازی میں وہ اس کی پابندی کرتے اور دستور بنانے کے بعد اقتدار مستقل ہو جاتا تو اس کے بعد دوسری دستور سازی میں کون سی رکاوٹ ہو سکتی تھی؟ دستور جو پہلے سے مختلف ہوتا نافذ کیا جا سکتا تھا۔ اس نفاذ کو روکنے کے لئے کون سے ذیلی وفاق کے پاس طاقت ہوتی؟

نہرو نے پہلی دستور ساز اسمبلی کے لئے جو بات کہی وہ بہت بصیرت افروز تھی۔ یا تو آئندہ ہندوستان کی مستقل ضمانت اور اس کی دستوری شکل کو ایک معین نہج پر رکھنے کا تیقن اپنی طاقت و دستوری انتظامات کے ذریعہ خود فرنگی دیتے ورنہ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ دستوری اسکیم ایک واحد مملکت کے قیام کی صورت میں خواہ وہ کتنی ہی وفاقی ہو از کار رفتہ اور بے بود ہو جاتی اور دستوری تبدیلیوں کے ذریعہ تبدیل کر دی جاتی۔ مرکزی حکومت اپنی طاقت کے بل پر اس کو نافذ کرتی۔ نہرو کے بیانات اور کانگریس کی طرف سے ان کی تائید دراصل بہت بڑے اخلاقی مظاہر میں سے ایک ہیں۔ انہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت

پسندی کا راستہ یہی تھا کہ اس ذیلی براعظم میں دو مملکتیں قائم کی جاتیں نہ کہ ایک۔ صرف بین المملکتی میثاق ہی کو سیاسی دوام حاصل ہو سکتا تھا اور دو مملکتی نظریہ سے ہی ہندوستان میں خود کار قوتوں کی ایسی رو قائم ہو سکتی تھی جو آئندہ کے لئے فرنگی ضمانت کی محتاج نہیں ہوتی اور اس میں اتنی قوت ہوتی کہ وہ ان مملکتوں کی اندرونی پالیسیوں نیز آئین و دستور کو ان معینہ خطوط پر رکھتی جو یہاں کی مختلف آبادیوں' علاقائی' لسانی اور مذہبی گروہوں کے لئے اطمینان بخش ہوتیں جیسا کہ اقبال کے نظریہ سالماتی قومیت کا تقاضا تھا۔

کانگریس نے تعطل دور کرنے کے لئے وزارتی منصوبہ پر مارچ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ تقسیم کو ترجیح دو محرکات کے ماتحت دی ایک تو وہی مہا سبھائی ذہنیت کے ہندو اس کو بہترین بات سمجھنے لگے تھے کہ تقسیم سے تھوڑے سے علاقہ کی قربانی دے کر باقی پورے ہندوستان کو صرف ہندو جاتی' اس کی عینیت اور تمدن کے لئے محفوظ کر لیا جا سکے گا۔ دوسرا محرک ترقی پسندانہ تھا۔ وہ یہ کہ "وزارتی منصوبہ" یا وفاق کی ہر اسکیم' جس میں مرکز کمزور ہو اور وفاقی اکائیاں طاقتور' جدید مملکت کے تصور سے ہم آہنگ نہیں۔ جدید مملکت کے فرائض اور ذمہ داریاں بہت وسیع اور گوناگوں ہوتی ہیں جن کا تقاضہ ایک مضبوط مرکز اور طاقتور مرکزی حکمت عملی ہے۔ آج کی حکومت کا کاروبار صرف دفاع یا رعایا کی جان و مال کی حفاظت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے کام لازمی طور پر اجتماعی زندگی کے ہر ہر شعبہ کو متاثر کرتے ہیں۔ زر پر کنٹرول' معاشی پیداوار کی شرح کے استقرار سے لے کر روزگار میں استحکام نیز پیچیدہ بین الاقوامی تعلقات و تجارت وغیرہ بھی حکومت کے لازمی فرائض ہیں۔ وزارتی منصوبہ سے بہر صورت ایک بہت ہی مذبذب کل ہند مملکت قائم ہوتی جس سے خود ہندوستان کو داخلی اور خارجی نقصان پہنچتا۔ اس لئے کانگریس کی یہ پالیسی جو اس نے نہرو رپورٹ کے زمانہ سے رکھی جدید مملکت کے تصور و تقاضہ سے ہم آہنگ تھی۔ اقتصادی قومیت کے تصور کو عملی جامہ

پہنانے کے لئے بھی یہ نہایت ضروری تھی۔ خود قائد اعظم سے مارچ سن ۱۹۴۶ء میں لندن کرانیکل کے نمائندہ نے پوچھا تھا کہ تقسیم پر وفاق کو کیوں نہ ترجیح دی جائے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ تمام وفاقی مملکتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یونٹس آہستہ آہستہ وفاقی مرکز میں جذب ہوتی جاتی ہیں اور وفاقی مرکز کا اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔

دراصل جدید مملکتوں کی تقویم میں لابدی ہے کہ مرکز کے اختیارات و اقتدار میں اضافہ ہی ہوتا جائے۔ خود دفاعی ضروریات مرکز کے وظائف میں اضافہ کر دیتی ہیں نیز موجودہ زمانہ کے اقتصادی' مالیاتی' تجارتی نظامات بغیر وسیع مرکزی اختیارات کے قائم نہیں رہ سکتے اس لئے مرکزی ارتکاز میں ترقی ہی ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے ہر دور میں کمزور وفاقی مرکز کے لئے ہی جدوجہد کی کیونکہ ملی تحفظ اسی کے ذریعہ ممکن تھا' مگر کانگریس' دیکھا جائے تو اس معاملہ میں صحیح راستہ پر تھی۔ وفاقیت فی الحقیقت دور ماضی کی یادگار تھی جو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چونکہ خود مختار اکائیوں کی وفاقیت ممکن نہ تھی' اس کا متبادل راستہ صرف دو مملکتوں کا قیام ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کانگریس کی قیادت نے اس کو آگے بڑھ کر قبول کر لیا۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ جو امر جدید زمانہ کے مطابق تھا اور ترقی پسندی و روشن خیالی بلکہ اقتصادی شعور کا مظہر تھا وہی امر ہند میں رجعت قہقری اور مہاسبھائیت کا بھی مظہر تھا چنانچہ سردار پٹیل اور نہرو دونوں تقسیم پر رضامند ہو گئے۔ اس تقسیم سے دو مملکتیں وجود میں آئیں جن کو معقول مرکزیت حاصل تھی اور ایک ساتھ یہ واقعہ روشن خیالی اور رجعت پسندی کی بہت بڑی فتح تھا۔ ان دو متضاد حقیقتوں نے آزادی کے بعد سے برصغیر کی تاریخ سازی کی ہے۔

بانیان پاکستان' اقبال اور جناح روشن خیال قیادت کی علامت تھے۔ انہوں نے سالماتی نظریہ قومیت کو استقامت دینے کے لئے نظریہ پاکستان بطور دستوری حل پیش کیا تھا۔ چنانچہ

پاکستان کا روحانی نصب العین حدودِ پاکستان میں ایک ایسی ہمہ امتزاج قوم کا حصول ہے جس میں سب متفرق گروہ' امتیازی اور منفرد اجتماعات علاقے اور خطے زندہ و سرزندہ رہ کر وحدت پاکستان کو متشکل کریں۔ بھارت بھی اس نصب العین کے علاوہ دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ مگر اس وقت برصغیر رجعت پسند قوتوں کے جوار بھاٹے میں ہچکولے لے رہا ہے۔ یہ رجعت پسند قوتیں منفی قسم کی قومیں پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ بھارت میں بجائے مثبت عاطفوں اور جذبات کے ذریعہ تمام منفرد علاقوں' خطوں اور اقوام کو متحد مثبت کرنے کے' یہ قوتیں ڈر اور خوف کے ذریعہ مصنوعی اتحاد لاگو کئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا اتحاد صرف طوائف الملوکی کا باعث ہو سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی اس قسم کے ڈر اور خوف کے ذریعہ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کوئی پائیدار قوم نہیں بنا سکتی۔ ہمیں زندہ رہنے کے لئے مثبت عاطفوں کی شدید ضرورت ہے۔

سہ ماہی اقبال

قائداعظم نمبر ۱۹۷۷

قائداعظم سے ایک ملاقات

عزیز احمد

"مرحوم ہر چند ہیرے کی طرح سخت تھے مگر ان میں ہیرے جیسی چمک بھی تھی"

یہ تھے وہ الفاظ جو مشہور انگریزی اخبار "ا سٹیٹمین" نے حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی وفات پر لکھے۔ "ا سٹیٹمین" انگریزوں کے عہد حکومت میں گورنمنٹ آف انڈیا کا نفس ناطقہ سمجھا جاتا تھا حکومت کو جو قدم اٹھانا ہوتا تھا "ا سٹیٹمین" کچھ دن پہلے سے اس کی وکالت شروع کر دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ قائداعظم کے بارے میں یہ رائے، اگر تمام کی نہیں، تو کم از کم ان انگریزوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں حکومت کی باگیں سنبھالے ہوئے تھے۔ اس رائے میں قائداعظم کی تعریف ہے مگر یہ عیب نمائی بالکل واضح ہے کہ وہ مزاج کے سخت تھے۔ انگریز بڑے سیانے اور کائیاں ہوتے ہیں۔ وہ بہت دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرتے ہیں مگر قائداعظم کے بارے میں انہوں نے یہ رائے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر قائم کرلی تھی اور انہیں پر کیا موقوف ہے قائداعظم کے مزاج کی درشتی کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈا کیا گیا کہ غیر تو غیر اپنے بھی انہیں سخت مزاج سمجھنے لگے۔

ایک زمانہ تھا جب بقول مہاتما گاندھی آنجہانی ملک میں بچے بچے کی زبان پر قائداعظم کا نام رہتا تھا۔ ان دنوں ہر مذہب و ملت کے نوجوان ان کی تقلید کو ترقی اور کامیابی کے زینے کی پہلی سیڑھی خیال کرتے تھے۔ نوجوانوں میں قائداعظم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان دنوں کھدر پوشی کا دور دورہ تھا اور اخبارات کے صفحات میں اور جلسوں کی تقاریر میں سودیشی کی وکالت میں مسلسل آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن جو نوجوان میدان سیاست میں اترتا تھا وہ مسٹر جناح ہی کے لباس اور انداز تقریر کی پیروی کرتا نظر آتا تھا۔ وہ اپنے رئیسانہ لباس، دراز قدر، باوقار چہرے اور خوشنما ہاتھوں کی وجہ سے سب کے لئے مرکز توجہ بنے ہوئے

تھے۔ سنا ہے ایک عرصہ تک بمبئی کی عدالتوں میں یہ حالت رہی کہ جو نیا وکیل پریکٹس شروع کرتا تھا وہ مسٹر جناح کی اتنی زیادہ تقلید کرتا تھا کہ ان کا نقال معلوم ہونے لگتا تھا مگر پھر ایک دور ایسا آیا کہ انہوں نے مسلمانوں کی آزادی کے لئے قافلہ ملت کی سالاری کا بار اپنے شانوں پر لے لیا اور قوم نے انہیں اپنا قائداعظم تسلیم کرلیا تو بڑے زور شور سے ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا کہ فرقہ وارانہ مفاہمت نہ ہو سکنے کا اصلی سبب مسٹر جناح کے مزاج کی سختی اور ان کا غرور ہے۔ یہ پروپیگنڈا اس قدر مسلسل اور متواتر ہوا کہ تھوڑا بہت سب ہی اس سے متاثر ہوئے خود میرا ایک عرصے تک یہی خیال رہا کہ ہمارے لیڈر کی طبیعت میں غرور کا مادہ ہے، مگر یہ بات غلط تھی۔ اس کے ثبوت میں میں ذیل کا واقعہ بیان کرتا ہوں جو میرے ساتھ گزرا۔

ستمبر ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے، میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ بمبئی گیا۔ ایک روز صبح کے وقت ہم مالا بارہل کے معلق باغ Hanging Grarden کی سیر کر کے لوٹ رہے تھے۔ راستے میں قائد اعظم کی کوٹھی نظر پڑی۔ دروازے پر باوردی دربان کھڑا تھا۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ کوئی شخص قائداعظم سے ملنا چاہے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اندر جا کر سیکرٹری صاحب سے دریافت کر لیجئے۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ کوٹھی کی فضا پر ایک گہرا سکوت چھایا معلوم ہوتا تھا، جیسے ہر شے ایک عظیم شخصیت کے حضور میں اعتراف عجز سے دم بخود ہے۔ سامنے کے کمرے میں سیکرٹری صاحب ایک خوشنما میز کے آگے کرسی پر بیٹھے کسی کام میں مصروف تھے۔ ہمارے سلام کرنے پر اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کا جواب دے کر پوچھنے لگے۔ ”کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم پنجاب سے آئے ہیں، بمبئی کی سیر کرنے کی غرض سے اور قائداعظم سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔“

وہ پوچھنے لگے۔ ”ملاقات کی غرض کیا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”خاص کام نہیں ہے بس دیدار

اور مصافحہ۔" فرمانے لگے۔ "اس وقت تو غالباً" قائداعظم آرام فرما رہے ہیں آپ اپنا پتہ چھوڑ جائیں۔ ملاقات کا وقت مقرر کر کے آپ کو اطلاع بھیج دی جائے گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "صاحب! ہم ٹھہرے سیلانی آدمی بہتے دریا اور رمتے جوگی کو 'کون و مکان سے کیا واسطہ' اگر اس وقت ملاقات کا موقع مل جائے تو فبہا' پھر کے لئے آپ تکلیف نہ کریں۔"

سیکرٹری صاحب بولے۔ "بہت بہتر' میں ابھی ان سے ملاقات کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر موصوف آرام کر رہے ہوں تو ہم ان کے آرام میں خلل انداز ہونا پسند نہیں کریں گے۔" مگر سیکرٹری صاحب نے ہم کو اصرار سے روکا اور خود متصل کمرے میں تشریف لے گئے تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور بتایا کہ قائداعظم اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہم پنجابی وضع کا معمولی لباس پہنے ہوئے تھے اور ہمارے جوتوں پر راستے کی گرد بھی جمی ہوئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ہماری ہیئت کذائی کچھ زیادہ متاثر کن نہیں تھی۔ لیکن جونہی ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے دور حاضر کا سب سے بڑا مدبر اور سیاستداں جس نے اپنے عزم و استقلال' تدبر و ذہانت' تحریر و تقریر' علم و فضل اور جدوجہد سے ایک عدیم النظیر انقلاب برپا کر دیا' جس نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا اور زندہ رہنے کی امنگ بخشی' وہ بطل حریت جس نے سیاست کی بساط پر دشمنوں کو بار بار مات دے کر ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھ دی' جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھی شان رکھتی ہے وہ ہم دو غیر معروف مسلمانوں کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑا ہو گیا اور سلام مسنون کا جواب دیتے ہوئے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا ان دنوں پنجاب میں سکندری راج تھا۔ قائداعظم سر سکندر کی روش سے مطمئن نہ تھے۔ پنجاب کی سیاسیات پر گفتگو چھڑ گئی تو انہوں نے سر سکندر کی روش کی مذمت کی اور اپنے دعوے کی تائید میں اخبارات کے تراشوں کا فائل نکال کر اس میں سے

حوالے دینے شروع کر دیئے۔ وہ اپنی آنکھ پر مونوکل لگا کر اخبار کے تراشے میں سے ہمیں کچھ عبارت پڑھ کر سناتے اور پھر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے گویا ایک وکیل جج کو اپنا مقدمہ سمجھا رہا ہے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ قوم کی زندگی اور ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک بلا لحاظ مرتبہ و حیثیت خود کو قوم کے مفاد کا نگہبان و محافظ سمجھے اور اگر کسی کو ایسی حرکت کا مرتکب پائے جس سے قوم یا ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اپنے آرام اور سہولت کو نظرانداز کر کے مرتکب کی گردن پکڑ لے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنا ایک واقعہ بھی بیان کیا۔ فرمایا مدتوں پہلے کی بات ہے میں ایک دفعہ سفر کر رہا تھا۔ ان دنوں بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے میں نے درجہ اول کا ٹکٹ خریدا مگر وہ سہواً ملازم کے پاس رہ گیا۔ جب میں منزل مقصود پر گاڑی سے اترا اور مجھے ٹکٹ نوکر کے پاس چھوڑ آنے کا احساس ہوا تو میں ٹکٹ کلکٹر کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ میں اس طرح ٹکٹ بھول آیا ہوں تم مجھ سے کرایہ وصول کر لو۔ میں خریدے ہوئے ٹکٹ کے داموں کی واپسی کا مطالبہ کر لوں گا۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔ "تم مجھے دو روپے دے دو تو جا سکتے ہو۔" اس کا یہ کہنا تھا کہ میں وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا۔ "تم نے میری ہتک کی ہے، اپنا نام اور پتہ بتلاؤ۔" لوگ جمع ہو گئے، ان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کئی ایک آدمیوں نے مجھ پر فقرے بھی چست کئے مگر میں وہاں سے نہ ٹلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسافروں کو لوٹنے والا بابو برخاست ہو گیا۔

قائداعظم ہم سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے، حالانکہ انہیں خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم نہ تو لیڈر ہیں، نہ کچھ نمایاں آدمی ہیں اور نہ ہماری ملک میں کوئی آواز ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے سامنے نہایت متانت، سنجیدگی اور انہماک سے اپنا نقطہ نظر واضح کر رہے تھے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ قائداعظم چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد خود ہی ہم کو چلتا

کردیں گے لیکن جب کافی وقت ہو گیا اور انہوں نے اس قسم کی کوئی بات اشارتاً بھی نہ کہی تو میں نے اپنی طرف سے پہل کی اور یہ کہہ کر ہم آپ کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں، ہم دونوں رخصت ہوئے مگر حیران تھے کہ کیا سنا تھا اور کیا نکلا۔

اس کے بعد جب کبھی میں نے قائداعظم کے بارے میں کسی کی ایک ایسی رائے پڑھی یا سنی کہ وہ مغرور یا بدمزاج انسان ہیں تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ یہ ممکن ہے کہ مغرور اور سرکش قسم کے لوگوں سے ان کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہو لیکن غریبوں اور عام لوگوں سے وہ جھک کر ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سانحہ ارتحال کی خبر سن کر کروڑوں آنکھوں سے آنسو برسے، اس احساس کے زیر اثر کہ غریبوں کا ایک حقیقی ہمدرد دنیا سے اٹھ گیا۔

ماہنامہ ہمایوں لاہور

مارچ ۱۹۴۹ء

قرار داد پاکستان میں صرف اتنا درج ہے

فیض احمد فیض

"قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اس ملک میں کوئی ایسا آئین قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جو ایک بنیادی اصول کے مطابق نہ ہو یعنی، جغرافیائی طور پر ملحقہ خطوں کی حد بندی اس طور سے کی جائے کہ حدود میں مناسب ترامیم کے بعد وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے شمال مغربی یا مشرقی ہندوستان کے خطے، انہیں یکجا کر کے خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں جن میں مشمولہ خطے آزاد اور خود مختار ہوں۔"

قائداعظم کی تحریر و تقریر میں نظریہ پاکستان کی اصطلاح تو کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ نظریہ مسلم لیگ یا مسلم لیگ آئیڈیالوجی اور پالیسی کیا ہے؟ اس کی جتنی واضح اور دو ٹوک تعریف مجھ سے ممکن ہے پیش کرتا ہوں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصد ہے کہ ہم شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان میں آزاد خود مختار ریاستوں کا قیام چاہتے ہیں۔ جن میں دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل، محصولات، کرنسی وغیرہ پر مکمل اختیار حاصل ہو۔" (تقریر کان پور ۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء)

پھر فرماتے ہیں۔ "مسلم لیگ آئیڈیالوجی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک بنیادی قومیت ہیں، ان کی قومیت، سیاسی شخصیت کو محو کرنے کی ہر کوشش کا نہ صرف مقابلہ کیا جائے گا بلکہ میری رائے میں یہ کوشش قطعی بے کار ثابت ہوگی اس ضمن میں غالب سب سے زیادہ اہم قائداعظم کی وہ تقریر ہے جو آپ نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریب میں فرمائی، آپ نے کہا۔ "آپ آزاد ہیں، آپ کا مذہب، ذات یا عقیدہ کچھ بھی ہو۔ ریاست کے کاروبار کا اس سے کوئی علاقہ نہیں، ہم اس بنیادی اصول سے ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک ہی ریاست کے برابر کے شہری" ان اقتباسات اور ان

کے سیاق و سباق کی کوئی بھی تاویل کی جائے، دو چار نکات تو بہر حال واضح ہیں۔ اول یہ کہ پاکستان کا مطالبہ ایک سیاسی مطالبہ تھا، جس کا مقصود صرف اس قدر تھا کہ برصغیر میں اسلامیان ہند کی اپنی آزاد اور خود مختار حکومت یا حکومتیں قائم ہوں جو ان کا وطن اور ان کی ریاست ٹھہرے۔

دوم یہ کلیسائی نمونے کی مذہبی حکومت کا تصور نہ علامہ اقبال کے ذہن میں تھا نہ قائداعظم کے خیال میں۔ سوم یہ کہ اسلام پسند اور غیر اسلام پسند کی تفریق نہ علامہ اقبال کو کبھی سوجھی تھی نہ قائداعظم کو۔ حتیٰ کہ قائداعظم نے پاکستانی شہریوں میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق بھی روا نہیں رکھا۔

چہارم یہ کہ قائداعظم کی نظر میں ہر پاکستانی کا پہلا فریضہ یہ تھا کہ وہ رنگ، نسل، ذات، پات فرقے اور نظریات سے بالاتر ہو کر اپنی کلی اور تمام تر توجہ عوام اور خاص طور سے غریب عوام کی بہبود پر صرف کرے۔

نظریہ پاکستان کا متن ان فرمودات کی رو سے اپنی مملکت کے استحکام اور تحفظ اور اس کے عوام کی بہتری اور خوشی سے عبارت ہے اور بعد میں اس متن پر جو حاشیئے چڑھائے گئے اور جو شوشے اس پر مستزاد کیے گئے محض متاخرین کی بدعتیں ہیں جو کسی طور سند نہیں۔

اداریہ

ہفت روزہ لیل و نہار

لاہور

دسمبر ۱۹۵۴ء

maablib.org

دیدہ بینائے قوم

پروفیسر کرار حسین

ہندپاک میں پہلی جنگ آزادی کی قیادت جو ۱۸۵۷ء میں برصغیر کے اکثر حصوں میں لڑی گئی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں سے تمام لڑائیاں شاہ دہلی کے نام پر لڑی گئیں اس جنگ کا جو انجام ہونا تھا وہ ہوا۔ اگر اس جنگ کے دوران جو غداریاں ہوئیں وہ نہ ہوتیں تو بھی یہ جنگ طول ضرور پکڑ لیتی لیکن اس کا انجام یہی ہوتا۔ حقیقت میں جسے پہلی جنگ آزادی کہا جاتا ہے۔ وہ مدافعت کی آخری کوشش کی تھی۔ اس کی حیثیت ایسی تھی جیسے کوئی بھاری چیز دریا میں ڈوبتی ہے تو دریا کی سطح پر ایک ہلچل ہوتی ہے۔ بھنور پیدا ہوتے ہیں اور بلبلے اٹھتے ہیں ایک عظیم تہذیب' ایک ہزار سالہ دور وقت کے سمندر میں ڈوب رہا تھا تو شورش تو ضرور ہوتی۔ لیکن سطح آب کا تلاطم ڈوبتی ہوئی چیز کو ترایا نہیں کرتا۔ شورشیں مٹتے ہوئے عہد کو دوبارہ زندہ نہیں کیا کرتیں آخر شب بسمل کی تڑپ نئی زندگی کی حرکت میں تبدیل نہیں ہوا کرتی۔

اس جنگ کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک اگر یہ حساب لگایا جائے کہ آزادی کی خاطر ہندوپاک کی کسی قوم نے سب سے زیادہ خون بہایا ہے تو ہندو قوم مسلمانوں کے مقابلے میں دور دور نہیں آسکتی' بنگال میں مولوی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک یا سرحد میں سید احمد شہید کا جہاد خلافت کی تحریک ہو یا کانگریس کی ترک موالات کی تحریک تم جہاں دیکھو گے مسلمان کو بے دریغ اپنا خون بہاتے ہوئے اور گھربار لٹاتے ہوئے پاؤ گے۔ اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے کوئی شخص اندھیرے میں گھر گیا ہو۔ اسے کوئی اپنا راستہ نظر نہ آتا ہو۔ اس کے چاروں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوں اور وہ دیوانہ وار کبھی اس پتھر سے اپنا سر ٹکراتا ہو کبھی اس پتھر سے سر لہولہان ہو چکا ہو' لیکن اس کے سامنے نہ کوئی منزل ہو نہ راستہ۔

ہندوؤں کی کیفیت مسلمانوں سے مختلف تھی اگر رانا پرتاپ سنگھ ان کے قدیم دور کا آخری ہیرو تھا تو شیواجی ان کے نئے دور کا پہلا ہیرو تھا۔ شیواجی کے زمانے سے ہی ان کے دل میں نئی امنگیں پیدا ہو چکی تھیں اور جیسے جیسے سلطنت مغلیہ کمزور ہوتی گئی تمام برصغیر پر حکومت کرنے کا خواب ان کے دل و دماغ پر اپنی گرفت مضبوط کرتا گیا اگرچہ یہ خواب پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں منتشر ہو گیا لیکن مٹا نہیں اور مناسب وقت اور موقع ملتے ہی پھر زور پکڑنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا تھا جب انگریز اس برصغیر کے بلا شرکت غیرے مالک ہو گئے تو ہندوؤں نے انگریزوں کی سرپرستی میں علم' دولت' حکومت' سیاست کے ذریعہ اپنے آپ کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اور اس خواب کی تعبیر کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیا۔

انگریز نے برصغیر ہند و پاک میں اصلاحات کا جو ڈول ڈالا وہ بھی مسلمانوں کے خلاف پڑا۔ مسلمانوں نے برصغیر پر جو حکومت کی تھی وہ اپنی شجاعت' بلند حوصلگی اور دریا دلی کی وجہ سے کی تھی۔ تعداد کی کثرت کی وجہ سے نہیں کی تھی۔ وہ صفات جنھوں نے مسلمانوں کو ایک ہزار برس تک سربلند کئے رکھا تھا اب انگریز کی منڈی میں بے قیمت ہو گئی تھیں۔ انگریز نے جس کا دماغ مغربی جمہوریت کا تربیت یافتہ تھا ایمانداری یا چالاکی سے اپنی مراعات اور اصلاحات کی بنیاد کثرت تعداد پر رکھی۔

مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں تعداد کے لحاظ سے ایک چوتھائی تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اس قلت تعداد کا علاج بھی کیا کر سکتے تھے یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا کوئی حل ہی نہیں تھا۔ انگریز بحیثیت حاکم کے مسلمان حاکموں سے مختلف تھے۔ مسلمان حاکموں نے اپنے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں کبھی ہندوؤں کے رسم و رواج سے ان کی تہذیب و تمدن سے 'ان کے علم و مذہب سے تعرض نہیں کیا۔ ان کی معاشرتی زندگی میں مداخلت نہیں کی یہاں تک کہ ہندو

محکوم ہونے کے باوجود مسلمانوں سے چھوت چھات برتتا تھا اور مسلمان حاکم ہو کر اس بات کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا تھا۔

انگریز حاکم کا عقیدہ یہ تھا کہ اس کی تہذیب اور طرز حکومت اور علم و مذہب ہی میں تمام انسانیت کے لئے واحد ذریعہ نجات ہے تمام ایشیائی قومیں پسماندہ اور غیر مہذب ہیں وہ تمام قوموں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا تھا۔ پسماندہ اور غیر مہذب قوموں کے لئے بس دو راستے تھے یا تو وہ اس سانچے میں ڈھلیں یا ختم ہو جائیں۔

پہلے تو مسلمان کسی قیمت پر انگریز سے تعاون کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے لیکن جب سرسید نے یہ دیکھا کہ انگریزوں کی اس برصغیر میں بالادستی ایک امر واقعہ ہے اور امر واقعہ کو تسلیم نہ کر کے انسان جھنجھلاہٹ میں خودکشی تو کر سکتا ہے لیکن زندہ رہنے کی تدبیر امر واقعہ سے مفاہمت کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کے علوم سیکھنے اور ان سے تعاون کرنے کی ترغیب دی کہ اب مثبت راستہ مسلمانوں کے لئے محض یہی رہ گیا تھا۔ تو مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ وہ جو اس ملک میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ملازمت میں سیاست میں حکومت اور تجارت میں غرض ہر شعبہ زندگی میں ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور چونکہ ہندو اپنی کثرت تعداد کو اور اپنی بہتر تنظیم کو اپنا ذیلی اقتدار بڑھانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس لئے یہ فاصلہ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

مسلمانوں کی حیثیت مسلمانوں کی سیاست لے دے کر یہ رہ گئی تھی کہ وہ ہندوؤں کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف انگریز سے کچھ ضمانتیں حاصل کریں۔ ملازمتوں میں ان کا تناسب بڑھ جائے اسمبلیوں میں ان کی نشستیں مقرر اور مخصوص ہو جائیں اور اس کے لے ظاہر ہے کہ انگریزوں کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ سیاست مسلمانوں کے آزاد پسند جیالوں کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے لیکن مختلف

پلیٹ فارموں پر قربانیاں دیتے تھے لیکن رنگ برنگے جھنڈوں کے تلے۔ جو قربانیاں وہ دیتے تھے اس کا فائدہ ہندو قوم کو پہنچتا تھا۔

ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ مسلمانوں کی قربانیوں سے ہندو تحریکیں پنپتی تھیں۔ پیر کنعاں کا نور دیدہ چشم زلیخا کو روشن کرتا تھا اور مسلمانوں پر اغیار کا یہ طعنہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت کے پٹھو ہیں اور برصغیر کی آزادی میں رکاوٹ ہیں۔ مسلمانوں کے دل و دماغ پر یہ احساس کمتری دھوئیں کی طرح چھایا ہوا تھا کہ وہ ہندوستانی قوم کی ایک اقلیت ہیں اور اقلیت بھی ایسی جس کے اکثریت میں تبدیل ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس سیاسی انتشار میں علی برادران جیسے زعیم بھی جن کو قدرت نے بصیرت اور جذبہ عمل کی بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اپنی قربانیوں سے مسلمانوں کو کوئی سیاسی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ جو کسی واضح موقف کی موجودگی میں وہ پہنچا سکتے تھے۔

یہ تھا پس منظر قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کا۔ قیادت آسمان سے نہیں اترا کرتی نہ وراثت میں ملتی ہے نہ چال بازیوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ قیادت شعور اور نظر کا نام ہے۔ اس شعور کو حاصل کرنے کے لئے تجربہ کی بھٹی میں ریاض کرنا پڑتا ہے۔ قوم میں آزادی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کی گھٹی گھٹی امنگوں کے اوپر سے احساس لاحاصلی کی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور ان کے اظہار کے لئے ایک راستہ پیدا ہو جاتا ہے خود اعتمادی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ خواب جو اجتماعی روح دیکھتی ہے متشکل ہو کر ایک ایک فرد کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قدم تیزی سے اس وقت اٹھتا ہے جب منزل سامنے ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔

قائد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم میں آزادی کی تڑپ پیدا کردے خود اعتمادی کو پیدا کر دے اور منزل کو متعین کر کے اس منزل کی طرف اپنے قافلے کو تیزی سے گامزن کردے۔ وہ

قوم کی آنکھ بن کر پہلے اپنے آپ کو یعنی اپنی قوم کو دیکھتا ہے اور پھر اپنی منزل کو دیکھتا ہے اپنے آپ کو دیکھے بغیر کوئی شخص اپنی منزل کو نہیں دیکھ سکتا۔

قائد اعظم نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اس عقیدے سے کیا کہ تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں مسلمان اور ہندو دو مختلف مذاہب کے پیرو سہی لیکن یہ بات ان کے ایک قوم ہونے کے منافی نہیں۔ ہندوستانی جتنا علم اور کردار میں ترقی کریں گے اور آہنی ہتھیاروں کو موثر طریقوں سے استعمال کرنا سیکھیں گے اتنا ہی وہ آزادی سے نزدیک تر ہوتے جائیں گے۔

تجربے نے قائد اعظم کو یہ بات بتائی کہ ہندو اور مسلمان دو عقیدوں کا نام نہیں بلکہ یہ دو جماعتیں ہیں۔ جن کی مستقل حیثیت ہے۔ لیکن ان کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ دو جماعتیں ایک ہی قومیت کے دائرے میں باہم عہد و پیماں کے ذریعے بغیر ایک دوسرے پر ظلم یا جور کئے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہ سکتی ہیں۔ ان کی تمام کوششیں اس مقصد کے لئے وقف ہو گئیں کہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ تاکہ برصغیر کی آزادی کا دن نزدیک آجائے۔

یہ بات بھی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ اب قائد اعظم نے دیکھا کہ معاملہ ایک قوم میں اکثریت یا اقلیت کا نہیں تھا اگر بات یہی ہوتی تو معاملہ کبھی کا سلجھ بھی چکا ہوتا۔ معاملہ دو قوموں کی کشمکش اور رقابت کا تھا جس روز قائد اعظم نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں انگریز اور کانگریس نہیں بلکہ تین طاقتیں انگریز، کانگریس اور مسلمان ہیں اس روز ایک حقیقت جس کو مسلمانوں کی غلط آزاد خیالی نے، انگریزوں کی حکمت عملی نے اور ہندوؤں کی مفاد پرستی نے داروئے بے ہوشی دیکر سلا رکھا تھا بیدار ہو گئی اور ایک قدیم بنیادی حقیقت کے بیدار ہونے ہی کا نام انقلاب ہے۔ یہ بات نہیں کہ قائد اعظم نے جب دیکھا کہ ہندو مسلمانوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا تو انہوں نے ایک سیاسی چال کے طور پر یہ کہہ دیا کہ مسلمان ایک

علیحدہ قوم ہی نہیں بلکہ قائداعظم نے یہ دیکھ لیا کہ ان کوششوں میں ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ جس کو وہ ایک قوم میں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ سمجھ رہے تھے وہ درحقیقت دو قوموں کا مسئلہ ہے۔ اب وہ کنجی مل گئی جس کے ذریعے مسلمانوں کی سیاست کے تمام عقدے جو گتھیاں ہو کر الجھے پڑے تھے کھل سکتے تھے۔ ان میں اپنے ماضی کا بھی شعور پیدا ہو گیا اور وہ اپنے حال کو بھی سمجھ سکتے تھے اس حقیقت کے بیدار ہوتے ہی اقلیت کا تباہ کن تصور ایک سیاہ سائے کی طرح ختم ہو گیا۔ خود شناسی سے خود اعتمادی کا پیدا ہونا تو ایک لازمی امر ہے۔

جب یہ شعور پیدا ہو گیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں تو اب سوال یہ تھا کہ اس قوم کی بنیادی نوعیت کیا ہے آخر اب تک یہ بات کیوں نہ نظر آئی تھی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عام طور سے قومیت کی جغرافیائی بنیاد ہوتی ہے ایک جگہ اور ایک ملک میں رہنے والے لوگ ایک ہی قوم گردانے جاتے ہیں۔

ہندو اور مسلمان بھی ایک قوم اسی لئے سمجھے جاتے تھے کہ وہ ایک ہی وطن میں رہتے تھے لیکن مسلم قوم کی بنیاد جغرافیائی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد ان کا مذہب تھا اور وہ تہذیب و تمدن جو اس مذہب کے زیر اثر پیدا ہوا۔ جو باتیں ان میں اور ہندوؤں میں مشترک تھیں وہ سطحی تھیں جو باتیں ہندوؤں کو ان سے ممیز کرتی تھیں بنیادی تھیں۔

اور اس تہذیب و تمدن کو آزادانہ طور پر پروان چڑھانے کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت تھی۔ گویا اب قوم نے اپنے آپ کو بھی دیکھ لیا اور اپنی منزل کو بھی دیکھ لیا۔ وہ منزل یہ تھی کہ آزاد مملکت حاصل ہو تاکہ اپنے مخصوص طرز زندگی کو پروان چڑھایا جائے۔ آزاد مملکت کا حصول ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقصد اپنی تہذیب کی تجدید و تخلیق ہے۔ شرط پوری ہو چکی جزا کا انتظار ہے۔ اگر ہندو اپنی مملکت میں اپنے طور پر آزادانہ زندگی گزاریں اور مسلمان اپنے ملک میں اپنے طور پر آزادانہ زندگی گزاریں تو تصادم یا جنگ کی کوئی وجہ نہیں

ہے لیکن وہ خواب جو ہندوؤں نے برصغیر کی سیاسی شب کے آخری حصے میں دیکھا تھا روز روشن میں بھی ان کے دماغ کے پیچ و خم میں گردش کرتا رہتا ہے اور ان کو دیوانہ بنائے رکھتا ہے۔ اور جب تک پڑوسی کو یہ نفسیاتی مرض لاحق ہے ہم کو ہوشیار ہی رہنا چاہئے شاید ابھی یہ مسئلہ طے ہونا ہے کہ برصغیر ہندپاک میں ہندو اور مسلمان دو قوموں کی اضافی حیثیت کیا ہوگی۔

قائداعظم نے کچھ بنیادی حقیقتیں اجاگر کیں وہ اپنی قوم کے لئے دیدہ بینا کی حیثیت رکھتے تھے جس کے ذریعے قوم نے اپنے آپ کو اور اپنی تقدیر کو دیکھ لیا۔ آج وہ آنکھ موت کی نیند میں بند ہے۔ لیکن اس کی روشنی میں ہمیں اپنی منزل کی طرف قدم بڑھانا ہے۔

ہفت روز آہنگ کراچی

۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء

قائداعظم اور سندھ

کرامت علی خاں

سرزمین سندھ برعظیم کا وہ خطہ ہے جو سب سے پہلے مسلمانوں کے زیرِ نگیں آیا۔ سندھ کے لوگوں کے سرزمین حجاز سے تعلقات کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف "عرب ہند تعلقات" میں خاصی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانے سے اہل سندھ اور عربوں کے درمیان تعلقات استوار تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے آنحضرتؐ کے ساتھ خاص شکل و شباہت کے لوگوں کو دیکھا تھا جن کی نسبت ابن مسعود نے بتایا ہے کہ ان کے چہرے جاٹوں کے طرح تھے۔ جاٹ جس کا عربی تلفظ "زط" ہے سندھ کی ایک مشہور برادری یا قوم تھی۔

اسی طرح ابو ظفر ندوی نے بلاذری کے حوالے سے "تاریخ سندھ اور تاریخ گجرات" میں لکھا ہے کہ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام کی آواز برصغیر کے ساحلی علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ۱۵ سن ہجری (۶۳۶ سن عیسوی) میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر فرمایا۔ گورنر بننے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائی حکم کو بمبئی سے متصل صوبہ مہاراشٹر کے ضلع تھانہ پر حملہ کا حکم دیا۔ یہ جگہ اس زمانے میں ایک پر رونق بندرگاہ تھی۔ تھانہ کے بعد دوسرا حملہ گجرات کے مشہور شہر بھروچ پر ہوا۔ انہی دنوں عثمان ثقفی کے چھوٹے بھائی مغیرہ کی سرکردگی میں ایک اور بحری فوج نے سندھ کی اہم بندرگاہ دیبل پر حملہ کیا۔ اس وقت دیبل پر داہر کا والد چچ حکمران تھا۔ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک مہم "ہندو سندھ" کے سیاسی حالات دریافت کرنے کے لئے روانہ کی گئی جو غالباً" بلوچستان اور مکران تک کے حالات معلوم کر سکی۔ حضرت علیؓ کے بعد خلافت میں صغیر بن داؤد کی سرکردگی میں ایک جماعت سندھ پر حملہ آور ہوئی لیکن حضرت

علیؓ کی شہادت کے باعث صغیر بن داؤد کو واپس لوٹنا پڑا۔

محمد بن قاسم ۹۳ سن ہجری بمطابق ۷۱۱ھ سن عیسوی (بعض لوگوں کے مطابق ۹۲ سن ہجری) دیبل (موجودہ کراچی) پر حملہ آور ہوا اور صرف دو سال کی مختصر مدت میں ملتان تک کا علاقہ مسلمانوں کے حلقہ اختیار میں آگیا۔ محمد بن قاسم کے بعد کم و بیش پونے تین سو سال تک عرب گورنر اس علاقے پر متعین رہے۔ مسلمانوں کی آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد جب ہندو راجاؤں کو مسلمانوں کی گرفت کمزور ہوتی نظر آئی تو انہوں نے بازار جدال و قتال گرم کیا اور انہیں اس سرزمین سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی۔ بہت سی مقامی آبادی جو اعلیٰ جاتی کے ہندوؤں کی جانب سے روا رکھی جانے والی عدم مساوات اور دوسری جانب مسلمانوں کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر چکی تھی ان کے لئے بھی عرصہ عافیت تنگ کر دیا گیا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو دوبارہ ہندو بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ گویا ایک طرح سے یہ ہندو مسلم فساد کا پہلا واقعہ تھا جو مسلمانوں نے اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ بستی "محفوظہ" کی بنیاد رکھی۔ یہی محفوظہ بعد میں منصورہ شہر کا حصہ بن گیا۔ محفوظہ اس اعتبار سے سرزمین سندھ پر مسلمانوں کا اولین "ننھا پاکستان" تھا۔

حضرت قائد اعظم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ برعظیم میں پاکستان کی بنیاد اسی روز پڑ گئی تھی جس روز یہاں پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔ ایک فرد کے اسلام قبول کر لینے سے ایک مسلمان سلطنت کی بنیاد کس طرح پڑی؟ اس ایک جملے کی وضاحت اور اسے سمجھنے کے لئے سرزمین سندھ کی ابتدائی اسلامی تاریخ کو جاننا بے حد ضروری تھا۔ فرد کے مسلمان ہونے سے ایک نئے سیاسی انداز فکر اور معاشی، معاشرتی و تمدنی اور اخلاقی شعور نے جنم لیا اور وقت کے ساتھ ساتھ برعظیم میں ایک کی بجائے دو تمدنی دھاروں کا بہاؤ صاف نظر آنے لگا۔ ان کی سمتیں متقابل ہی نہیں بلکہ واضح طور پر متخالف نظر آنے لگیں۔ ہندو کی تنگ نظری جس کا

مظاہرہ اس نے مسلمان کے خلاف سندھ میں کیا وہ آنے والی بارہ صدیوں میں سارے برعظیم میں بار بار دہرایا گیا۔ ہندو راجاؤں کا مسلمان حکمرانوں کے خلاف بار بار اکٹھا ہونا اور ان سے برسرپیکار ہونا بھی درحقیقت اسی ہندو عصبیت کا مظاہرہ تھا۔ اگر کسی دور میں کسی مسلمان حکمران نے کوشش کرکے ہندو اور مسلمان کو باہم شیر و شکر کرنے کی کوشش بھی کی تو ہندو کی جانب سے ذبیحہ گاؤ پر پابندی لگانے کی شرط رکھی گئی، یعنی یہ کہ اپنے تعاون کی قیمت اس طرح وصول کرنے کی کوشش کی گئی۔

برعظیم پر جب تک اقتدار مسلمان کے ہاتھ میں رہا، ہندو اپنی من مانی نہ کرسکا، لیکن جونہی مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور انگریز برسر اقتدار آیا تو انہوں نے مسلمان سے گن گن کر بدلے لیے۔ ان کا سیاسی استحصال ہی نہیں بلکہ اقتصادی استحصال بھی کیا۔ چند لوگوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی غالب اکثریت فلاکت زدہ ہو گئی۔ ان پر روزگار کے دروازے اس لئے بند کر دیے گئے کہ وہ مسلمان تھے۔ ہندو نے مسلمان کا اقتصادی مقاطعہ اس طرح کیا کہ ہندو کسی مسلمان دکاندار سے کوئی چیز نہ خریدتا جبکہ مسلمان نے کبھی ہندو یا مسلمان دکاندار کا امتیاز روا نہ رکھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سیاسی مصالح کے تحت بعض مسلمان اکثریت والے علاقوں کی حد بندی اس طرح کی گئی کہ ان کی اکثریت کو یا تو اقلیت میں بدل دیا گیا یا پھر ان کی اکثریت کو غیر موثر بنا دیا گیا۔ اس کی مثال بنگال اور سندھ کی مسلمان اکثریت والے علاقے تھے۔ سندھ کو بمبئی کے ساتھ ملا دیا گیا اور سندھ کا خطہ جو کم و بیش بارہ سو سال سے ایسے علاقے سے مربوط تھا جو اس کے مغرب یا شمال میں تھے، اسے جنوب کے علاقے سے وابستہ کر کے اس کا دوسرے مسلمانوں کی اکثریت والے علاقے سے تعلق ختم کرنے کی سازش کی گئی۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ اگر پنجاب انگریزوں کے تسلط میں پہلے آجاتا تو عین ممکن تھا کہ سندھ کو پنجاب کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔ یہ دلیل اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ بمبئی اور

سندھ کے درمیان کم و بیش ایک ہزار میل کا ریگستانی علاقہ حائل ہے اور وہاں کے لوگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اور یہ کہ سندھ کا بمبئی کے ساتھ ادغام محض انتظامی سبب سے تھا' کچھ زیادہ وزنی نہیں۔ انگریز فی الواقعی یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا انتظامی یونٹ یا صوبہ قائم رکھا جائے جس میں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ پنجاب اور موجودہ صوبہ سرحد کے علاقوں کو زیر تصرف لانے کے بعد انگریز نے دہلی سے لے کر پشاور تک ایک صوبہ بنایا لیکن جب اس نے مقامی لوگوں کو کچھ سیاسی حقوق دینے کا ارادہ کیا تو ۱۹۰۱ء میں صوبہ سرحد کے نام سے ایک الگ صوبہ بنا دیا حالانکہ دہلی سے پشاور تک سارا علاقہ صوبہ پنجاب ہی کہلاتا تھا۔ اگرچہ یہ علیحدگی انتظامی سہولت کے نام پر کی گئی (دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت تک ایک بھی آواز علیحدگی کے لئے نہیں بلند ہوئی تھی) لیکن حد بندی کرتے وقت پنجاب میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کو اس حد تک گھٹایا گیا کہ وہ غیر مسلموں سے تعداد میں چار سے چھ فیصد ہی زیادہ تھے۔ خاص طور پر ضلع ہزارہ کی پنجاب سے علیحدگی کا تو کوئی انتظامی جواز ہی نہ تھا جو نہ صرف جغرافیائی طور پر پوٹھوہار سے متصل تھا بلکہ وہاں کے لوگوں کی بول چال اور ان کا رہن سہن پوٹھوہار جیسا ہی تھا۔ اس اقدام کا دوسرا سبب یہ تھا کہ ایک خالص مسلمان آبادی والے علاقے کو غیر انسانی اور کالے قوانین کے تابع کر کے انہیں تمام انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ اگر سندھ کو پنجاب کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تو پنجاب اور سندھ کے سارے علاقے میں غیر مسلموں کا تناسب کم ہو جاتا۔ اس لئے انگریز نے یہ قدم انتظامی وجوہ کی بجائے سیاسی وجوہ کی بنا پر اٹھایا۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے بعد جب انگریز کے پاس سارے کوائف موجود تھے تو کیوں سندھ کو بمبئی سے الگ نہ کیا گیا جب کہ شروع ہی سے اس کا مطالبہ کیا جاتا رہا اور سرحد کو پنجاب سے کیوں الگ کیا گیا جبکہ اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا یہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کی وجوہ سیاسی تھیں' یعنی یہ کہ مسلمان کو ابھرنے نہ دیا جائے۔

جہاں تک شمال مغربی سرحدی صوبہ کا تعلق ہے وہاں قانونی اصلاحات کے نفاذ کے لئے ۱۹۲۱ء سے مطالبہ کیا جا رہا تھا لاہور کے روزنامہ زمیندار نے "سرزمین بے آئین" کے موضوع پر کئی مقالات لکھ کر رائے عامہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی، لیکن سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ تو اس سے بہت پہلے سے کیا جا رہا تھا۔ بعض لوگوں نے عبداللہ ہارون کے حوالے سے یہ بات تحریر کی ہے کہ ۱۹۲۹ء میں یہ مطالبہ تقریباً" چالیس برس پرانا تھا۔ گویا مسلمانوں نے ۱۸۹۰ء کے لگ بھاگ یہ احساس کر لیا تھا کہ سندھ کا بمبئی سے علیحدہ کیا جانا ضروری ہے لیکن اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر سب سے پہلے مطالبہ قائداعظم محمد علی جناح نے ان تجاویز میں کیا جنہیں تجاویز دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو ۱۹۲۷ء میں پیش کی گئیں۔ تجاویز دہلی کا ذکر کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایک ایسے شخص کی جانب سے کھلم کھلا مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنے کا مطالبہ کیوں کیا گیا جس نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے صرف کیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں برصغیر میں پوری طرح تسلط حاصل کرنے کے بعد انگریز کو اپنے نئے مفتوحہ علاقے پر پورا تصرف رکھنے کے لئے مقامی آبادی کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ اس کی نظر انتخاب مسلمان پر نہیں پڑ سکتی تھی کیونکہ اس نے مسلمانوں کے ایک ہزار سال سے بھی زائد سیاسی تغلب کو ختم کیا تھا۔ اس کے لئے اسے بہتر تعاون کی امید اس قوم سے ہو سکتی تھی جس پر مسلمان نے حکومت کی تھی، یعنی ہندو۔ ادھر ہندو جو کئی صدیوں سے مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکنے کی وجہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا، اس بات سے خوش تھا کہ نئے حاکموں کے ساتھ مل کر اسے اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ اس نے اس کا اظہار جلد ہی کر دیا۔ مسلمانوں کا سیاسی غلبہ تو پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا۔ اب اس نے مسلمانوں کے علمی و تہذیبی اثر کو بھی ختم کرنے کے لئے فارسی اور اردو کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس

لئے یہ طریق اختیار کیا گیا کہ اس کی سرکاری حیثیت ختم کی جائے۔ چنانچہ مرشد آباد میں اردو کی بجائے ہندی کو عدالتی زبان قرار دے دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں پہلی بار انگریز کے آنے کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد سرسید احمد خان نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہم اتحاد کے لئے بہت کام کیا تھا۔ لیکن ہندوؤں کی جانب سے عدم رواداری کا جو مظاہرہ ہوا وہ اس پر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا راستہ جدا جدا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بنارس کے انگریز کمشنر کے نام ایک خط میں لکھا۔ "ہندو اور مسلمان سیاسی معاملات میں کبھی ایک دوسرے سے تعاون نہیں کر سکیں گے کیونکہ ان کے درمیان اختلافات کی خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔" انہوں نے یہ اچھی طرح جان لیا تھا کہ انگریزوں کے برعظیم سے چلے جانے کے بعد ہندو اس پر قبضہ کر لیں گے اور مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔

ہندو اگرچہ دور جدید کے جمہوری تقاضوں سے واقف نہیں تھا کیونکہ برعظیم میں انگریزوں کی آمد سے قبل اس قسم کا نظام حکومت استوار نہیں تھا۔ مسلمان کو مغلوب رکھنے کے لئے انگریز نے ہندو کی سیاسی تربیت کا انتظام کیا اور دوسری جانب جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے' ان علاقوں کی جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اس طرح حد بندی کی گئی کہ وہ برائے نام اکثریت میں رہ گئے اور کچھ مسلمان علاقوں کو جان بوجھ کر ظالمانہ نظام حکومت کے تحت کر دیا گیا مقصد یہ تھا کہ ہندو اکثریت کو ساتھ لے کر حکمرانی کا تسلسل و تواتر برقرار رکھا جائے۔ صوبہ سرحد میں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء میں کی جانے والی اصلاحات کا نفاذ روک دیا گیا۔ جب مسلمانوں نے اس پر شور مچایا تو ۱۹۲۱ء میں اس کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے چیئرمین سر ڈینس برے تھے جو صوبہ سرحد کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ انہوں نے کھلم کھلا ان اصلاحات کی مخالفت کی اور کہا کہ ان اصلاحات کا اثر ہندو اقلیت پر برا اثر پڑے گا۔ چنانچہ انگریز نے ۱۸۸۱ء

کی مردم شماری کے نتائج کا تجزیہ کرنے کے بعد ۱۸۸۵ء میں انڈین کانگریس کی بنیاد رکھی۔ مسلمان تو پہلے ہی انگریزی طرز تعلیم کا بائیکاٹ کر چکا تھا۔ اگر اس سے کسی کو فائدہ پہنچانا یا تربیت دینا مقصود تھا تو وہ ہندو ہی ہو سکتا تھا۔ مسلمان زعما نے کھلم کھلا اس جماعت میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کی۔ انگریز نے جو انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا تھا اس میں مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف پہلی مرتبہ منظم کوشش ۱۹۰۶ء میں شروع کی۔ اسی سال ایک وفد شملہ میں سر آغا خاں کی سرکردگی میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا جس میں مسلمانوں کا نقطہ نظر اور ان کے مسائل پیش کئے گئے۔ اس ملاقات میں دو باتوں پر زور دیا گیا کہ مسلمانوں کو مقامی اور قومی سطح کے اداروں میں علیحدہ نشستیں دی جائیں اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو ان کی سیاسی اہمیت کے مطابق مقام دیا جائے۔ چنانچہ اسی سال دسمبر میں مسلم لیگ کی بنیاد بھی رکھی گئی اور برعظیم کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت اس کا نصب العین قرار پایا۔

۱۹۰۹ء میں تقریباً" چالیس برس کے پیہم اصرار پر مسلمانوں کا جداگانہ نیابت کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ بات ہندو کو پسند نہ تھی۔ کیونکہ وہ کوئی ایسی بات قبول نہیں کر سکتا تھا جس کے ذریعے مسلمان کو اقتدار میں حصہ دار بنایا جائے۔ انگریز نے بعض انتظامی ضرورتوں کے تحت ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ مشرقی حصے میں مسلمانوں کی تعداد غالب تھی لیکن ہندو نے اس تقسیم کو ختم کرانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ انگریز کو خوفزدہ کرنے کے لئے بموں کے دھماکے کئے گئے اور باقاعدہ ایجیٹیشن کی گئی۔ چونکہ انگریز کو ہندو کی خوشنودی منظور تھی اس لئے ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کے تخت نشینی کے موقع پر تقسیم بنگال منسوخ کر دی گئی جس پر ایک بہت بڑے کانگریسی لیڈر امبیکا چرن موزمدار نے جوش مسرت میں یہ کہا کہ ہمارے دل تاج برطانیہ کی وفا کیشی کے جذبہ سے مسرور ہو کر ناچ رہے

ہیں۔ لیکن اسلامی حلقوں میں مشرقی بنگال کا مسلمان صوبہ ختم کئے جانے پر صف ماتم بچھ گئی۔

قائداعظم محمد علی جناح اس دور میں سیاسیات میں نہ صرف یہ کہ دلچسپی لینے لگے تھے بلکہ انہوں نے ملکی سیاست میں اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کرلیا تھا۔ آپ دادا بھائی نوروجی کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں شامل ہوئے جہاں نوروجی نے حکومت خود اختیاری کا خاکہ پیش کیا اور آپ نے وقف علی الاولاد کی ضرورت پر معرکہ آراء تقریر کی۔ اس تقریر سے آپ کے جوہر نمایاں ہوئے اور برعظیم کے بڑے بڑے لیڈر آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ آپ کی طبعیت کا میلان چونکہ ہندو اور مسلمان کے درمیان صلح جوئی کی طرف تھا۔ اس لئے آپ ان کے درمیان اتحاد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۱۰ء میں الہ آباد کی اتحاد کانفرنس میں شرکت کی جو ناموافق حالات کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی سال آپ امپریل کونسل کے رکن بن گئے جہاں آپ نے وقف بل منظور کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کے لیڈر بننے کے باوجود مسلمانوں نے ان سے عقیدت کا اظہار شروع کر دیا۔ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ مسٹر گاندھی افریقہ سے برعظیم وارد ہوئے۔ وہ ہندوستانی سیاسیات میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ اس وقت تک قائداعظم برعظیم کے ایک مسلمہ لیڈر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ جلسہ جس میں پہلی مرتبہ مسٹر گاندھی کو متعارف کرایا گیا' قائداعظم کی زیر صدارت منعقد کیا گیا۔

قائداعظم اگرچہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے سلسلے میں ہندوؤں کی حرکات سے واقف تھے۔ لیکن وہ دیانت داری سے محسوس کرتے تھے کہ انگریز سے آزادی ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ وہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو جانے کے بعد بھی کوشش کرتے رہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر انگریز کے خلاف محاذ بنائیں۔ چنانچہ یہ ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس ایک ہی شہر میں منعقد ہوتے رہے۔ یہ عمل کم و بیش

دس برس تک جاری تھا۔ اس عرصہ میں سب سے اہم اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ کانگریس اور مسلم لیگ کا ایک مشترکہ اجلاس سر ریندر ناتھ بینرجی کی صدارت میں ہوا اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ مرتب ہوا جس کی تصدیق ۲۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئی۔ اس معاہدہ کو لکھنؤ پیکٹ کا نام دیا گیا۔ اس معاہدہ کی سب سے اہم شق یہ تھی کہ مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے حق کو تسلیم کرلیا گیا نیز یہ کہ کوئی قانون منظور نہیں کیا جائے گا۔ جب تک اس کی تائید کسی قوم کے تین چوتھائی ارکان نہ کریں۔ بظاہر کانگریس نے یہ بات تسلیم کرلی تھی لیکن ہندوؤں کا فرقہ پرست گروہ اس کے خلاف تھا چنانچہ اس زمانہ میں ہندو مہاسبھا کی بنیاد رکھی گئی جو کھلم کھلا اس بات کا مطالبہ کرتی تھی کہ جداگانہ نیابت کو ختم کیا جائے۔ باوجود اس کے کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کی جاتی رہیں اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں دوستی کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آئے۔ لیکن ان دونوں تحریکوں کے خاتمہ پر سارے برعظیم میں وسیع پیانے پر ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ صوبائی اور مرکزی کونسلوں میں کانگریس کے مقابلہ میں ہندو مہاسبھا بھاری تعداد میں اپنے نمائندے بھیجنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے لیڈر موتی لال نہرو بعض مہاسبھائی لیڈروں کی "نوازش" سے کامیاب ہوئے۔ اس کا اثر کانگریس کی جماعتی سیاست پر ہوا اور وہ ملکی سیاست میں ہندو مہاسبھا کی آلہ کار بن گئی۔ چنانچہ کانگریس کی بعد کی ساری کی ساری حکمت عملی وہی رہی جو ہندو مہاسبھا کی تھی۔ سیاسیات نے یہ رخ ۱۹۲۷ء میں اختیار کیا چنانچہ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں قائداعظم نے محسوس کرلیا کہ اب ہندو اور مسلمان کی سیاست کی راہیں جدا جدا ہیں۔ وہی شخص جو برعظیم میں ہندو مسلم اتحاد کا نقیب اور پیامبر کہا جاتا تھا کھل کر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے' انگریز نے ہندو نوازی اور مسلم دشمنی کے لئے بعض ایسے اقدامات کئے تھے جن سے مسلمانوں کی شدید حق تلفی ہوتی تھی۔ قائداعظم نے ان کے لئے آئینی مراعات کا مطالبہ کیا۔ ان میں سب سے اہم مطالبہ سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی تھی۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خود سندھ کے ہندو بھی سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ کرتے آئے تھے لیکن جب قائداعظم نے اس کی علیحدگی کا مطالبہ کیا تو ہندوؤں کی جانب سے یہ کہا جانے لگا کہ اقتصادی لحاظ سے صوبہ سندھ بہت پسماندہ ہے اور اگر اسے بمبئی سے الگ کر دیا گیا تو وہ اس قدر اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ قائداعظم کا یہ مطالبہ ان تجاویز کا حصہ تھا جنہیں ہماری تاریخ آزادی میں تجاویز دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان تجاویز میں دوسری اہم تجاویز صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات رائج کرنا اور انہیں دوسرے صوبوں کے مساوی حقوق دینے سے متعلق تھا۔

تجاویز دہلی کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قائداعظم نے مشترکہ یا مخلوط انتخاب کو اس شرط پر قبول کیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنایا جائے' سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں' پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے ہو اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں مخصوص کی جائیں۔ ہندو مہاسبھا نے مخلوط انتخاب کی تجویز کو منظور کر لیا اور باقی تمام تجاویز کو مسترد کر دیا لیکن کانگریس نے یہ تجاویز مان لیں۔ لیکن اس زمانے میں ہندو سیاست پر مہاسبھا کا غلبہ تھا اس لئے کانگریس کی منظوری بے معنی ہو کر رہ گئی لیکن مسلمان برابر اپنے مطالبہ پر ڈٹے رہے۔ پنجاب نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا اور ان تجاویز کے حق میں آواز بلند کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مئی ۱۹۲۷ء میں لاہور میں ہندو مسلم فساد ہو گیا اور یہ تجاویز اس سے متاثر ہوئیں۔

نومبر ۱۹۲۷ء میں وائسرائے نے اعلان کیا کہ برطانیہ کی طرف سے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا

جائے گا جو اصلاحات کے متعلق لوگوں کی رائے دریافت کرے گا یہ شاہی کمیشن برعظیم کی سیاسی تاریخ میں سائمن کمیشن کے نام سے مشہور ہے۔ قائداعظم نے اس کمیشن کی مخالفت کی۔ چنانچہ طے پایا کہ مختلف سیاسی جماعتیں مل کر مارچ ۱۹۲۸ء میں کنونشن طلب کریں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مل کر ایک دستور اساسی مرتب کریں جس کے تحت برعظیم میں اصلاحات رائج کی جائیں۔ اس کنونشن میں جو مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ موتی لال نہرو کی صدارت میں دستور ساز کمیٹی مقرر کی گئی جس نے جولائی میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں مخلوط انتخاب کی حمایت کی گئی لیکن سندھ کی علیحدگی سے متعلق یہ شرط لگادی کہ اگر یہ صوبہ اپنے مصارف کا متحمل ہو سکے تو اسے بمبئی سے علیحدہ کردیا جائے۔ بعض مسلمان زعما نے اس کی مخالفت کی اور بعض نے موافقت کی۔ لیکن قائداعظم نے فرمایا کہ اس رپورٹ میں تبدیلیاں کر کے اسے قبول کرلیا جائے۔ ان کی رائے تھی کہ تجاویز دہلی کے مطابق اس میں ترامیم کی جائیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے جو اس وقت برطانیہ میں تھے، برعظیم واپسی پر اس رپورٹ کی شدت سے مخالفت کی اور فرمایا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خلق خدا کی، ملک وائسرائے کا، پارلیمان برطانیہ کا اور حکم ہندو مہاسبھا کا۔

ان حالات میں مسلم لیگ کی جانب سے نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے اجلاس طلب کیا گیا۔ اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کی گئی۔ مخالفت کرنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ ادھر کانگریس یہ دھمکی دے رہی تھی کہ اگر نہرو رپورٹ میں تبدیلی کی گئی تو ساری رپورٹ واپس لے لی جائے گی۔ اس دھمکی کی پروا کئے بغیر قائداعظم نے اپنے شہرہ آفاق ۱۴ نکات پیش کئے جن میں وہ تمام مطالبات دہرائے گئے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ یعنی یہ کہ سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں جیسی خود مختار حکومتیں قائم کی جائیں، صوبائی نظام میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس سے پنجاب

اور بنگال کی اکثریتوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اور یہ کہ کسی مجلس قانون ساز میں کسی قوم کے ۷۵ فی صد ممبر کسی مسودہ قانون میں ترمیم کے لئے رضامند نہ ہوں تو اسے پیش نہ کیا جائے۔ الغرض ان نکات میں بھی قائداعظم نے سندھ کی خصوصی حیثیت کا خیال رکھا۔

قطع نظر اس بات کے کہ قائداعظم کی ولادت کراچی میں ہوئی اور یہ کہ سندھ اپنے اس سرمایہ ناز فرزند پر فخر کر سکتا ہے کہ جس نے برعظیم کی سیاست پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑا' ہم اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قائداعظم کی دوربیں نگاہوں میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ سندھ کے مسلمانوں کی ہندوؤں سے گلو خلاصی کے لئے اس کا بمبئی سے الگ کیا جانا ضروری ہے۔ مجھے اپنی جگہ پر اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ قائداعظم نے ایک ماہر وکیل کی طرح اپنے مدمقابل پر یہ افشا کئے بغیر کہ اس کا آئندہ قدم کس جانب اٹھے گا' اپنے ذہن میں یہ طے کر لیا تھا کہ انہیں ایک الگ ملک بنانا ہے اور اس کے لئے صوبہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اولین قدم کی حیثیت رکھتی ہے آج کی سیاسی دنیا میں اس قسم کی ڈپلومیسی کو قدم بہ قدم حکمت عملی کا نام دیا گیا ہے۔

سہ ماہی صحیفہ لاہور قائداعظم نمبر

ستمبر دسمبر ۱۹۷۶ء

maablib.org

قائداعظم برصغیر کی سیاسی تاریخ کی جامع ترین شخصیت تھے

مختار زمن

چگی داڑھی اور گنجے سر والے پستہ قد لینن نے کہا۔ "تاریخ میں طبقاتی جنگ کا کوئی مسئلہ تشدد کے بغیر حل نہیں ہوا' پھر بارود کے دھوئیں کے پس منظر میں انقلاب برپا کر کے اس نے سوویت یونین کی بنیاد ڈال دی اور خدا سے پوچھا۔"

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

لینن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا تھا۔

فربہ اندام' گول مٹول چہرے والے' بند گلے کا کوٹ پہننے والے ماؤزے تنگ نے کہا۔" بندوق کی نالی ہی سے طاقت بر آمد ہوتی ہے۔" پھر کسانوں کو متحد کر کے اور گوریلا جنگ لڑ کر اس نے انقلاب چین بپا کر دیا۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

ماؤزے ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوا تھا۔

لینن سے چھ برس چھوٹے اور ماؤ سے ۷ برس بڑے دبلے پتلے' سرو قامت' خوش ادا' خوش پوشاک' محبوب صفت محمد علی جناح نے کہا۔ "علم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے۔ ہماری تلوار صرف دفاع میں اٹھنی چاہئے اور ہمارا نصب العین یقین محکم' اتحاد اور تنظیم ہونا چاہئے۔" اپنی ذات اور عوام کی طاقت کے بل پر بلا گولی چلائے انہوں نے ایک نئی آزاد مملکت کی بنیاد ڈال دی۔

لگتا تھا جا کے ٹھیک نشانے پہ جس کا تیر

ایسی کڑی کماں تھا محمد علی جناح

جناح ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔

یہ تینوں عظیم انسان' انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے نصف اول میں مختلف طریقوں سے اپنے مقاصد حاصل کر کے تاریخ' عالم پر اپنا نام ثبت کر کے چلے گئے۔ تینوں کامیاب رہے۔

محمد علی جناح کی کامیابی ان دونوں سے مختلف قسم اور مختلف طریقے کی پیداوار تھی انہوں نے دنیا کی عظیم ترین سامراجی طاقت برطانیہ اور اپنی جماعت سے تین گنا بڑی' بے حد منظم' بے انتہا دولت مند سیاسی جماعت کانگریس سے بیک وقت ٹکرلی۔ اپنی مضبوط کلائی سے تاریخ کے دھارے کو موڑا اور ایک بالکل نیا آزاد ملک بنا کر بیسوی صدی کا سیاسی معجزہ دکھلادیا۔ انہوں نے نہ فوج اکٹھا کی' نہ گولی چلائی' نہ گوریلا جنگ لڑی' نہ کسی بیرونی طاقت سے مدد لی بلکہ صرف اپنے سیاسی تدبر کی تفنگ' عزم و یقین کی تلوار اور قانون کے خنجر سے سازشوں اور مخالفتوں کے ناپاک عفریتوں کے سر قلم کر دیئے۔ قوم کا یہ عاشق عجب معشوق مزاج تھا۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

آپ جس پہلو سے دیکھئے محمد علی جناح کی کامیابی تو حیرت ناک حقیقت ہے ہی' خود ان کی قیادت بھی ایک نادر الوجود معاملہ ہے۔ ذرا تاریخ پر نظر ڈالتے چلئے کہ ان سے پہلے مسلمانوں کے قائد کس ڈھنگ کے ہوا کرتے تھے۔ یہ دیکھئے سرسید ہیں صوم و صلوٰۃ کے پابند بے حد محنتی' ایماندار' لمبا چغہ' چھاج سی داڑھی' قرآن و حدیث کے عالم' رسول اکرمؐ کے دفاع میں میور کا دنداں شکن جواب لکھنے والے۔ دین کے معاملے میں ایسے عقل پرست کہ کچھ لوگ ان کے مخالف اور قتل کے درپے ہو گئے مگر آخر کار وہ کامیاب ہوئے اور انہوں نے ہماری

تاریخ مرتب کی۔ آگے بڑھئے یہ ہیں مولانا محمد علی جوہر جسم پر چغہ 'منہ پر داڑھی' بات بات میں قال اللہ قال الرسول' جذباتی شعلہ بیاں مقرر' ان کے بھائی شوکت علی انہی کے سے ہمزاد۔ اور یہ ہیں حسرت موہانی' شاعر' عالم' سات حج کرنے والے' ترکی ٹوپی اور پرانی چکن پہننے والے' ایثار و وفا کی تصویر۔ یہ دیکھئے ظفر علی خاں منہ پر داڑھی' زبان پر قابو' عالم و خطیب' اور یہ رہے علمائے دیوبند' فرنگی محلی' بریلی وغیرہ عبا و قبا میں ملبوس' چہرے داڑھیوں سے مزین قرآن برزبان' حدیثیں ازبر' مولویانہ صورتیں' عالمانہ باتیں ...... مگر دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۳۵ء آ لگا تو قیادت کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ باید و شاید' جب قیادت کی باگ ڈور محمد علی جناح نے سنبھالی تو پرانے آزمودہ کار قائدین نے خود انہیں قائداعظم تسلیم کر لیا۔ اب ذرا ان کی وضع قطع ملاحظہ کیجئے' ٹھنڈے دماغ کے غیر جذباتی' منطقی سیاستدان' منہ پر نہ داڑھی نہ مونچھ' لہریے دار بال پیچھے کو الٹے ہوئے' مجال ہے کہ کوئی صف سے علیحدہ ہو کر ادھر ادھر بکھر جائے۔ سوٹ ہے تو سیول رو والا' شیروانی ہے تو عمدہ کاٹ کی تصویر کی طرح۔ انگریزی بولتے ہیں تو انگریزی کی طرح اور کبھی اردو بولتے ہیں تو وہ انگریز سے کچھ "اٹھو ہم کس طرے کا گھنٹی بجاتا ہے۔" مگر عجب صورتحال ہے کہ اب یہی قائداعظم آگے آگے ہیں اور بڑے بڑے جغادری شوکت علی' حسرت موہانی' خلیق الزماں اور شبیر احمد عثمانی ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ قرآنی آیتیں نہیں سناتے مگر قرآن کی شمع ان کے دل میں جل رہی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ قیادت کی کایا پلٹ کیوں ہوئی؟ اور یہی کایا پلٹ کامیابی کی ضامن بنی؟ وجہ یہ تھی کہ اس وقت قائداعظم کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی تھی جو کامیابی کی ضمانت دے سکے۔ یہ میری رائے نہیں ہے۔ یہ اس بطل جلیل کا ارشاد ہے۔ جسے علامہ اقبال کہتے ہیں۔ واہ علامہ

تری نگاہ نے کیا کام لاجواب کیا

که سب حسینوں میں بس ان کو انتخاب کیا

وجہ یہ کہ قائداعظم نڈر ہیں، صاف گو ہیں، نہ بک سکتے ہیں، نہ جھک سکتے ہیں۔ وہ آئین کے ماہر، قابل سیاستدان، کانگریس میں برسوں رہے اس کے ان کے راز درون خانہ سے واقف انگلستان میں رہے، انگریزوں سے ملے، گورنروں، وائسرایوں پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے دوبدو بیٹھ کر ان کے کردار و ذہن کا اور قوت و اختیار کا قریب سے مطالعہ کیا بحث میں ان سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ اس لئے آزادی کی آئینی جنگ میں مسلمانوں کے موقف کا ان سے بہتر، صاحب کردار، قابل اعتبار اور بے باک وکیل اور کون ہو سکتا تھا؟ بساط سیاست پر مہروں کو ماہرانہ طور پر چلانا وہی تو جانتے تھے ان کی کامیابی کی متعدد وجوہات ہیں۔ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے اپنی طاقت اور مخالف کی طاقت کا صحیح اندازہ لگاتے ہیں۔ جذباتی ناتجربہ کاروں کی طرح بے موقع نہیں بھڑ جاتے بلکہ اس وقت تک فائر ہی نہیں کرتے جب تک یقین نہ ہو جائے کہ گولی نشانے پر پڑے گی۔ کسی اقدام کے لئے صحیح وقت کی پہچان ہی کامیاب سیاستدان کی پہچان ہے۔ اور قائد اس کام کے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ صحیح طریق کار اور دور بینی مثلاً نوجوانوں کا تعاون حاصل کرنا، بے ایمانی، جھوٹ، مکاری اور ریاکاری سے پرہیز ان کی سیاست کے بنیادی عناصر تھے۔ ان کا بے داغ، چمکتا ہوا کردار تھا جسے عوام نے بھانپ لیا اور اپنی قسمتیں ان کے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور انہوں نے میدان جیت لیا۔ یہ قصہ طویل ہے اس لئے میں اپنے دعوؤں کے ثبوت میں صرف اشارے کرتا چلوں گا۔

۱۹۳۰ء کے دسمبر میں آلہ آباد لیگ سیشن میں علامہ اقبال پاکستان کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں قائداعظم لیگ کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں مگر تقسیم ہند کے مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے کیوں؟ اس لئے کہ ابھی مناسب وقت نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی ولایت سے واپسی پر مسٹر جناح سے بمبئی میں ملاقات کرتے ہیں اور

بتلاتے ہیں کہ وہ لارڈ زیٹ لینڈ سے ملے تھے اور انہیں یہ پیغام دے آئے ہیں کہ تقسیم ہی برصغیر کے آئینی جھگڑے کا حل ہے۔ مسٹر جناح یہ سب سنتے ہیں، مسکراتے ہیں، سگریٹ کا کش لیتے ہیں۔ بات سگریٹ کے دھویں کے ساتھ پیچ و خم کھاتی ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ "ہاں یا نا" کچھ نہیں کہتے۔ لیکن مسٹر جناح نچلے نہیں بیٹھتے۔ لیگ کو عوامی جماعت بنانے کی مہم دن رات دورے، الیکشن میں حصہ، چومکھی سیاسی لڑائیاں جاری ہیں اور جب زمین تیار ہوئی تو پھر پہلا دھماکہ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ایک الگ قوم ہیں، ہماری عبادات، ہمارا کلچر، ہمارے ہیرو، ہماری غذا، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، تاریخ، تمدن جداگانہ ہیں اور پھر دبنگ آواز سے یہ اعلان "خدا کی قسم بین الاقوامی قانون کے ہر پہلو سے ہم ایک الگ قوم ہیں۔" گاندھی جی خفا، نہرو سکتے میں، ہندوؤں کی تیوریاں چڑھی ہوئیں لیکن مسلمانوں کو پہلی دفعہ اپنے تشخص کا احساس ہوا اور بے حد فخر بھی کہ اب وہ منظم ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا چمکیلا دن آ پہنچتا ہے۔ پچھلے برسوں میں جم کر یہ موقف اختیار کیا گیا کہ ہم ایک باقاعدہ قوم ہیں اقلیت نہیں لہٰذا منطقی نتیجہ ہوا کہ ہر قوم کی طرح ہمیں بھی ایک الگ خطہ زمین ملنا چاہئے۔ وہ کہاں سے آئے؟ برصغیر کا ایسا علاقہ موجود ہے جہاں ہماری اکثریت ہے۔ چنانچہ قرارداد پاکستان منظور کی گئی، لیکن اتنا وقت کیوں لگایا گیا؟ اس لئے کہ نفسیاتی، سیاسی، انتظامی اعتبار سے تاریخ کا یہی لمحہ صحیح تھا۔ جب یہ تاریخی فیصلہ مناسب تھا۔ قائد نے رفتہ رفتہ، زینہ بہ زینہ، قدم بہ قدم راستہ طے کیا، ذہنوں کو تیار کیا، پارٹی کو عوامی رنگ دیا، اس کے بعد فیصلہ کیا۔ اب مسلمانوں کو اپنی منزل واضح طور پر نظر آنے لگی تو سفر شروع ہوا۔ صحیح وقت پر صحیح اقدام کی درجنوں مثالیں ہیں۔ فضل الحق کے خلاف کارروائی، مختلف لوگوں کے ساتھ پیکٹ، یوم نجات، مذاکرات وغیرہ۔ طوالت کے خوف سے میں انہیں نہیں دہراؤں گا۔ صرف قائد کے بے داغ انداز سیاست کی ایک مثال دوں گا۔

بنگال میں وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ڈگمگا رہی ہے۔ اگر وزارت گر گئی تو مشکلات پیدا ہوں گی۔ الیکشن سر پر کھڑا ہے۔ وہ قائداعظم کو لکھتے ہیں "مجھے روشنی نظر نہیں آتی یا تو ہندو گروپ کو ملانا پڑے گا یا کچھ بے ایمان لوگ ہیں وہ ہمارے ساتھ آسکتے ہیں ان سے معاملہ کرنا ہوگا۔" قائداعظم جواب دیتے ہیں۔ "میں کسی حالت میں بے ایمان لوگوں سے واسطہ رکھنا نہیں چاہتا۔ اس سے بہتر تو ہندو گروپ سے معاملہ کرنا ہے مگر باعزت شرائط پر۔ ورنہ میں تو عزت کے ساتھ حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھنا پسند کروں گا میں آپ کی جگہ ہوتا تو کبھی نہ گھبراتا۔"

آل انڈیا مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن چند لڑکوں نے بنائی تو قائد نے بھرپور دلچسپی لی۔ کلکتہ میں اس کے پہلے سالانہ اجلاس میں خطبہ دیا۔ اس کا دستور بنانے میں قیمتی مشورے دیئے، پھر تو یہ صورت ہو گئی کہ وہ جس شہر میں جاتے طالب علموں سے ضرور ملتے اور انہیں ایسے مشورے دیتے جو آج بھی اندھیرے راستوں کے لئے روشن چراغ ہیں۔

طالب علموں اور نوجوانوں کی زندگی، تعلیم اور فلاح و بہبود کے بارے میں قائد کی دلچسپی نے خود انہیں ایک روشن شمع اور نوجوانوں کو اس شمع کا پروانہ بنا دیا۔ قائد روزانہ ۱۵، ۱۶ گھنٹے کام کرتے تھے اور ان کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ مدراس میں لیگ کے سیشن کو خطاب کیا تو بخار تھا۔ اس کے بعد آرام کرنے وہ بنگلور آگئے۔ ایک دن وہاں کچھ لڑکے ان سے ملنے آئے۔ سیکرٹری نے کہا کہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔ قائد کو بخار ہے۔ لڑکے بڑے آزردہ خاطر ہوئے۔ ایک نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آگئے مجبوری ظاہر تھی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ قائداعظم اپنی خواب گاہ سے سلیپنگ سوٹ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے آہستہ آہستہ چلے آرہے ہیں اور بھی زیادہ دبلے ہو چکے ہیں۔ منہ پر ضعف کے باعث زردی چھائی ہوئی ہے۔ لڑکے انہیں دیکھ کر جی اٹھے اور وہ باتیں کرنے بیٹھ گئے اور بولے کہ میں صرف تھوڑی دیر تک بات

کر سکتا ہوں۔ لڑکے دور سے ملنے آئے ہیں اب وقت گزر رہا ہے باتیں جاری ہیں۔ مس جناح اور نرس چپکے چپکے کہہ رہی ہیں "بس آرام کیجئے۔" مگر توبہ کیجئے کون سنتا ہے دو گھنٹے باتیں کیں اور دو ڈگری بخار بڑھالیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ۴۶-۱۹۴۵ء کے عام انتخابات برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ہیں۔ انگریز اور کانگریس دونوں قائداعظم اور لیگ کے اس دعوے کو تسلیم نہ کرتے تھے کہ مسلمان پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ قائداعظم نے کہا "اچھا الیکشن کرا کے دیکھ لو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔" چنانچہ الیکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لیگ کا یہ حال کہ اس کا خزانہ خالی' روپے کی سخت کمی' ورکروں کی تعداد محدود' اخبارات گنے چنے' ملک بڑا' پولنگ بوتھ لاکھوں' ادھر مقابلے میں کانگریس جس کا خزانہ لبالب بھرا ہوا۔ برلا اور ڈالمیا کی تجوریوں کے منہ کھلے ہوئے تجربہ کار تنخواہ دار ورکروں کی پوری فوج موجود ہوتے ہوتے ۲۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کی تاریخ آ پہنچی الیکشن میں دو مہینے باقی رہ گئے۔ اس دن قائد نے اپنے خصوصی ایلچی لیاقت علی خان کو علی گڑھ بھیجا کہ وہاں مسلمان لڑکوں کا سب سے بڑا جماؤ تھا۔ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں لڑکے جمع ہوئے تو لیاقت علی خان نے کہا "آپ اپنے اسکولوں اور کالجوں سے باہر آجائیے خواہ ایک سال گنوانا ہی پڑے۔ میں طلبہ کی طرف دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل مسلم قوم کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ آپ کی ڈگری کس کام کی ہوگی اگر مستقبل تاریک اور مایوس کن ہوا۔ یہ انتخابات موت اور زندگی کا معاملہ ہیں۔" قائد کی ایما سے پہلی دفعہ لڑکوں کو الیکشن میں کام کرنے کا حکم ملا ورنہ وہ تو روز مرہ کی ملکی سیاست کو لڑکوں کے لئے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ واقعی موت اور زندگی کی جنگ ہونے والی تھی۔ طبل جنگ بج گیا ڈنکے پر چوٹ پڑتے ہی لڑکے تعلیمی اداروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

اس طرح قائداعظم کو ہزاروں کی تعداد میں جان نثار لکھے پڑھے' بے لوث' دست و بازو

میں طاقت اور زبانوں میں طلاقت رکھنے والے ورکر مل گئے۔ ان کی محنت کے باعث لیگ کے باغی فضل الحق کو جائے پناہ نہ ملی، چھپے چھپے پھرے، ان کی ضرب کاری سے پنجاب کے یونینسٹ زمینداروں کے قلعوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ جیبوں میں چنے بھر کر کنویسنگ کرنے والے جیالوں نے بڑے بڑوں کو لوہے کے چنے چبوا دیئے۔ دیہات کے لوگ دیکھتے تو متاثر ہوتے، واری صدقے جاتے کہ مسلمان لڑکے بھی ہندو لڑکوں کی طرح قابل اور چاق و چوبند نظر آنے لگے ہیں۔ قائداعظم کی اس والنٹیر فوج ظفر موج کو دیکھ کر بالآخر فتح کی دیوی مسکرا اٹھی۔ الیکشن کا نتیجہ آیا تو معلوم ہوا کہ مرکزی اسمبلی میں سو فیصد اور صوبائی اسمبلیوں میں بھاری اکثریت سے آل انڈیا مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔ پاکستان کی منزل صاف نظر آنے لگی۔ قائد کی زندگی کا درخشاں ترین لیکن نازک ترین لمحہ آ پہنچا۔ اب مذاکرات کا کٹھن کام سامنے تھا۔ اس وقت قائداعظم کے پھیپھڑے دق کے جراثیم کی زد میں آچکے تھے لیکن سینے میں دل شیر کے دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ ان کے ڈاکٹر کے علاوہ کسی کو بیماری کا حال معلوم نہ تھا اگر یہ راز افشا ہو جاتا تو ماؤنٹ بیٹن اور نہرو مذاکرات کو اتنا طول دیتے کہ وہ گزر جاتے اور پھر پاکستان کبھی نہ بنتا وہ بیمار تھے، کمزور تھے، جسم گھل رہا تھا لیکن قوت ارادی کی شمع روشن تھی اور دماغ میں وہی نشتر کی تیزی اور استرے کی کاٹ تھی جو ان کا طرہ امتیاز تھے۔ مذاکرات ہوتے رہے تو ماؤنٹ بیٹن سا چالاک اور بااختیار انگریز، نہرو سا عالم اور پٹیل سا سخت مزاج ایک طرف ہوتا اور بظاہر دبلا پتلا مگر دس کروڑ مسلمانوں کے دل کی تاب و تواں رکھنے والا بجلی کا کرنٹ بھرا تار محمد علی جناح دوسری طرف سیاست کی بساط پر یہ کھیل بڑا جان لیوا، بڑا پیچیدہ تھا لیکن آخر کار قائداعظم نے یکے بعد دیگرے سب کو شہ مات دی۔

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد صرف سات برس کے اندر اندر پاکستان بن گیا اس لئے بن گیا کہ اس کے خالق کو خالق حقیقی کا سہارا تھا، ٹھنڈا دماغ تھا، خلقت کی تائید، ایمانداری،

راست بازی، بے باکی، سیاسی دانائی ودوربینی کی صفات اور وقت کی نبض کو پہچان کر نسخہ تجویز کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔

maablib.org

قائداعظم کے بعد

محمد حسن عسکری

قائداعظم کی وفات سے جہاں پاکستان کو دوسری کئی حیثیتوں سے نقصان اٹھانا پڑا ہے' وہاں پاکستان کا کلچری مستقبل بھی خطرے میں پڑگیا ہے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ قائداعظم خود بہت بڑے ادیب تھے انہیں بذات خود اور براہ راست پاکستان کا کلچر بنانا تھا۔ نہ میرا مقصد چاپلوسی ہے کہ جس چیز میں وہ اہم نہ بھی ہوں کھینچ تان کے اہم بنادوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ جن کلچری اقتدار کی بنا پر پاکستان بنایا ہے اور جس کلچری روایت کے تحفظ کی خاطر براعظم ہند کے مسلمانوں نے طرح طرح کی قربانیاں دے کر پاکستان بنایا ہے اس کے سب سے بڑے پاسبان قائداعظم تھے اور جب تک وہ زندہ تھے اس روایت کے شاندار مستقبل کے بارے میں کسی قسم کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ خیر ایک طرح سے شبہ تو اب بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہمارے عوام غیر شعوری طور پر اس روایت سے تعلق اور اس روایت کی عظمت محسوس کرتے ہیں اور جب وہ روایت دوسری چھوٹی اور علاقہ وار کلچری روایتوں پر غالب آتی معلوم ہوتی تو وہ بے چین نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ پڑھے لکھے لوگوں کی غالب اکثریت میں اس روایت کا احترام اور اس سے محبت پائی جاتی ہے اور اس روایت کو پاکستان کے قومی کلچر کی بنیاد بنانے میں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اس کا اشتیاق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ قائداعظم کی موجودگی میں اس روایت پر کسی طرف سے اور کسی قسم کا جملہ کارگر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی زندگی کے سب سے بہترین ضامن تھے۔ انہیں شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ پورے براعظم ہند کے مسلمانوں کو جس چیز نے ایک مرکز پر جمع کیا وہ کیا تھی۔ ان کے بعد یہ امکان موجود ہے کہ اگر کوئی فتنہ انگیز چاہے تو ایک چھوٹی سی جماعت کو اس روایت کے خلاف برانگیختہ کر سکتا ہے اس قسم کی شرانگیزی سے اس کلچری روایت کو

کوئی بڑا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں مگر ہمارے اس جھگڑے میں ذہنی قوت کے بے کار ضائع ہونے کا خطرہ ضرور ہے۔ قائداعظم کے سامنے تو اس روایت کا کام بس اتنا ہو تا کہ آگے بڑھنے اور نشوونما پانے کی کوشش کرے مگر اب ممکن ہے کہ اسے مدافعتوں سے جدوجہد کرتے ہوئے آگے بڑھنا پڑے۔ پاکستان جیسے نئے ملک کے لئے جسے اپنے دفاع اور استحکام کے لئے بھی بہت کچھ کرنا ہے' یہ فرق بہت بڑا فرق ہے' خصوصاً" ایسی حالت میں کہ کلچری مباحث پاکستان کے وجود کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض سیاسی جماعتیں اقتدار حاصل کرنے کے لئے کلچری تنازعات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کو ہروقت تیار رہتی ہیں۔

یہ مسئلے کبھی اتنے نازک بن ہی نہیں سکتے تھے' اگر جس دن پاکستان کا مطالبہ کیا گیا اسی دن سے ان بنیادی کلچری تصورات اور روایتوں کی تشریح و توضیح شروع کر دی جاتی' جن سے عقیدت کی بنا پر دس کروڑ مسلمان اپنے مقامی اختلافات کے باوجود پاکستان کے لئے قربانیاں دینے کو تیار ہو گئے۔ ظاہر ہے یہ کام بڑا لمبا چوڑا تھا اور قائداعظم اسے سرانجام نہیں دے سکتے تھے ہر روز تو انہیں ایسے مذاکرات میں حصہ لینا پڑتا تھا جن پر ملت کی زندگی کا انحصار تھا انہیں اتنی فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ یہ کام تو قوم کے اہل قلم اور اہل فکر حضرات کا تھا' مگر یہ لوگ قوم کے ساتھ تھے ہی نہیں بلکہ اپنی منزل کہیں اور ہی ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ قوم کے ماضی' حال اور مستقبل کو ایک وحدت سمجھنے اور اس وحدت کی ترجمانی کرنے کا کام اہل قلم کا تھا مگر یہ کام (اقبال کے علاوہ) کیا جناح نے۔ حالانکہ قائداعظم اپنی تعلیم' اپنی تربیت' اپنے ماحول' سب چیزوں کے اعتبار سے اس وحدت اور اس روایت سے بہت دور تھے مگر اس روایت کو محفوظ رکھنے کی سب سے شدید تڑپ انہی کے دل میں پیدا ہوئی اور اس براعظم کے مسلمانوں کی وحدت کو جس طرح انہوں نے محسوس کیا' بہت کم لوگوں نے محسوس کیا ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ عوام نے اتنی جلدی ان کی آواز پر لبیک کہا اور ان کے ایک اشارے پر اپنی عزیز ترین چیزیں قربان کرنے کو تیار رہنے لگے۔ ہند اسلامی کلچر کی وحدت کو سمجھنے اور اس کی حفاظت کے لئے عملی قدم اٹھانے پر ہم قائداعظم کے جتنے احسان مند ہوں وہ کم ہے مگر یہ بات بھی کچھ کم تعجب کی نہیں کہ ہمارے عوام کو کھرے کھوٹے کی کیسی سچی پہچان ہے۔ اس براعظم کے مسلمانوں نے آج تک اپنے لیڈر کو اپنے آپ سے اتنا قریب سمجھا ہی نہیں جتنا قائداعظم کو، حالانکہ انہیں عوام کے درمیان اس طرح جانے کی مہلت ہی نہیں ملی جس طرح اور بہت سے ہندو اور مسلمان لیڈر جاتے رہے ہیں۔ ہندوستان ہی کیا دنیا کی تاریخ میں ایسے رہنما بہت کم ہوئے ہوں گے جن کی قوم کو ان سے اتنی والہانہ عقیدت اور محبت ہو اور یہ ہند اسلامی آبادی کی اسی بنیادی وحدت کے شدید احساس کے طفیل ہے جو ہمارے عوام اور قائداعظم میں مشترک ہے۔

اس سے ہمارے ادیبوں کو ایک بڑا ضروری سبق ملتا ہے ہمیں عوام، عوام کی رٹ لگاتے آج دس بارہ سال گزر چکے ہیں مگر عوام ہمیں پہچانتے تک نہیں۔

اس کے برخلاف قائداعظم نے کبھی دکھاوے سے کام نہیں لیا نہ عوام کے دل میں جگہ حاصل کرنے کے لئے جابجا ان سے ہمدردی کا اظہار کیا، مگر پھر بھی عوام انہیں اپنا سب سے بڑا غم خوار اور دکھ درد کا ساتھی سمجھتے تھے۔ قائداعظم کی مثال نے ثابت کردیا ہے ایمانداری اب بھی اپنی جگہ پیدا کرسکتی ہے بشرطیکہ اس میں اپنے راستے پر ثابت قدم رہنے کی جرات ہو۔

قائداعظم نے عوام کے دل میں اتنی جلدی گھر کرلیا تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنی قوم کی صلاحیتوں پر، اس کے شاندار مستقبل پر بڑا زبردست یقین تھا اور یہ یقین پوری شدت کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوا جب کم سے کم ظاہری طور پر اس کی کوئی وجہ موجود نہیں تھی مولانا محمد علی کی وفات کے بعد سے ۳۷ء تک کا زمانہ مسلمانوں کے لئے انتہائی مایوسی، بے

چارگی اور بے یقینی کا گزرا ہے۔ پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت یہ کہتی تھی کہ اب ہمارا ابھرنا ناممکن ہے مگر ایسے عالم میں محمد علی جناح نے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی۔ انہیں بتایا کہ تمہاری صلاحیتوں کو عمل کے لئے میدان تو واقعی نہیں مل رہا ہے مگر وہ مردہ نہیں ہوئی ہیں۔ تم اگر مل جاؤ تو اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہو اور واقعی جناح نے ثابت کر دکھایا کہ مسلمان بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ کچھ کر سکتے ہیں جس کی حیثیت دنیا کی تاریخ میں ایک عجوبے کی ہے۔

جناح نے مسلمان قوم پر اپنے یقین کا دوسرا مظاہرہ اس وقت کیا جب قوم پر ایک دفعہ پھر ویسی ہی مایوسی طاری تھی، قوم بیدار ہو چکی تھی، اپنی جدوجہد کا نتیجہ حاصل کر چکی تھی، مگر کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ قوم کو پھر اپنے اوپر شک ہونے لگا تھا اور یہ خیال گزرنے لگا تھا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے یہ حاصل کرنے کے لائق بھی تھا یا نہیں۔ ذہنی شکوک تو خیر الگ چیز ہیں خارجی حالات ہی اتنے ہمت شکن ہو چکے تھے کہ ہر آدمی یہ سوچتا تھا کہ پاکستان رہے گا بھی یا نہیں۔ عام آدمیوں کے اندر تو خیر یقین کی پھر بھی ایک رمق باقی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ جو چیز اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی ہے وہ کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ مگر جس کو صحیح حالات سے جتنی زیادہ واقفیت تھی وہ اتنا ہی بددل تھا۔ بعض لوگ تو یہاں تک پیشگوئی کرنے لگے تھے کہ بس یہ تماشا دو ایک مہینے کا ہے اور یہ لوگ پاکستان کے دشمن یا بدخواہ بھی نہیں تھے۔ بری خبر منہ سے نکالتے ہوئے دکھ ہوتا ہے مگر حالات کو جھٹلا بھی نہیں سکتے تھے، عام آدمی کے علاوہ پاکستان میں بس جناح ایک شخص تھا جو اب بھی یہی کہے جاتا تھا کہ پاکستان ختم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس زمانے میں انہوں نے جس شدت کے ساتھ اپنے یقین کا اظہار کیا ہے وہ بات پہلے کبھی ان کی تقریروں میں آئی ہی نہیں تھی۔ یہ شدت خطابت کی مدد سے پیدا نہیں کی گئی بلکہ اس کے اظہار کے لئے کم سے کم اور سادہ ترین الفاظ اختیار کئے گئے ہیں۔ جناح نے کہا تھا:

"کیا ہم شکستہ دل ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں عزم و استقلال اور بہادری کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ راستے میں جو روڑے آئیں ان کی پرواہ نہ کرو' آگے بڑھے جاؤ مجھے پورا یقین ہے کہ سات کروڑ کی قوم کو جس کی پشت پر ایک زبردست تہذیب اور تاریخ ہو' ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ الفاظ اتنی جرات اور اتنے یقین کے ساتھ جناح کے علاوہ کون کہہ سکتا تھا؟ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا ایسا زندہ احساس پچھلے بیس سال میں (اقبال کو چھوڑتے ہوئے) جناح کے علاوہ اور کہیں اس شکل میں نظر نہیں آتا۔

واقعی ان میں ایک ایسی بات تھی جو ہمارے زمانے کے ادیبوں اور شاعروں میں بھی نہیں پائی جاتی' یعنی ایک بڑے خیال پر بے پناہ یقین۔ ان میں اس سے بھی آگے یہ صلاحیت تھی کہ خیال کو حقیقت میں بدل دیں' مگر اس بنیادی یقین کے بغیر اس صلاحیت کو اتنا حوصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پاکستان کا تصور ایک ایسی چیز تھا جو مغرب کے سیاسی فلسفے اور عقیدوں کے سراسر خلاف تھی' جو پاکستان کے مخالفوں ہی کو نہیں' غیر جانبدار لوگوں' خود اسلامی ممالک کو انہونی اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جو لوگ پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دینے کو تیار رہتے تھے' وہ تک اکثر سوچا کرتے تھے کہ شاید پاکستان کا مطالبہ محض زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے اور اس کی اصلیت بس اتنی ہی ہے۔ پاکستان بن گیا تو سب سے زیادہ حیرت پاکستان کے پرستاروں کو ہوئی مگر جو کچھ ہوا وہ عوام اور قائداعظم کے مضبوط ایمان کی وجہ سے ہوا۔ اس ایمان کی طاقت اور اس کی گہرائی کا جیسا اندازہ پاکستان کے مخالفوں کو ہے ویسا شاید خود پاکستان والوں کو بھی نہیں ہے۔ قائداعظم کی وفات پر اظہار خیال کرتے ہوئے "ہندوستان ٹائمز" نے ایک گونہ طنز کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کی قوت ارادی اتنی زبردست تھی کہ وہ حقیقتوں کو توڑ پھوڑ کر خوابوں کو حقیقت بنا دیتی تھی۔ غالباً" قائداعظم

کو اس سے بڑا خراج عقیدت پیش نہیں کیا گیا۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ سیاسی بحثوں میں الجھ کر اور کانفرنسوں کے داؤ پیچ میں الجھ کر ایک خیال ایک تصور سے ان کا لگاؤ کچھ کم ہو گیا، مگر یہ گمان غلط ہے آٹھ دس سال تک انہیں سیاسی اکھاڑے میں زور آزمائیاں ضرور کرنی پڑیں، اور ان کے بیانات کا زیادہ حصہ بھی بحث مباحثے پر صرف ہوتا رہا، مگر پاکستان بنتے ہی ان کے لب و لہجے میں ایک نیا وقار، ایک نئی گہرائی آگئی اور انہوں نے سیاسی مباحثے کو چھوڑ کر بنیادی تصورات کا ذکر شروع کر دیا۔ پاکستان کی جتنی اچھی تعریف جتنے مختصر الفاظ میں قائداعظم نے پیش کی ہے اس انداز سے آج تک اس موضوع پر سوچا ہی نہیں گیا ڈھاکہ میں انہوں نے فرمایا تھا کہ:

"پاکستان جغرافیائی حدوں کا نام نہیں ہے بلکہ چند انسانی تصورات سے عبارت ہے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستان اسی وقت تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک یہ بنیادی اصول پاکستان والوں کی نظر کے سامنے رہے۔ اگر پاکستان والے جغرافیائی حد بندیوں کا شکار ہو گئے تو سمجھئے کہ پاکستان نے اپنی روح کا خود گلا گھونٹ دیا اور اپنے وجود کی ضرورت کو ختم کر دیا۔ اس تقریر میں قائداعظم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ پاکستان میں انسانی روح نے ذات پات کی غلامی سے آزادی حاصل کی۔ یہ بھی پاکستان کی بنیادی ضرورت کی طرح ایک زبردست اشارہ ہے۔ تنگ دلی اور تنگ نظری سے آزادی کا نام پاکستان ہے۔ کاش کہ ہم پاکستان کو اس تصور کے شایان شان بنا سکیں جو قائداعظم نے اس کے متعلق قائم کیا تھا۔

قائداعظم نے ہمیں یہ نصیحت کی تھی کہ ہم نے پاکستان بنا کر روح کی آزادی تو حاصل کر لی مگر اب ہمیں اس آزادی سے کام لینا ہے اور اپنی روحانی صلاحیتوں کو اس طرح استعمال کرنا ہے کہ ہماری قوم اپنی تہذیبی روایتوں کو پھر سے زندہ کر سکے۔ قائداعظم تو ہمیں راستہ بتا گئے۔ اب یہ ہمارے ادیبوں کا کام ہے کہ وہ قوم کو اس راستے سے بھٹکنے نہ دیں اور ان

تصورات کو ایک عظیم امانت سمجھ کر ان کی حفاظت کریں۔

ماہنامہ ساقی کراچی

نومبر ۱۹۴۸ء

قائداعظم کی کامیابی کا راز

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

یہ سوال بار بار میرے سامنے آتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ بظاہر قائداعظم میں عوامی لیڈروں کی مسلمہ خصوصیات نہیں تھیں لیکن آج تک مسلم قوم نے کسی ایک رہنما کو اتنی عقیدت، اتنی اطاعت کا مرجع نہیں بنایا۔

قائداعظم کبھی قید نہیں ہوئے۔

قائداعظم رہنے سہنے میں عوامی بہروپ نہیں بھرتے تھے۔

آپ نے زہدو تقویٰ کا دعویٰ تک نہیں کیا، اسلام نمائی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔

آپ نے تملق اور ظاہری انکسار سے کام نہیں لیا۔

اس کے باوجود مسلم عوام اسلام کی خاطر، اسلامی مملکت بنانے کے لئے قائداعظم کے فرماں بردار تھے، ان سے عشق رکھتے تھے۔

میدان سیاست کے تمام کہنہ مشق کھلاڑی آپ کے مخالف تھے۔ آپ کے ہم رکاب آرام طلب، گمنام قسم کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ عوام محض قائداعظم کے نام کو جانتے تھے اور ان کے نام کے سہارے پر ہر طرح کی قربانی کرتے تھے۔ ہندو اور انگریز کی منظم کوششوں کے باوجود قائداعظم کامیاب ہوئے۔

کیوں؟

میں تاریخی وجوہ پر بحث نہیں کرتا، وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان وجوہ کا ہونا ہر دنیوی لیڈر کی کامیابی کے لئے ضروری ہے، لیکن محض تاریخی وجوہ سے قوموں کی حالت میں انقلاب نہیں آتا۔ عموماً" منظم جماعت اور عظیم شخصیت کے لیڈروں کے اجتماع سے انقلاب امم پیدا ہوتا ہے قائداعظم کو منظم جماعت میسر نہ آئی، تجربہ کار مددگار حاصل نہ تھے لیکن انہوں نے ایک

تاریخی انقلاب پیدا کر دیا۔

یہ کس طرح ہوا؟

ایک دن میرے محبوبؐ کے حضور میرے محبوبؐ کے پیارے حاضر تھے۔ کسی نے کہا" آپ کو صدیق اکبرؓ میں کیا ممتاز خصوصیت نظر آتی ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "جہاد' خیرات' عبادت میں تم سب ممتاز ہو' ایک سے ایک بڑھ کر ہے مگر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ایک خاص ادا ہے' ایک خاص بات ہے۔" وہ بات کیا تھی؟ اس کا ذکر رسول مقبولؐ محبوب خدا کے اپنے الفاظ ہی میں سنیے فرمایا:

"شیئا وقع فی قلبه"

(ایک شے ہے جو صدیق اکبرؓ کے دل میں پیوست ہے)

اس کا تعلق ظاہری اطوار و خیالات سے نہ تھا' یہ دل کی بات تھی۔ بفرق مراتب حضرت قائداعظم کے محبوب عوام و اسلام ہونے کی وجہ بھی قائداعظم کی قلبی کیفیت تھی جس کا اندازہ' جس کا احساس عوام کے قلب کو ہوتا تھا۔ یہ منطق و استدلال کا مقام نہ تھا جس کے متعلق شاعر کہتا ہے:

آنکھ سے آنکھ کہے' دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ حرف تمنا جو زباں تک پہنچے

مسلم عوام جانتے تھے' ان کا دل چاہتا تھا کہ یہ "قائد پشمینہ پوش" ایسا دل رکھتا ہے جس کی دھڑکن ان کے اپنے دل کی دھڑکن کی ہم آواز' وہی لے' وہی زیر و بم ہے۔ اس کا تعلق کپاس و حریر سے نہ تھا' کھدر اور ریشم سے نہ تھا' طبقاتی کشمکش سے نہ تھا۔ یہ دل کی بات تھی۔ ایک شے تھی جو قائداعظم کے قلب میں واقع ہوئی تھی۔ شیئا وقع فی قلبه رسولؐ مقبول کے یہ الفاظ کس قدر حقیقت افروز ہیں۔ ان میں کتنی جاودانی صداقت ہے۔

چودہ سو سال پہلے کا ارشاد آج کے واقعات پر بھی حاوی ہے۔

اس قلبی کیفیت کا تجزیہ کیجئے تو اس میں سے بہت سی باتیں نکلیں گی، لیکن ایک خصوصیت واضح ہے اور وہ خلوص ہے، بے پناہ خلوص۔ وہ خلوص جو پہاڑوں سے ٹکرائے تو انہیں پاش پاش کر دیتا ہے، وہ خلوص جو ناممکن کو ممکن سمجھ کر ممکن بنا دیتا ہے، وہ خلوص جو ہر محبت، ہر دشمنی، ہر عمل کو خالصتاً للہ کر دیتا ہے۔

مجھے قائداعظم سے پہلی بار لندن میں ملنے کا شرف حاصل ہوا اس وقت وہ سیاسیات سے کنارہ کش تھے۔ اس سے پہلے میں نے انہیں بارہا دیکھا، ان کی تقریروں کو سنا تھا لیکن تخلیے میں گفتگو کا موقع نہ ملا تھا۔

چند سال بعد وہ لاہور میں تشریف لائے اور لیگ کو بیدار کرنا چاہا۔ ان دنوں سر فضل حسین زندہ تھے۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے اس ملاقات میں عملی سیاسیات کی باتیں سننے کا موقع ملا۔

تیسری بار دہلی میں حاضر ہوا اس وقت وہ قائداعظم تھے۔ دہلی میں کشمیر کے سلسلے میں بات ہوئی۔ مجھے ان کے طریق کار سے اطمینان نہیں تھا، میں اسے خلاف مصلحت سمجھتا تھا اور میں نے یہ بات بے جھجک عرض کی۔ اس وقت بھی وہی متبسم آنکھیں، وہی مشفق چہرہ تھا جو لندن میں نظر آیا تھا، حالانکہ میں ایک غیر سیاسی نامعروف شخص تھا اور وہ قائداعظم تھے۔

دہلی میں ایک بار اور ملا حسب ارشاد حاضر ہوا۔ میں کچھ کچھ بیمار تھا انہوں نے دعا دی، بزرگانہ شفقت سے دعا دی۔ اس کے بعد ٹیلیفون پر دو بار بات چیت ہوئی اور بس۔

ہزاروں آدمیوں کو شرف ملاقات حاصل ہوا۔ لوگوں نے قائداعظم کو دیکھا۔ میں نے ایک عظیم انسان دیکھا، ایک دیدہ ور انسان دیکھا، اہل دل انسان دیکھا، مگر بڑے ضبط و تحمل والا صاحب دل انسان۔

قائداعظم انسان تھے، عظیم شخصیت کے انسان تھے اور انسانوں کی طرح اجتہادی غلطیوں

کے بھی مرتکب ہوئے' وہ اجتہاد جس کی غلطی کو بھی ثواب کہا گیا لیکن ایک روش میں ان سے کبھی لغزش نہیں ہوئی وہ روش خلوص کی تھی' ان کے قلب کی کیفیت تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کا استبداد' کانگریس کا جاہ جلال' ہندو کی دولت' قوم پرست مسلمانوں کی سیاست' اپنے عوام کی بے نظمی اور پس ماندگی' کیسے کیسے مواقع تھے۔ ایک شخص کے راستے میں کیسے کیسے پہاڑ تھے' مگر اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی' اس کے خلوص قومی میں فرق نہ آیا' اس کا ہر قومی عمل اللہ کے لئے تھا' اللہ کے بندوں کے لئے تھا' اس لئے کہ اس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ ہر مجاہد حق کے دست شمشیر زن پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ ارشاد خداوندی ہے۔ یہی قائداعظم کی کامیابی کا راز ہے۔

قائداعظم زندہ باد ! پاکستان پائندہ باد

ماہ نامہ ماہ نو کراچی

دسمبر ۱۹۵۰ء

بابائے پاکستان

مختار صدیقی

دو دن بعد ۱۹۳۱ء شروع ہونے والا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ دور بھی نمودار ہونے کو تھا جو دنیا بھر میں اقتصادی بحران اور بے روزگاری لے کر آیا ہے اور جس میں عام بے چینی نے سیاست، ادب نے عجیب و غریب تحریکوں کو فروغ دیا۔

ہندوستان کی تحریک اتنا زور پکڑ چکی تھی کہ انگریز آقاؤں کو سائمن کو ہندوستانی گول میز کانفرنس کی ضرورت پیش آچکی تھی ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی ایک نازک موڑ پر پہنچ چکی تھی اور اسی لئے مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ نے، ملک بھر کے برگزیدہ مسلمانوں کی بھیجی تھی کہ وہ آلہ آباد میں جمع ہو کر، تمام حالات کا جائزہ لیں اور آئندہ کے لئے کوئی واضح اور مستقل پروگرام مرتب کریں۔

اجلاس شروع ہوا، تو ایک قوی ہیکل اور وجیہہ شخص نے کرسی صدارت سے اٹھ کر فصیح انگریزی میں گفتگو شروع کی:

"حضرات!

میں اس عزت افزائی کا دل سے ممنون ہوں اس وقت ہندوستانی مسلمان اپنی سیاسی زندگی کے نازک دور سے گزر رہے ہیں اور اس اجلاس میں ایسے حضرات تشریف فرما ہیں جن کا سیاسی تجربہ مجھ سے زیادہ ہے اور جن کے علم و فضل کی میرے دل میں زیادہ عزت ہے اس لئے آج ہمیں جو سیاسی فیصلے کرنے میں آپ کی رہنمائی کا خیال ہی میرے نزدیک گستاخی ہے میں کسی پارٹی کا لیڈر نہیں ہوں نہ میں کسی لیڈر کا پیرو ہوں لیکن میں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ مطالعہ میں بسر کیا ہے اور اس کی تعلیمات، مسلمانوں کی حیات اس کے تمدن اس کی تاریخ کے مطالعے میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ مطالعے اور ادراک کی بدولت میں یہ کوشش کروں

گا کہ آپ کے سامنے وہ بنیادی اصول پیش کروں جن پر آپ کے فیصلوں کی عام نوعیت کا دارومدار ہونا چاہئے۔ وہ بنیادی اصول کیا تھے؟

اخلاقی نظام کے علاوہ ایک معاشرتی ہے۔ یہ نظام تمام عالم انسانی کو درکار ہے چنانچہ مسلمانوں کو جغرافیائی حدود کا پابند کر کے نسل پرستی کا لیبل لگا دینے کا حشر ظاہر ہے بلکہ اسلام حدود سے انسان کو آزاد نہ کر سکتا ہے اور اب نسل پرستی اور وطنیت نے دنیا کو ایک عظیم دلدل میں پھنسایا ہے۔ اسلام ہی ایک ایسی زندہ طاقت ہے جو اس دلدل سے عالم انسانی کو نکال کر ایک ایسی زندگی دے سکتی ہے جو انفرادی اور اجتماعی طور پر اعلیٰ صفات کا مظہر بن سکے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص مسئلوں کا ذکر آیا تو سوال پیدا ہوا کہ آخر غیر مسلموں اور مسلمانوں میں اتحاد کیوں نہ ہو سکا اور اگر اتحاد ممکن نہیں ہے تو ہمارے لئے ایک ملت کی حیثیت سے کیا راستے کھلے ہیں؟

اگر مسلمان، اپنے تمدن اور اپنی روایات کو سامنے رکھ کر ترقی کے راستے قدم اٹھانا چاہیں۔ تو ان پر فرقہ پرستی کا الزام عائد ہو گا؟

کیا خود نہرو رپورٹ نے، فرقہ پرستی کے بعض اعلیٰ پہلوؤں کو تسلیم نہیں کیا؟ اور صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ اس طرح مختلف فرقوں کو فی ذاتہ ترقی اور استحکام کا بھی موقع ملتا ہے اور اضافی لحاظ سے یہ استحکام دوسرے فرقوں کے ساتھ زیادہ مستقل قسم کے اتحاد کا ضامن بن سکتا ہے؟"

ان وضاحتوں تک پہنچتے پہنچتے صاحب صدر کی آواز ایوان میں ذرا بلند ہوئی انہوں نے فرمایا۔

"حضرات! یہ واضح رہے کہ فرنگی جمہوریت کے اصول اس ملک کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں عمل میں لاتے وقت یہ خیال رکھنا لازم ہے کہ یہاں فرقہ وار گروہ

بندیاں موجود ہیں جو نسلی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جن کی زبانیں الگ الگ ہیں اور جو الگ الگ مذہبوں کی پیرو ہیں، اس لئے مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے اور ان کا یہ مطالبہ ہر طرح جائز ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہندوستان وجود میں لایا جائے..... میری تجویز یہ ہے کہ پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مملکت بنا دی جائے۔ جو یا تو برطانوی سلطنت کے اندر یا اس کے باہر پوری طرح خود مختار ہو۔ میرے نزدیک یہ اسلامی مملکت ہی مسلمانوں کا آخری مطمع نظر ہو گا، کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کا مطمع نظر یہی معلوم ہوتا ہے۔

یہ بھی فرمایا:

کہ اس وقت بڑے بڑے مفادات خطرے میں ہیں۔ ہم ۷ کروڑ ہیں اور حقیقت میں ہماری تمدنی وحدت ہی، ہم کو جدید اصطلاح میں "قوم" بنانے کی ضامن ہے اور اگر ہمیں خود مختاری حاصل ہو گئی تو ہم وہ اہم فرائض پورے کر سکیں گے جو ہم پر ہندوستان اور ایشیا بلکہ عالم اسلام کی طرف عائد ہوتے ہیں۔"

یہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کا دن تھا، جب مشرق کے سب سے بڑے مفکر اور عالم اسلام کے سب سے بڑے مجدد فلسفی اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے دکھ درد کی تشخیص کی، انہیں دشمن عناصر سے پرہیز کرنے کی تلقین کی اور ان کے لئے ایک واضح لائحہ عمل، ایک مطمع نظر بھی متعین کیا یہی وہ مطمع نظر تھا جسے قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی سرگرمی عمل سے تخیل سے حقیقت میں منتقل کر دیا اور اس طرح دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

آج اقبال اپنے اس مطمع نظر کی تعبیر دیکھنے کے لئے جسمانی طور پر ہم میں موجود نہیں لیکن وہ اپنی تعلیمات اپنی آگاہی اور شعور کی بدولت ہم سب میں اور ہماری مملکت پاکستان کے قالب میں زندہ و پائندہ ہیں۔

خیال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا خواب دیکھنے والے کے سامنے، ماضی وحال و مستقبل کی کیا کیا باتیں تھیں جن کے پیش نظر انہوں نے یہ فیصلہ کیا؟ اور بقول خود دنیا کے مسلمانوں میں سب سے بڑے اسلامی گروہ یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کے قیام ہی کو کیوں ہمارے ''مرض کہن'' کا درمان قرار دیا؟

اس کے لئے آزادی ہندوستان کی تحریک اور اس تحریک کے ایک خاص دور کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستانی کو سیاسی بحران سے نکالنے کے لئے فرقہ وار اتحاد کی کوششیں ہو رہی تھیں اور فرقہ وار اتحاد ہی کو ہم آپ اور ہمیں آزاد کرنے والے آقا ہماری آزادی کے لئے لازمی شرط قرار دیتے تھے لیکن یہ کوشش جو خلافت کے زمانے میں زندہ حقیقت بن چکی تھیں۔ اب بالکل لاحاصل ثابت ہو رہی تھیں اور مسلمان روز بروز یہ محسوس کر رہے تھے کہ غیر مسلموں اور ان کی محبوب جماعت کانگریس کے ساتھ ان کا اشتراک زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، لیکن ساتھ یہ بھی نظر آتا تھا۔ کہ اگر ان کے ساتھ اشتراک نہ کیا گیا تو دوسرا اور کونسا ہے، اور اشتراک نہ کرنے سے یہ الزام کون اٹھائے گا اور اس حالت میں کون نکو بنے گا کہ مسلمانوں میں حب وطن نہیں۔ وہ اپنے وطن کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتے، کیونکہ وہ جنونی ہیں اور وطن پرستی انہیں نہیں بھاتی۔

یہ پروپیگنڈا، ہمارے سامنے، دین اور وطن کو دو متضاد طاقتوں کی صورت میں پیش کرتا تھا اور کچھ کئے دھرے بن نہ آتی تھی۔

یہی کشمکش جان لیوا بنی جاتی تھی کہ اگر وطن کا خیال کریں (جیسا کہ جدید زمانے میں ہر تعلیم یافتہ اور دردمند شہری کو ہونا چاہئے) تو اس کا مطلب غیر مسلموں سے اشتراک اور سمجھوتہ ہے اور خطرہ یہ ہے کہ یہ اشتراک اور سمجھوتہ کہیں عملی طور پر ہمیں اکثریت کا غلام نہ بنے دے اور حقیقت یہ ہے یہ اس وقت تو پندرہ اگست کے تاریخی دن سے پہلے ہر گھڑی اس کا امکان

موجود تھا۔

خیال کیجئے دین اور وطن کی یہ آویزش اس ملت کے لوگوں کو الجھا رہی تھی جو گیتی شکن تھی۔ جس کے لئے جغرافیائی خطے نہیں، کل عالم بشیرت جولا نگاہ تھا اور ہے۔

اسلام نے حضرت علامہ کے لفظوں میں

"انسان کو یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی اور نہ یہ انفرادی عقائد کے مجموعے کا نام ہے اس کی حیثیت انسانی ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ عالم بشیرت کو متحد اور منظم کیا جا سکے ظاہر ہے کہ ایسا "دستور العمل" قوم اور نسل کی بنیاد پر نہیں بنایا جا سکتا بلکہ اس کو (عالمگیر معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔"

جدید دور میں جب سیاسی تصورات کو ایک باضابطہ شکل دی گئی تو ایک نئے دین کی تشکیل ہوئی۔ یہ وطنیت ہے جسے مغرب کے سیاسی مفکروں نے رفتہ رفتہ ایمان کا درجہ دے دیا اس کی تہ میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مغربی ملکوں کا مذہب مسیحت، ایک انفرادی دین کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ مملکت کے تصور کے ساتھ ساتھ جب مذہب ایک اجتماعی نظام نہ بن سکا تو ضروری تھا کہ کوئی دوسرا مسلک یا دین اس کی جگہ لیتا اور اس دین کی ترویج اور ترقی جب تاجرانہ نفع پرستی کے لئے بڑی سازگار ثابت ہوئی تو لوگوں نے اسے جدید ترقی اور تہذیب کے لئے ایک لازمی وسیلہ قرار دیا۔

ہندوستان میں جب سیاسی بیداری کی لہر دوڑی اور ملک بھر، سفید ہاتھوں کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کے لے بے چین ہوا تھا تو آزادی کا دور رکھنے والے جس نعرے کی بھول بھلیوں میں گم ہوئے وہ مادر ہند کی (بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) آزادی تھی مطمع نظریہ تھا کہ ہم ہندوستانی (جو مختلف قوموں، نسلوں اور مذہبوں سے تعلق رکھتے ہیں) اس سرزمین کو غیر ملکیوں کے چنگل سے آزاد کرائیں، جہاں ہم سب رہتے ہیں۔

اس مطمع نظر سے کسی کو اختلاف نہ تھا نہ کسی کو اس میں کوئی ترمیم پیش کرنے کی تاب تھی، لیکن چونکہ یہ مطمع نظر، اپنے عوامل کے لحاظ سے واضح نہ تھا، اس لئے وطن کی محبت اور اس کی غلامی کے درد پر اس دین کا فسوں چل گیا جسے یورپ کی ملوکیت پرستی اور روحانیت سے بیزاری نے، وطنیت یا (حب وطنی) کے سیاسی تصور کی صورت میں پیش کیا تھا اس تصور کو نام نہاد رہنماؤں نے عمداً" بڑی رنگ آمیزی سے جاہل مگر دردمند ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا اور رفتہ رفتہ یہ نعرے عام ہو گئے کہ وطن کی آزادی کی جنگ کے لئے ہم ہندوستانی پہلے ہیں اور پھر ہندو یا مسلمان ہیں۔

گویا وطنیت کے سیاسی تصور نے ہمارے سامنے اجتماعی ہیئت کا ایک اصول یا ایک اٹل قانون پیش کر دیا اور جذبات کی رو میں سادہ دل مسلمان اسے اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھنے لگے۔

یہ وضاحت سب سے پہلے حضرت علامہ نے کی، کہ حب وطن بہت قابل قدر جذبہ سہی، لیکن وطن پرستی اور وطنیت جس کا پرچار ہندوستان میں بحیثیت ایک سیاسی تصور کے انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کا بڑا کارنامہ تھا لعنت ہے۔

انہوں نے خبردار کیا کہ وطنیت کا جذبہ جسے ہندوستان کی جنگ آزادی کی روح بنایا جا رہا ہے جدید تمدن کی مخصوص ضرورتوں سے پیدا ہوا۔

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے

اس ابتدائی وضاحت کے بعد انہوں نے اس بت کو توڑنے کے لئے سرگرم کوششیں کیں۔

انہوں نے بتایا کہ یہ بت پرستی ہے، ہم اور ہماری فضیلت اسلام ہے۔ جو خود ایک معنوی

ہستی ہے جسے انسانی گروہوں کے رنگ یا کسی مملکت کی مٹی' اسیر نہیں کر سکتی' ہم لاکھ خاکی ہوں لیکن خاک (وطنیت) سے ہمارا پیوند نہیں۔ اس لئے ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے ان لوگوں کا آلہ کار نہیں بن سکتے' جو وطنیت کو اسلام پر قاطع محبت قرار دیتے ہیں۔

انہوں نے یہ بات اردو نظموں میں کہی اور اسرار خودی پیام مشرق زبود عجم اور جاوید نامہ کے صفحوں میں یہی بات فارسی کی بے مثال نرمی اور شیرینی میں ڈھلتی رہی۔ انگریزی مضمونوں میں لکھی' خطابات میں فرمائی اور اس طرح وطنیت کے تمام پہلو اس کے عوامل اور عواقب سے آشکار کئے اور ساتھ ہی بڑی وضاحت سے یہ بھی بتایا کہ اسلام' خود ایک نظام حیات ہے۔ میرے آپ کے اخلاق ٹھیک کرنے اور چال چلن درست کرنے کا ہی پروگرام نہیں' یہ عالم کی اجتماعی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل ہے اور اس میں یک ایسا انقلاب بھی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ قوم اور نسل کے نظریوں کی بجائے ایک عالمگیر انسانیت (جسے علامہ مرحوم نے "انسانی ضمیر" کا نام دیا) رواج پائے۔

چنانچہ انہوں نے صاف فرمایا:

"جس وطن پرستی کے نام پر ہم سے ہر قسم کی مفاہمت کے لئے کہا جاتا ہے وہ وطن کی محبت نہیں ہے وطن کی محبت ایک قدرتی چیز ہے اور اسے انسان کی اخلاقی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اصل اہمیت' انسان کے عقیدے' اس کے تمدن اس کی تاریخی روایات کو حاصل ہے۔ میری نظر میں یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ہماری زندگی اور موت وابستہ ہیں اور زمین کے اس خطے سے ہرگز وابستہ نہیں ہیں جہاں ہم عارضی طور پر رہنے آئے ہیں۔"

اس طرح اپنے فکر و عمل اور تعلیمات سے انہوں نے وطنیت کا وہ بت توڑا جس نے ایک طرف تو ایک دنیا کو مغربی تاجروں کی ہوس کا شکار بنا رکھا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کے ۱۰ کروڑ مسلمانوں کو جمہوریت اور آزادی کے نام پر اکثریت کا غلام بنانے کی مضبوط بنیاد رکھی

تھی۔ کیونکہ مسلمان حضرت علامہ کے خیال میں ایک مدت سے روحانی زندگی کی گہرائیوں کا کھوج لگانے (بال جبریل کے لفظوں میں "اپنے من میں ڈوب" جانے کی اسلام صفت سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی، آب و رنگ سوز اور تڑپ سے خالی ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس بات کا ہر وقت خطرہ درپیش تھا کہ وہ ایسی طاقتوں اور نظریوں کے ساتھ بزدلانہ مفاہمت نہ کرلیں۔ جن کے متعلق انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ دو بدوان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

چنانچہ اس علت کی تشخیص کے بعد انہوں نے واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے یہ مطمع نظر پیش کیا کہ وہ ہندوستان میں ایک اسلام مملکت قائم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔

اس سے یہی فائدہ مقصود نہیں تھا کہ ہندوستانی مسلمان ہندو کی اقتصادی غلامی اور شاید سیاسی چاکری سے بچ سکیں گے۔ اصل منشا یہ تھا کہ ہندی مسلمان صحیح معنوں میں اسلامی زندگی بسر کر سکیں۔ اپنے اندر وہ آب و رنگ اور سوز و یقین پیدا کر سکیں جو ان کے دین کی روح رواں ہے اور جسے وطنیت کا سیاسی تصور، افیون پلا پلا کر موت کی نیند سلانا چاہتا ہے اور شاید بڑی حد تک سلا چکا ہے۔ علامہ مرحوم کا آفاقی ادراک انہیں سمجھا چکا تھا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام ہی سے اسلام میں سے عربی ملوکیت کا عنصر خارج کیا جا سکے گا۔ جو زمانے کے حالات نے اس آفاقی نظام میں داخل کیا تھا۔

اس کے علاوہ ایسی اسلامی مملکت بننے سے ہی اسلام کے اصول و قوانین اس کی تعلیمات اس کا تمدن زندہ کیا جا سکے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اسلام کی بنیادی سپرٹ اور جدید دور کی اسپرٹ میں وہ ہم آہنگی پیدا کر سکیں جو ہماری بقا کے لئے ضروری ہے۔

ہفت روزہ استقلال لاہور ۱۹۴۹ء

قائداعظم محمد علی جناح کا آئینی سفر

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

قائداعظم زندگی میں بھی سرخ رو رہے اور آج بھی وہ اپنے انتقال کے ۴۹ سال بعد بھی اس بنا پر سرخ رو ہیں کہ جدید تاریخ تاہنوز ان کا ہم رتبہ اور مثیل رہنما پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح بنیادی طور پر ایک آئین پسند سیاست داں تھے۔ آپ نے اپنی پوری سیاسی زندگی میں اس سنہرے اصول کو اپنایا کہ دلیل و منطق کے ذریعہ ہی سیاسی معرکے سر کئے جانے چاہئیں۔ پاکستان کے لئے جدوجہد میں اس کی واضح نشاندہی موجود ہے۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ کچھ متعصب مورخین اور تبصرہ نگاروں نے گاندھی اور جناح کے سیاسی طریقہ کار کا موازنہ کرتے ہوئے قائداعظم کو بڑی بے انصافی کے ساتھ ضدی، غیر منطقی، اور غیر جمہوری قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ قائداعظم ہی تھے جنہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کے سال (۱۹۱۳) ہی میں اس جماعت کا نصب العین تبدیل کروانے میں تاریخی کردار ادا کیا تھا۔ (۱۹۱۶) کا معاہدہ لکھنؤ اسی لئے ممکن ہوا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نصب العین یکساں ہو چکے تھے۔ قائداعظم انتہائی درجہ کے قوم پرست رہنما تھے لیکن وہ کانگریس کے پلیٹ فارم کو ہندو مذہب کے احیا اور غیر آئینی سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

گاندھی کے بارے میں قائداعظم کا خیال تھا کہ انہوں نے کانگریسی سیاست میں مذہب اور تشدد کو روشناس کرایا۔ قائداعظم نے گاندھی کی اس نئی مذہبی سیاست کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے ناگپور سیشن سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس مضمون میں ہم برصغیر کی سیاست کے تین ادوار کا جائزہ لیں گے۔

ہم پہلے دور میں ۱۹۲۰ء تک اور آل انڈیا کانگریس کی حکمت عملی کا جائزہ لیں گے ۱۸-۱۹۱۷ء میں کانگریس پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ جنگ عظیم اول نے اس تبدیلی کو مہمیز کیا۔ بنابریں

کانگریس کے رویہ میں اچانک سختی پیدا ہوتی گئی اور گاندھی نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم رہنماؤں کی حمایت سے کانگریس کے خصوصی اجلاس نے تحریک عدم تعاون کا ریزولیشن پاس کر دیا۔ تاہم پنڈت موتی لعل نہرو' پنڈت مدن موہن مالویہ اور سی آر داس نے ریزولیشن کی مخالفت کی۔ بالا خر اس ریزولیشن کی حتمی توثیق کانگریس کے ۱۹۳۰ء کے ناگپور سالانہ سیشن میں ہو گئی۔ مسٹر جناح نے اس سیشن میں یادگار کردار ادا کیا۔ انہوں نے سیاست میں مذہب اور تشدد کی سیاست پر سخت تنقید کی جو کانگریس میں گاندھی کے عمل دخل کے بعد نمایاں رجحان کی حیثیت سے ابھر رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اشتعال ملک کو بے یقینی کی حالت سے دوچار کر دے گا اور اس سے ملک کو فائدہ کی نسبت نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔

قائداعظم نے کہا کہ وہ احتجاج حتیٰ کہ بغاوت کے بھی خلاف نہیں بلکہ ان طریقہ ہائے کار کے خلاف ہیں جو ان کو بروئے کار لانے کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے دوبارہ اپنے اس خیال کو دہرایا کہ مسٹر گاندھی ہندوستان کے عوام کو غلط سمت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ پہلے شخص تھے جو اس تحریک میں بھرپور تعاون کرتے۔ انہوں نے کہا کہ گاندھی جی کا پروگرام طاقت کے استعمال کے نظریہ پر مبنی ہے۔ کرنل ویجوڈ' جو کہ برٹش لیبر پارٹی کے نمائندے تھے' ۱۹۲۰ء کے کانگریس سیشن منعقدہ ناگپور میں ایک مندوب کے طور پر شریک تھے انہوں نے قائداعظم کی تجویز کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان حقیقی معنوں میں آزادی کی راہ پر گامزن ہے۔ کیونکہ اس میں کم از کم ایک ایسا شخص ضرور موجود ہے جو اپنے موقف کے خلاف اکثریتی رائے کے سامنے مضبوط اعصاب کے ساتھ ڈٹ جانے کی ہمت رکھتا ہے۔

تحریک عدم تعاون کو برطانیہ کے خلاف کانگریس کی متشددانہ مہم کا پہلا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں محمد علی جناح کے لئے کانگریس سے علیحدگی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ

نہیں رہ گیا تھا۔

قائداعظم نے ۱۹۲۳ء کے بعد سے خود کو مسلم مقاصد کے حصول کے لئے موقف کر دیا یوں بھی تیسری دہائی کے پہلے اولین چند سالوں میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کی لہر کمزور پڑ چکی تھی۔ اس دور کی آریہ سماجی تحریک نے خلافت تحریک کے دور عروج کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو خاصہ نقصان پہنچایا تھا۔ محمد علی جناح اس قسم کے سیاست دان نہ تھے جو ان ناگفتہ بہ حالات میں خاموش تماشائی بنے رہتے۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد جو کل جماعتی کنونشن (۱۹۲۸ء) اور ۱۹۱۶ء کے معاہدہ لکھنؤ کی روح کے منافی تھی۔ محمد علی جناح نے ۱۴ نکات کا اعلان کیا۔ اب انہوں نے جداگانہ انتخابات کا اصول تسلیم کرلیا تھا۔ انہوں نے مرکزی مقننہ میں ۳۳ فیصد نمائندگی، سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدگی، این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان کے لئے مستقل صوبائی درجہ اور پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو تسلیم کئے جانے کے حق میں ہو گئے تھے۔

بالاخر جس شخص نے اپنی تمام زندگی ہندو مسلم مفاہمت اور ہندوستان کے اتحاد کے لئے جدوجہد کی تھی اس نے بعض ممتاز کانگریسی رہنماؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ۱۴ نکات کی سیاست پر کاربند ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۱-۱۹۱۰ء میں محمد علی جناح ہی تھے جو برطانوی حکومت کی جانب سے منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۰۹ء) کے اعلان کے باوجود بھی اس خیال کے حامی تھے کہ لوکل باڈیز کے انتخابات مخلوط انتخابات کے اصول کی بنیاد پر لڑے جائیں۔ یہ محمد علی جناح ہی تھے جنہوں نے کل جماعتی کانفرنس (۱۹۲۸ء) کے فیصلوں کے تحت ایک مرتبہ پھر مخلوط انتخابات کا اصول تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن نہرو رپورٹ نے مکمل طور پر ان کی خوش گمانی کو پاش پاش کر دیا اور وہ ایک مرتبہ پھر یہ محسوس کرنے لگے کہ کانگریس ہندو مسلم معاملات کی یکساں وکالت و محافظت کے اصول کے خلاف سرگرم عمل ہے۔

دراصل قائداعظم کو یقین ہو گیا تھا کہ ۱۹۳۰ء سے کانگریس کا رویہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے علامہ اقبال نے بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ جو خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) دیا تھا۔ اسے بھی برصغیر کے مسلمانوں کا ردعمل ہی تصور کیا جانا چاہئے۔ کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں لاہور ریزولیوشن میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے بغیر مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جو بہر طور معاہدہ لکھنؤ (۱۹۱۶ء) اور کل جماعتی کنونشن (۱۹۲۸ء) میں پیش کی گئی قراردادوں کی روح کے منافی تھا۔ اس طرح کانگریس کے مکمل آزادی کے مطالبہ نے جس میں مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اعراض کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے الہ آباد سیشن میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک علیحدہ مسلم فیڈریشن کے قیام کے لئے تجویز کی راہ ہموار کردی۔

اب ہم دوسرے دور میں داخل ہوتے ہیں جو ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فروری ۱۹۳۰ء میں تحریک سول نافرمانی چلانے کی منظوری دی اور ان لوگوں سے جو حکومت سے تعاون کر رہے تھے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو جائیں۔ علاوہ ازیں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ لیڈروں کی گرفتاری کے بعد اس تحریک کی رہنمائی گرفتاری سے بچ جانے والے کریں گے مسلم لیگ سے اس معاملہ میں کوئی رائے نہ لی گئی۔ تحریک سول نافرمانی ۱۹۳۰ء میں ڈنڈی مارچ سے شروع ہوئی جس کا مقصد نمک سازی کے بارے میں قانون کی مخالفت تھا۔ یہ تحریک جلد ہی تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ جیسے ہی یہ تحریک پھیلی تو حکومت نے انتہائی سخت اقدامات کے ذریعہ بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ محمد علی جناح نے محسوس کیا کہ برٹش حکومت کے خلاف اس ابتدائی مرحلہ میں کسی قسم کی جدوجہد سے ہندوستان کے مستقبل اور خصوصاً مسلم عوام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہر کا بھی یہی خیال تھا۔ مولانا محمد علی جوہر ۱۹۲۸ء کے کلکتہ سیشن کے بعد کانگریس سے دل برداشتہ ہو چکے تھے چونکہ کانگریس نے انہیں مکمل طور پر

نظر انداز کر دیا تھا۔ انہوں نے الزام لگایا تھا کہ گاندھی جی فرقہ پرست جماعت ہندو مہا سبھا اور ہندو ازم کی بالادستی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کا موقف تھا کہ مسلم کمیونٹی سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات نے عدم اعتماد کی اس کیفیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) میں مہاتما گاندھی کی شرکت کے ساتھ نافرمانی کی تحریک ختم ہو چکی تھی۔ بعد میں سول نافرمانی کی تحریک "ہمالیائی غلطی" قرار دی گئی اور اس طرح قائداعظم کے فیصلہ کی معقولیت ثابت ہونے میں کوئی کسر نہ رہ گئی۔

۱۹۳۰ء تک قائداعظم محمد علی جناح کا قدو قامت بہت بلند ہو چکا تھا۔ انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے وفاقی آئین کے لئے بڑی جدوجہد کی تھی اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ محکمہ دفاع بھی وفاق ہند کے تابع ہونا چاہئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے خصوصی تحفظات کے مطالبہ کیا تھا اس میں بعض لبرل ہندو رہنما بھی اس مطالبہ میں شریک و سہیم تھے۔ مثلاً شاستری، سرتیج بہادر سپرو، سرچمن لال سیتل واڈ اور کانجی دوار کا داس۔ خواہ وفاقی مسئلہ ہو یا صوبائی معاملات قائداعظم جناح کی آواز دلائل و براہین کی آواز تھی۔ اور یہی آواز ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کے پائیدار حل کی آواز تھی۔ اس صورتحال میں ایک مرتبہ پھر وہ شخص جو کہ "عدم تشدد" کا حامی نہ تھا۔ اس نے ثابت کر دکھایا کہ وہ امن بھائی چارہ اور خلوص نیت پر سچا یقین رکھتا ہے۔ قائداعظم ہندوستان کی آزادی کے اعلیٰ مقصد کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ منطقی انداز میں آگے بڑھا رہے تھے عدم تعاون **ستیہ** گرہ اور سول نافرمانی کی دوسری صورتوں سے متعلق ان کی بے چینی ان کے غیر معمولی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔

اس متلون ماحول کے پس منظر میں قائداعظم کی قانونی اور منطقی شخصیت نے دوسری گول

میز کانفرنس کے بعد ہندوستانی سیاست سے بیزار ہو کر لندن میں ہی سکونت اختیار کرلی اور پریوی کونسل میں وکالت شروع کر دی۔ برطانوی حکومت کا کمیونل ایوارڈ(Communal Award) دوسری گول میز کانفرنس کے مباحثوں کا یک طرفہ نتیجہ تھا۔ لیکن کمیونل ایوارڈ سے مسلم لیگ مطمئن نہیں تھی۔ بعض مسلم لیگی زعماء لیاقت علی خان، راجہ صاحب محمود آباد، سید عبدالمتین چودہری نے قائداعظم کو ہندوستان واپس آنے کی ترغیب دی۔ قائداعظم اس ۱۹۳۴ء میں برصغیر واپس آگئے اور ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت ہونے والے پہلے انتخابات میں ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے بلامقابلہ رکن منتخب کر لئے گئے۔ انہوں نے انڈیپینڈنٹ پارٹی (جس کے ۲۲ ممبران میں سے ۱۸ مسلمان تھے) کے رہنما کی حیثیت سے اہم کردار سرانجام دیا۔ کانگریس اور نیشنلسٹ پارٹی کے بالترتیب ۴۴ اور گیارہ ممبران تھے حکومتی ارکان کی تعداد ۵۰ ارکان پر مشتمل تھی۔ کانگریس کے دونوں گروپس کے ارکان کی تعداد ۵۵ تھی اس طرح ترازو کا پلڑا قائداعظم کی انڈیپینڈنٹ پارٹی کے حق میں تھا۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لکھنؤ نے مسلم سیاست کا رخ ہی پلٹ دیا۔ اس دوران کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی شکایتوں پر مشتمل پیرپور رپورٹ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین خلیج کو کچھ اور وسیع کر دیا اور پھر یہ دعویٰ کہ ہندوستان میں صرف دو سیاسی قوتیں ہیں انگریزی حکومت اور کانگریس کا خاصہ ناعاقبت اندیشانہ موقف ثابت ہوا۔

اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے تا آنکہ ہم برصغیر کی سیاست کے تیسرے دور "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک (۱۹۴۲ء) کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۳۰ اگست ۱۹۴۲ء میں ایک ریزولیشن کانگریس کے ہندوستان چھوڑ دو ریزولیوشن کے صرف ۱۲ روز کے بعد پاس کیا۔ جس میں مسلم لیگ نے اپنے لیڈر قائداعظم کی قیادت میں اپنی پوزیشن واضح

کردی کہ مسلمان بھی ملک کی آزادی اور ہندوستانی عوام کی بہتری کی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور یہی آل انڈیا مسلم لیگ کا نصب العین ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے عہد آفریں واقعات، عدم تعاون کی تحریک، سول نافرمانی کی تحریک اور انڈیا چھوڑ دو تحریک کے سلسلہ میں قائداعظم تیسری دنیا کے ایک بے مثال سیاسی رہنما کے طور پر افق سیاست پر ابھرتے ہیں۔ انہوں نے عوام پر اپنے سحرانگیز اثر کو محسوس کر کے کسی ناعاقبت اندیشانہ طریق کار کو اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے اثر کو عوام کو منظم کرنے اور قانون کی بالادستی کو تسلیم کرانے کے لئے استعمال کیا۔ اس صدی کے ایک عظیم سیاسی قائد کی حیثیت سے ان کے کردار کا صحیح تعین تاہنوز عالمی سطح پر نہیں کیا جاسکا ہے۔

قائداعظم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی قیادت میں اپنے پیروکاروں کو ایسے کسی راستے پر چلنے کی تلقین نہیں کی جس پر گامزن ہو کر انہیں پچھتانا پڑے۔ وہ ایک غیر جذباتی رہنما تھے اور انہوں نے جس مہارت اور خوبی کے ساتھ سیاسی گتھیوں کو سلجھایا اور وہ جس منطقی طور پر درست انداز میں ایک مسلم مملکت کو وجود میں لائے وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔

maablib.org

قائداعظم کاایک سفر

ممتاز حسن

۳۰نومبر ۱۹۴٦ء کا دن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ کیونکہ اس روز میں نے پہلی مرتبہ قائداعظم کو قریب سے دیکھا اور ان سے باتیں کیں۔

اسی روز میں لیاقت علی خاں صاحب کی معیت میں دہلی سے کراچی پہنچا تھا۔ ہمارے ہمراہیوں میں لارڈ ویول' ان کے پرائیوٹ سیکرٹری سر جارج ایبل اور ان کے نائب ملٹری سیکرٹری میجر میکنزی بھی تھے۔ اسی شام پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ بھی دہلی سے کراچی پہنچنے والے تھے اور ہم سب کو دوسرے دن علی الصباح انگلستان روانہ ہونا تھا۔ اس سفر کی غرض و غایت سیاسی تھی برطانوی گورنمنٹ چاہتی تھی کہ ہندوستانی حکومت ہندوستان کو سونپ دی جائے مگر ہندوستان متحد رہے۔ سر سیخورم کرپس کا ۱۹۴۴ء کا مشن' جنگ کے خاتمے کے بعد پارلیمنٹری ڈیلیگیشن اور پھر کیبنٹ مشن ان سب کی لگا تار کوشش یہی تھی کہ ہندوستان ایک رہے۔ یہ لوگ ایسا کیوں چاہتے تھے؟ یہ ایک الگ بحث ہے' مگر اس کے اصل معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کو مسترد کر دیا جائے۔ جب ستمبر ۱۹۴٦ء میں کانگریس اور اکتوبر ۱۹۴٦ء میں مسلم لیگ ہندوستان کی انٹرم گورنمنٹ میں شامل ہوئیں تو انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ ان دونوں پارٹیوں کو گورنمنٹ میں رکھا جائے اور ان میں سے ایک یعنی کانگریس کو دوسری یعنی مسلم لیگ پر مسلط کر دیا جائے۔ مسلم لیگ پر یہ بھی زور دیا جا رہا تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں شامل ہو۔ مسلم لیگ کو اس سے انکار تھا۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ چونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں تھوڑے تھے' ان کی کوئی بات اس قسم کی اسمبلی میں نہیں چلے گی۔ بہرحال کچھ اس قسم کے حالات تھے جن کے پیش نظر گورنمنٹ برطانیہ نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان کے انگریز وائسرائے اور اس کی کونسل کے

کانگریسی اور مسلم لیگ پارٹیوں کے لیڈروں اور قائداعظم کو لندن میں بلا کر آخری فیصلہ کرنے کوشش کی جائے۔ قائداعظم کے ساتھ گفت و شنید ہو چکی تھی اور وہ ایک حد تک لندن جانے پر رضامند ہو چکے تھے۔ ۳۰ نومبر کو جب ہم کراچی پہنچے تو وائسرائے، گورنر سندھ، قائد اعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کے درمیان مزید گفت و شنید ہوئی اور قائداعظم کے سفر لندن کا آخری فیصلہ ہو گیا۔

کراچی میں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد لیاقت علی خاں قائداعظم سے ملنے گئے۔ میں بھی ساتھ گیا۔ قائداعظم ان دنوں سندھ کے پرانے گورنمنٹ ہاؤس میں جہاں آج کل گورنر سندھ رہتے ہیں مقیم تھے یہ مکان ان دنوں میر بندے علی خاں تالپور وزیر سندھ کے تصرف میں تھا اور انہوں نے اسے قائداعظم کے حوالے کر رکھا تھا۔ مکان کے دروازے پر دو مسلم لیگ نیشنل گارڈ سبز وردیاں پہنے پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے جب لیاقت علی صاحب سے کہا کہ میں نے آج تک قائداعظم سے ہاتھ نہیں ملایا، نہ کبھی کوئی بات کی ہے تو انہیں بہت تعجب ہوا اور بات واقعی عجیب تھی۔ کیونکہ میں جنگ شروع ہونے سے پہلے سے گورنمنٹ آف انڈیا میں تھا اور اس سارے عرصے میں دہلی سیکرٹریٹ اور اسمبلی کی غلام گردشوں میں مسلسل گردش کرتا رہا تھا۔ اسمبلی کی اکثر پارٹیوں کے ارکان کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ دہلی کی سیکرٹریٹ میں مقام تھا جہاں بڑے سے بڑے ہندو اور مسلمان مشاہیر اور خدام قوم کسی نہ کسی غرض یا بہانے سے آتے جاتے رہتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بارگاہ حکومت کے مقربین سے ان کے تعلقات خوشگوار رہیں۔ مگر ایک جناح تھے جنہیں کسی سے غرض تھی نہ واسطہ اور جنہیں کسی نے دہلی میں وائسرائے کے علاوہ کسی کے پاس جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسمبلی میں بھی وہ کسی سے خوش گپیاں کرتے نہیں دیکھے گئے بلکہ اکثر تو آتے ہی نہیں تھے مجھے یاد ہے کہ ایک بہت بڑے انگریز ممبر آف کونسل کو ایک مدت تک اس بات

کی آرزو رہی کہ کوئی شخص انہیں جناح صاحب سے ملائے اور جب ایک دن ان کے ایک دوست کی کوشش سے ان کی یہ آرزو بر آئی تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر مجھے جناح صاحب کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اگر میں مسلم لیگ کے کسی رکن سے کہہ دیتا تو وہ یقیناً" مجھے جناح صاحب سے متعارف کرا دیتے۔ مگر جب کبھی مجھے اس کا خیال آیا اکثر یہی سوچا کہ آخر مجھے ان سے کیا کہنا ہے اور ایک ایسے شخص کا وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل ہے جسے دن رات ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے سوا اور کوئی چیز پیش نظر نہیں ہے۔

بہرحال جو ملاقات پہلے نہیں ہو سکی تھی، وہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ لیاقت علی خاں صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا اور انہوں نے دو چار رسمی سی باتیں مجھ سے کیں اور پہلی ملاقات ختم ہو گئی۔ یہ ملاقات نہایت مختصر تھی اور میرے اور ان کے درمیان میری عقیدت مندی کا پردہ حائل رہا اور ان میں کی شخصیت کے ظاہری پہلو پر اچھی طرح نظر بھی نہ ڈال سکا۔

دوسری صبح ہم سب کراچی سے روانہ ہونے والے تھے ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو وہاں لارڈ ویول، سر فرانسس موڈی گورنر سندھ، سردار بلدیو سنگھ وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔ پنڈت نہرو ہوائی جہاز کے اندر پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ جہاز روانہ ہونے میں دس بارہ منٹ باقی تھے اور قائداعظم کا انتظار تھا۔ کوئی پانچ سات منٹ رہ گئے ہوں گے کہ وہ تشریف لائے۔ ہوائی اڈے کے باہر مسلمانوں کا ایک عظیم الشان ہجوم تھا جو انہیں رخصت کرنے کے لئے موٹروں، لاریوں، گاڑیوں، بائیسکلوں وغیرہ پر کراچی سے ڈرگ روڈ پہنچا ہوا تھا۔ قائداعظم جہاز کی طرف آنے سے پہلے مسلمانوں کے مجمع کے سامنے تشریف لے گئے اور فضا اللہ اکبر، قائداعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ یہ عالم دیر تک قائم رہا اور جہاز کو

کچھ دیر بھی ہو گئی۔ آخر قائداعظم اندر تشریف فرما ہوئے اور جہاز کچھ عرصے کے بعد چل پڑا۔ قائداعظم کے ساتھ ان کے پرائیوٹ سیکرٹری خورشید حسن تھے جو آج کل سری نگر میں قید ہیں۔

جہاز میں جناح صاحب سب سے آگے بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ والی نشست خالی تھی پیچھے پنڈت نہرو اور ان کے پیچھے لارڈ ویول بیٹھے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ جناح صاحب نے اپنے کاغذات نکالے اور انہیں پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ناول نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ اپنے لندن کے مشن کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ جہاز میں ان سے کچھ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے میں یہ تو نہ دیکھ سکا کہ وہ اپنا مخصوص مانوکل لگائے پورے انہماک سے گردو پیش سے بے نیاز کسی کام میں مصروف ہیں اور کن کاغذات کا مطالعہ کر رہے ہیں مگر یہ ضرور دیکھا کہ وہ پنسل سے کاغذات پر نشان بھی کرتے جاتے تھے اور نوٹ بھی لے رہے تھے۔ خورشید صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے ساتھ اس وقت ایک بھرا ہوا بکس کاغذات کا تھا جو اکثر اہم موقعوں پر قائد اعظم کے ہمراہ رہتا تھا۔

جہاز اڑتا رہا اور قائداعظم انہماک سے اپنا کام کرتے رہے حتیٰ کہ بصرہ آ گیا اور ہم لوگ وہاں ایک گھنٹہ کے لئے اترے۔ یہاں ایک معقول تعداد ہندوستانی مسلمانوں کی موجود تھی۔ جنہوں نے ان کے استقبال میں پرجوش نعرے لگائے۔ مسلمان سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے بھی اپنے قومی جذبات کا مظاہرہ کیا۔ کچھ ہندو اور سکھ سپاہیوں نے پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کا خیر مقدم کیا اور اس پر لارڈ ویول کے انگریز ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی فوج سیاسیات کی نذر ہو چکی ہے میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

بصرہ کے ایک گھنٹہ کے قیام میں لوگوں نے قائداعظم کو بیٹھنے نہیں دیا۔ مسلمانوں نے

آگے بڑھ بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا' ان سے باتیں کیں' ان کی تصویریں اتاریں اور شاید ان حضرات کا پروگرام ابھی نامکمل ہی تھا کہ گھنٹہ ختم ہوگیا اور ہم سب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پھر اڑنے لگے۔

جناح صاحب کو بھی میں نے دیکھا تو پھر حسب معمول مصروف پایا۔ دوپہر کے کھانے اور سہ پہر کی چائے کے علاوہ شاید ہی ان کے کام میں کوئی وقفہ آیا ہو۔ ساڑھے چار بجے تک یہی سلسلہ رہا۔ اتنے میں ہم قاہرہ پہنچ گئے۔

قاہرہ پر مصریوں نے قائداعظم کا پرجوش استقبال کیا۔ اخوان المسلمین کے لیڈر شیخ حسن النبا کی طرف سے قائداعظم کی خدمت میں ایک مصری قرآن شریف پیش کیا گیا۔ کچھ ہندوستانی مسلمان بھی تھے مگر ان میں اکثر مشتبہ اور مشکوک قسم کے انسان واقع ہوئے تھے ان میں دو چار کے متعلق مجھے خاصا چوکنا رہنا پڑا۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے سے ہمیں **شیپرڈ** ہوٹل میں لایا گیا۔ جہاں قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کے کمرے ساتھ ساتھ تھے اور خورشید صاحب اور میں بھی قریب ہی کے کمروں میں تھے۔ وہاں اترے ہی تھے کہ قائداعظم کے لئے ملاقاتیوں' پریس کے نامہ نگاروں' فوٹوگرافروں' ایڈیٹروں اور مصر کے سیاسی قائدین کا ایک تانتا بندھ گیا اور انہیں ایک منٹ کی فرصت بھی مشکل سے ملی۔ ایک خاص بات جو میں نے دیکھی یہ تھی کہ قائداعظم جس کسی کو کوئی بیان دیتے تھے اسے کہتے تھے کہ اسے لکھ کر مجھے دکھاؤ' پھر چھاپو پھر مسودہ انہیں دکھایا جاتا تھا اور وہ اس کی تصحیح کرکے خورشید صاحب کے حوالے کرتے تھے تاکہ ٹائپ ہو کر ان کے سامنے دوبارہ منظوری کے لئے پیش کیا جائے اور وہ اس کے چھاپے جانے کی اجازت دیں۔ یہ کام خود ان کے لئے اور دوسروں کے لئے بڑی محنت کا تھا مگر ان کا حکم تھا اور اس کی تعمیل لازم تھی۔

دس بجے کے قریب قائداعظم ہم سب کو ساتھ لے کر ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں

گئے۔ ابھی میز پر بیٹھے تھے کہ خبر آئی کہ عبدالرحمان نظام پاشا سیکرٹری عرب لیگ ملاقات چاہتے ہیں انہیں بھی وہیں کھانے کے کمرے میں بلا لیا گیا اور قائداعظم نے میز پر بیٹھے بیٹھے ان سے باتیں کیں۔

کھانے کے بعد وہی ملاقاتیوں کا سلسلہ جاری رہا اور اسی صورت سے رات کا ایک بج گیا۔ اس سارے عرصے میں قائداعظم یا تو کھانے کے کمرے میں گئے تھے یا شاہ مصر کے محل پر ملاقاتیوں کی کتاب میں نام لکھنے' باقی سارا وقت ان کا اپنے کمرے میں ہی گزرا تھا۔ ایک بجے کے قریب انہوں نے پوچھا کہ کوئی اور شخص تو ملنا نہیں چاہتا۔ ہم نے کہا صرف کچھ مسلمان سپاہی باقی رہ گئے ہیں جن کی ابھی تک باریابی نہیں ہو سکی۔ یہ سن کر قائداعظم کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان سپاہیوں کو وردیوں میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ان کا حال پوچھا اور انہیں رخصت کر کے کمرے میں واپس تشریف لائے۔ اس کے بعد ہمیں بھی چھٹی ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ خورشید صاحب کی اور میری آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ اس روز جناح صاحب نے کم و بیش بیس اکیس گھنٹے کام کیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک دبلے پتلے کمزور ستر برس کے انسان کے لئے کیونکر ممکن ہے۔

ابھی ہم لیٹے ہی تھے کہ ہوٹل والوں نے جگا دیا۔ ساڑھے تین بجے صبح ہمیں ہوٹل سے ہوائی اڈے جانا تھا اور چار بجے جہاز کی روانگی تھی۔ جہاز میں پہنچ کر میں نے دیکھا تو باقی سب لوگ نیند کے مختلف درجوں میں تھے۔ آنکھیں پوری کھلتی بھی نہیں تھیں مگر قائداعظم معلوم ہوتا تھا حجامت بنا چکے ہیں اور شاید نہا بھی چکے ہیں کیونکہ ان کے چہرے یا لباس سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک بجے رات تک کام کرتے رہے ہیں۔ بہر حال ہم لوگ تو جہاز میں خوب سوئے' کافی دن گئے آنکھ کھلی۔ اس وقت مالٹا قریب تھا۔ وہاں پہنچنے سے کچھ پہلے ہوائی

جہاز کے چار انجنوں میں سے ایک انجن بے کار ہو گیا اور ہمیں مالٹا میں ٹھہرنا پڑا۔ قائداعظم گورنر مالٹا کے ہاں ٹھہرے۔ انجن کی مرمت نہ ہو سکی تو ایک اور جہاز جو مارسیلز کے قریب پہنچ چکا تھا، مارسلیز پر اترنے سے پہلے واپس بلا لیا گیا اور اس کے پہلے مسافروں کو اس میں سے نکال کر ہم سب کو اس میں سوار کرا دیا گیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ اگلے دن صبح سویرے ہم لندن میں ہیتھ رو کے ہوائی اڈے پر اترے۔ لارڈ پیتھک لارنس اور کچھ اور برطانوی وزراء وہاں استقبال کے لئے موجود تھے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کو کلیریجز ہوٹل میں جو شاید لندن کا سب سے اونچا ہوٹل ہے ٹھہرایا گیا۔ ہمارے کمرے بھی اسی ہوٹل میں تھے۔ میرے پاس ایک ڈبل بیڈ روم تھا۔ دوسرے دن جب "ڈان" کے ایڈیٹر الطاف حسین صاحب لندن پہنچے تو وہ بھی میری دعوت پر میرے ہی کمرے میں آ گئے۔ جن کمروں میں قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کو ٹھہرایا گیا تھا انہیں ہوٹل میں "رائل سویٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں یورپ کے اکثر حکمران تخت و تاج سے محروم ہونے سے پہلے یا بعد ٹھہر چکے ہیں۔ یونان کا بادشاہ جارج وہاں تین چار سال تک رہا۔

چونکہ لندن کا سفر محض سیاسی تھا اس لئے قائداعظم کا وقت زیادہ تر سیاسی گفتگوؤں اور برطانیہ کے سیاسی لیڈروں سے ملاقاتوں میں صرف ہوا۔ کبھی کبھی وہ تھیٹر بھی تشریف لے جاتے یا ایک آدھ مرتبہ بازار پیدل چلے گئے۔ جس کی وجہ سے ان کے محافظ پولیس کے سپاہیوں کو کافی تشویش ہوئی۔ برطانوی گورنمنٹ نے دو اعلیٰ موٹر کاریں قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کے لئے مخصوص کر رکھی تھیں اور دو اسکاٹ لینڈ کے سپاہی بھی حفاظت پر مامور تھے۔ میں نے اور خورشید صاحب نے سازش کی اور ایک موٹر کار اپنے استعمال میں لے لی اور جب وقت ملتا اس میں لندن کی سیر کر لیتے۔ اس کے علاوہ بڑا کمال یہ کیا کہ ان

دونوں سپاہیوں میں سے ایک کو اپنی مشاورت اور رہبری کے لئے لے لیا تاکہ ہمیں سیر میں مدد دے۔ قائداعظم کی خدمت میں جب ہم نے ان کی اطلاع کے لئے اس بندوبست کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے ہمیں دیکھا اور ہم نے سمجھا کہ معاملہ ٹھیک ہو گیا۔

قائد اعظم لندن میں صبح سات بجے سے پہلے اٹھتے تھے۔ سات بجے ان کے کمرے میں چائے پہنچائی جاتی تھی۔ وہ آٹھ بجے تک کپڑے پہن اور اخبار پڑھ کر اپنی ڈاک دیکھ رہے ہوتے تھے۔ خورشید صاحب کو ان کی ڈاک کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ہر خط کو سب سے پہلے خود دیکھتے اور پھر یا خود اس کا جواب لکھاتے یا اس پر کوئی حکم لکھ دیتے۔

ان کی پوشاک نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی ان کی وضع، انداز گفتگو اور **طبعیت** کی متانت کچھ اس درجہ پر تھی کہ میں نے جب کبھی انہیں کسی بڑے سے بڑے برطانوی سیاست داں سے باتیں کرتے دیکھا یہی محسوس ہوا کہ وہ ان کے برابر کا آدمی نہیں ہے۔ برطانوی وزراء کی شخصیت اور ان کی قابلیت سے وہ کوئی زیادہ متاثر بھی نہیں تھے۔

قائداعظم کی گفتگو میں یہ خاص بات تھی کہ جو کچھ وہ کہتے تھے وہ نہایت واضح اور قطعی ہوتا تھا۔ ایک ایک لفظ کو صاف صاف اور علیحدہ علیحدہ ادا کرتے تھے اور مخاطب تک اپنا مافی الضمیر اس خوبی سے پہنچاتے تھے کہ کسی غلط فہمی یا ابہام کا امکان نہیں رہتا تھا۔ پڑھتے وقت یا کسی مسئلے پر غور کرنے کے دوران میں ان کی انگلیاں بے اختیار مانوکل کی طرف جاتی تھیں۔ وہ مانوکل پہنے ہوئے ایسے باوقار معلوم ہوتے تھے کہ تصویر اتارنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک بے مثال دلکشی تھی۔ مگر کوئی شخص بغیر ان کے مسکرائے ان کے سامنے ہنس یا مسکرا نہیں سکتا تھا ان کے ہاتھوں کی انگلیاں حسین تھیں اور وہ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے یا اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اپنی انگلیوں کو حرکت دیتے تھے او مخاطب کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے تھے۔ آنکھوں میں ایک مقناطیسی

چمک تھی۔ ان کی نظر ہر کام کے اصول کے علاوہ جزئیات پر رہتی تھی۔ ان کی **طبعیت** ایک سلیقہ اور ایک باضا**بطگی** تھی جس کی شہادت نہ صرف ان کے سیاسی کارناموں میں بلکہ ان کی روزانہ زندگی میں بھی ملتی تھی۔

لندن کے قیام کے دوران میں سرکار برطانیہ کی طرف سے قائداعظم کی خوب مہمانداری گئی۔ لنکاسٹر ہاؤس میں ڈنر ہوا۔ پھر ہاؤس آف کامنز میں دعوت ہوئی پھر بادشاہ نے لنچ پر یا۔ پھر انڈیا ہاؤس میں ہندوستانی ہائی کمشنر نے چائے کی دعوت دی۔ عام طور پر قائداعظم اور قت علی خاں کی دعوت الگ ہوتی تھی' اور پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کی الگ۔ ایک فعہ غلطی سے مجھے پنڈت نہرو کی پارٹی کا دعوت نامہ پہنچ گیا۔ میں نے فوراً "گورنمنٹ برطانیہ کے افسر متعلقہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اور اس نے بڑے ہی تپاک سے میرا شکریہ ادا کیا۔ ورنہ اگر میں وہ دعوت قبول کر لیتا تو شاید ان لوگوں کے لئے کچھ اچھا نہ ہوتا۔ سوائے بادشاہی لنچ اور نڈیا ہاؤس کی پارٹی کے مجھے کوئی پارٹی ایسی یاد نہیں ہے۔ جہاں قائداعظم' لیاقت علی خاں صاحب' پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ سب ہی موجود ہوں۔

لندن کی سیاسی گفتگوؤں کا فیصلہ ٦ دسمبر کو ہو گیا۔ مگر قائداعظم نے فرمایا کہ وہ لندن میں کچھ دن اور قیام کریں گے اور وہ دو ہفتے تک وہاں ٹھہرے۔ اس قیام کے تین واقعات مجھے خاص رپر یاد ہیں۔ پہلا واقعہ قائداعظم کی ایک پبلک تقریر تھی جو لندن کے **کنگز** وے ہال میں ہوئی۔ اس میں دو تین ہزار کے قریب آدمی موجود تھے۔ قائداعظم نے ایک وکیل کی طرح تقریر شروع کی۔ ابتدا میں واقعات بیان کئے اور ان کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ان کی گفتگو میں ایک گرمی اور آواز میں ایک کڑک آ گئی۔ تقریر کے دوران میں کسی ہندو نے جو ایک طرف بیٹھا تھا کچھ شور مچایا ایسے موقعوں پر بہت سے لیڈر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ قائداعظم نے اس کا بالکل کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ دو لمحوں کے لئے رک گئے اتنے

میں ہمارے والنٹیروں نے اس فسادی شخص کو ہال سے باہر کر دیا۔ اور قائداعظم کے ماتھے پر نہ تو اس وقت کوئی بل آیا نہ ان کی تقریر میں کوئی فرق پڑا اور نہ اس کے بعد اس واقعہ کا کوئی تذکرہ کیا۔

دوسرا واقعہ جمعہ کی نماز کا ہے۔ قائداعظم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ جمعہ کی نماز لندن کی کسی مسجد میں ادا کریں۔ انہوں نے گرم جوشی سے یہ تجویز منظور فرمائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اس مسجد میں جانا پسند کروں گا جہاں عام مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔ ہم نے ایسٹ اینڈ کی ایک مسجد جو غریب مسلمانوں کی آبادی کی ہوتی ہے، منتخب کی۔ وہاں قائداعظم پہنچے تو خطبہ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اگلی صفوں میں ان کے لئے جگہ خالی کر دی مگر انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں دیر سے آیا ہوں اس لئے جہاں مجھے جگہ ملی وہی میرے لئے مناسب ہے۔ نماز کے بعد لوگوں نے نہایت پرجوش مصافے کئے ایک شخص پر مصافحے کے بعد رقت طاری ہو گئی اور اس نے مسجد میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ اے خدا تو میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ اکثر حاضرین آبدیدہ ہو گئے۔

تیسرا واقعہ ڈاکٹر بک مین سے متعلق ہے جو "مارل ری آرمامنٹ" کی تحریک کے علم بردار ہیں۔ انہوں نے قائداعظم کو ویسٹ منسٹر تھیٹر میں اپنی تحریک سے متعلق ایک ڈرامہ دیکھنے کی دعوت دی۔ کھیل ختم ہوا تو ہمیں وہ کھانا کھلانے اپنے مکان پر لے گئے۔ اس مکان میں کسی زمانے میں لارڈ کلایو رہا کرتا تھا۔ یہاں ڈاکٹر بک مین کے حاشیہ نشین جن میں نوجوان عورتیں بھی تھیں، میزبانی کے فرائض ادا کرنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تحریک کے اوصاف بھی بیان فرماتی جاتیں۔ ڈاکٹر بک مین نے بھی جناح صاحب سے یہی تذکرہ چھیڑا۔ کچھ عرصے تک اسی تحریک کے متعلق گفتگو رہی اور ڈاکٹر بک مین تبلیغ کرتے رہے مگر کچھ عرصے کے بعد مجھے یک لخت محسوس ہوا کہ گفتگو ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر نہیں بلکہ پاکستان کی ضرورت اور اس

کے قیام کے امکان پر ہو رہی ہے۔ اور خود قائداعظم بات کر رہے ہیں۔ اس کے بعد باقی کے دو تین گھنٹے تک میں نے سوائے پاکستان کے کوئی بات نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قائداعظم کسی اور موضوع پر دھیان دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ محض رسمی طور پر اور اپنے میزبان کو خوش کرنے کے لئے بھی نہیں۔

ہاں! ایک اور معمولی سا واقعہ یاد آیا۔ بادشاہ کا لنچ پہلے جس دن مقرر ہوا تھا' اتفاق سے اس روز محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ یہ تاریخ پہلے سے مقرر ہو چکی تھی۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے قائداعظم کی خدمت میں گزارش کی۔ انہوں نے فی الفور لارڈ ویول سے جو ان کے قریب تھے بات کی اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں بادشاہی دعوت میں اس روز شریک نہ ہو سکوں گا۔ یہ واقعہ سفر کے دوران کا ہے۔ لارڈ ویول نے فوراً لندن تار دیا اور ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے تاریخ بدل چکی تھی۔

سیاسی میدان میں قائداعظم نے لندن جا کر فتح پائی اور در حقیقت اسی سفر میں پاکستان کی عمارت کی بنیاد اٹھائی گئی۔ واپسی پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ مصر میں تین دن ٹھہریں قاہرہ میں عرب لیگ کی طرف سے دعوت آ چکی تھی۔ قاہرہ میں اسی **شیپرڈ** ہوٹل میں ٹھہرایا گیا قائداعظم کے لئے جو کمرہ مقرر کیا گیا تھا وہ انہیں پسند نہ آیا اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں وہی کمرہ دیا جائے جہاں وہ لندن جاتے ہوئے ٹھہرے تھے ان کی یہ خواہش فی الفور پوری کی گئی اور مجھے اور خورشید صاحب کو بھی ان کے اور لیاقت علی خاں صاحب کے کمروں کے برابر میں کمرہ دیا گیا۔

مصر میں قائداعظم کا یہ تین دن کا قیام ایک تاریخی قیام ہے' کیونکہ انہوں نے ان تین دنوں میں مصری مسلمانوں کے دلوں پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ بادشاہ مصر' وزیراعظم اور دوسرے وزراء سے ملے۔ مفتی اعظم سے ملاقات کی۔ حزب اختلاف کے لیڈر مصطفیٰ

نحاس پاشا نے بھی ان کی دعوت کی۔ مصطفیٰ نحاس ان مصری قارئین سے ہیں جن کا عرصے تک کانگریس سے رابطہ رہا ہے وہ مسلم لیگ سے بدظن تھے' ان کے ہاں کھانا بڑا پرلطف تھا اوران کا گھر بھی محل سا معلوم ہوتا تھا۔ کھانا کھا چکے تو وہ قائداعظم کو تخلیئے میں لے گئے جہاں ان دونوں کے علاوہ صرف ایک شخص اور تھا' یہ ترجمانی کے فرائض ادا کرتا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو رات کے ایک بجے تک ہوتی رہی۔ قائداعظم نے بعد میں کہا کہ اس نے بہت سے سوالات نہایت معاندانہ نقطہ نگاہ سے کئے۔ بہرحال اگلے دن جب مصطفیٰ نحاس قائداعظم سے ان کے ہوٹل میں ملنے آئے تو ان کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی قائداعظم سے معانقہ کیا اور انہیں بوسہ دیا۔ پھر وہ اسی گرم جوشی سے لیاقت علی خاں صاحب سے ملے۔

یہی حال مصری اخباروں کا تھا۔ قائداعظم کے ورود سے قبل چند وہ اخبار بھی جو ان کے اور مسلم لیگ کے مخالف تھے اور جن میں سے بعض کو شاید اس سلسلے میں مالی امداد بھی ملتی تھی تین دن کے اندر اندر ان کا دم بھرنے لگے۔

مصر کے وزیر اعظم نے قائداعظم کی دعوت دی۔ ایک اور وزیر ایاز پاشا اور عرب لیگ نے بھی۔ ایک شام کو مجھے خیال آیا کہ اہرام مصر کو دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے چند گھنٹے کی چھٹی مانگی۔ قائداعظم نے فرمایا کہ جاؤ مگر شرط یہ ہے کہ تم ان کے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ یہ بات انہوں نے اس انداز سے کہی جیسے انہیں یقین ہے کہ اگر وہ مجھے تنبیہہ نہیں کریں گے تو شاید میں اہرام پر چڑھنے سے باز نہیں آؤں گا۔ اور اس کا نتیجہ یقیناً" یہ ہو گا کہ ان کے ہمراہیوں میں سے ایک کی ہو جائے گی۔ ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے پکا وعدہ کیا کہ ہرگز اہرام پر چڑھنے کی کوشش نہیں کروں گا اور اس وعدے کو نبھایا۔

ہم لوگوں کو ان سے کام کے علاوہ ملنے کا موقع شاذ ہی ملتا تھا مگر ہمیں نہ معلوم کیوں یہ تسلی

ہر وقت رہتی تھی کہ ان کی شفقت ہر وقت شامل حال ہے۔ جب وہ ہمیں کھانے پر اکٹھا بلاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی سردار اپنے قبیلے کو اکٹھا کر رہا ہو۔ وہ ہم سے ملتے کم تھے مگر ہماری طرف سے بے خبر کبھی نہ تھے۔ ایک مرتبہ خورشید صاحب کی **طبعیت** معمولی طور پر خراب تھی۔ انہیں معلوم ہوا تو وہ خود اپنے کمرے سے اٹھ کر خورشید صاحب کے کمرے میں ان کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ جو لوگ قائداعظم کی مصروفیت اور ان کی زندگی کے نظم و ضبط سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا خود خورشید صاحب کے کمرے میں آنا کس قدر شفقت بزرگانہ کا پتہ دیتا ہے۔ خورشید صاحب کے پاس انگلستان کی سردی سے مقابلہ کرنے کے لئے مناسب گرم کپڑے نہیں تھے۔ جب قائداعظم کو معلوم ہوا تو انہوں نے کراچی ہی میں انہیں اپنا ایک نفیس اوورکوٹ اور شاید کچھ اور کپڑے دیئے۔

قاہرہ سے واپسی پر بی او اے سی کے لوگوں نے ایک حماقت کی۔ رات کا سفر تھا اور ان کا وعدہ تھا کہ وہ ایسا ہوائی جہاز مہیا کریں گے جس میں آرام سے سونے کا انتظام ہوگا۔ جب ہم ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو معمولی قسم کا تھا۔ جس میں قائداعظم کو کرسی پر بیٹھ کر رات کاٹنی پڑی اور وہ بہت تھک گئے۔

جب ہم کراچی پہنچے تو قائداعظم وہیں اتر پڑے۔ لیاقت علی خاں صاحب کو دہلی جانا پڑا اور مجھے ان کے ساتھ۔ جہاز کراچی کے اڈے پر رکا تو قائداعظم اٹھے۔ جہاز سے باہر نکلنے سے پہلے میری طرف تشریف لائے اور کہنے لگے کہ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ خدا حافظ انہوں نے ہاتھ ملایا۔ میں نے خدا حافظ کہا اور وہ جہاز سے اتر کر میرے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم کی طرف بڑھے اور غائب ہو گئے۔

سہ ماہی **صحیفہ** لاہور ستمبر دسمبر ۱۹۷۶ء

قائداعظم کی پہلی اردو تقریر

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

تقسیم سے کئی برس پہلے کا ذکر ہے کہ اینگلو عربک کالج دہلی نے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ طلبائے کالج کو خطاب فرمائیں۔ یہ درخواست طلبا کے پیہم اصرار اور خواہش پر کی گئی تھی۔ قائداعظم نے اسے قبول کرلیا اور ایک تاریخ مقرر کی کہ اس روز' شب کے وقت کالج کے طلبا کو مخاطب کریں گے۔ تقریر سے پہلے کالج کی طرف سے ایک مختصر سی کھانے کی دعوت بھی دی گئی جس میں قائداعظم کے علاوہ کالج کے پرنسپل اور چند اور صاحب شریک تھے مجھے بھی اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

کھانا سادا اور اچھا تھا زیادہ کھانے نہیں تھے اور جو دو چار چیزیں تھیں وہ ایسی تھیں جو روزانہ اوسط درجے کے مسلمان شرفا کے گھروں میں پکتی ہیں۔

کھانے کے بعد قائداعظم نے مجھ سے فرمایا "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے سب سے پہلے اردو میں تقریر کہاں کی؟"

اور پھر خود ہی بیان کیا کہ میمن سنگھ (مشرقی پاکستان) میں ایک جلسہ (انتخابی یا کسی اور نوعیت کا یہ مجھے یاد نہیں رہا) تھا لوگ جمع ہونے شروع ہوئے اور جتنی توقع تھی اس سے زیادہ جمع ہو گئے۔

اس موقع پر سرعزیزالحق میرے ہمراہ تھے۔ میں نے سرعزیزالحق سے پوچھا کہ "اس مجمع میں انگریزی سمجھنے والے کتنے ہوں گے؟" انہوں نے کہا کہ "زیادہ سے زیادہ پانچ سو ہوں گے۔" پھر پوچھا کہ اردو سمجھنے والے کتنے ہوں گے۔" انہوں نے کہا کہ "ڈیڑھ دو ہزار" اس کے بعد عزیزالحق نے کہا کہ "آپ انگریزی میں تقریر فرمایئے میں اس کا ترجمہ بنگالی میں سنا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں اردو ہی میں تقریر کروں گا اور میں نے اردو ہی میں تقریر کی۔" اس کے بعد ہنس کر فرمانے لگے کہ میری اردو تانگے والے کی اردو ہے۔"

اس کے تین چار سال بعد مجھے دارالسلام (حیدر آباد دکن) میں قائداعظم کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ اوپر کا ہال اور سامنے وسیع صحن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور جب لوگوں کو وہاں بھی جگہ نہ ملی تو درختوں، دیواروں اور چھتوں پر چڑھ گئے۔ کوئی ایک لاکھ کا مجمع ہو گا۔ یہاں پر آپ نے اول آدھ گھنٹہ اردو میں تقریر کی اور اس کے بعد انگریزی میں۔ یہ تقریر بڑی پر اثر اور اہم تھی لوگوں میں مسرت اور جوش کی انتہا نہ تھی۔

دوسرے دن ان کی ایک جگہ دعوت تھی مجھے ان کے قریب بائیں جانب بٹھایا گیا۔ اس وقت میں نے انہیں گزشتہ روز کی اردو تقریر پر مبارک باد دی اور کہا:

"مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ آپ اردو میں ایسی اچھی تقریر فرمائیں گے۔ آپ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ آئندہ آپ یہ کبھی نہ کہے گا کہ میری اردو تانگے والے کی اردو ہے۔" یہ سن کر وہ مسکرائے اور چند جملے میرے متعلق کہے۔

اس میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ قائداعظم یہ جانتے تھے کہ ان کی اردو ناقص ہے اور ایک تانگے والے کی اردو میں تقریر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

دوسری بات غور کرنے کی یہ ہے کہ قائداعظم نے اردو کی سب سے پہلی تقریر مشرقی پاکستان میں کی اور یہ فخر مشرقی پاکستان کو حاصل ہوا جس پر ہمیں یک گونہ رشک ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اسی مشرقی پاکستان میں قائداعظم نے وہ اہم اور تاریخی اعلان کیا کہ اردو ہی پاکستان کی زبان ہو سکتی ہے اور دوسری کوئی زبان نہیں ہو سکتی اور اس طرح انہوں نے عین وقت پر فتنہ کا سر کچل دیا جو چند غرض کے بندوں نے زبان کی آڑ لے کر اٹھایا تھا لیکن ہمیں نہایت درجہ افسوس ہے کہ وہ حضرات جو قائداعظم کا دم بھرتے تھے اور ان کے نقش قدم پر

چلنا اپنے لئے موجب فخر سمجھتے تھے اور ان کی بدولت آگے بڑھے، عزت پائی نام پایا ان کے قرب و صحبت کے سہارے رواداری حاصل کی، آج وہ اسی قائد اعظم کے قول کی تحقیر کر رہے ہیں۔

جتنی زبانیں پاکستان میں بولی جاتی ہیں ان سب میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو پاکستان کے ہر علاقے میں سمجھی یا بولی جاتی ہے باقی جتنی زبانیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ اپنے علاقے سے باہر نہ سمجھی جاتی ہیں اور نہ بولی جاتی ہیں۔

اور صوبوں کو چھوڑیئے خود مشرقی بنگال میں اس کے سمجھنے والے اور بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ریڈیو سے اردو نشری تقریریں ہر جگہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ پاکستان سے باہر بھی انگریزی جاننے والے کتنے ہیں بہت کم نہایت کم اور سب سے کم۔ ایسی تقریریں جن کا تعلق پاکستان کے ہر خاص و عام سے ہو وہ صرف اردو میں ہونی چاہئیں اور اگر کوئی خاص ضرورت لاحق ہو تو اس کا انگریزی میں ترجمہ نشر کیا جاسکتا ہے۔

انڈونیشیا میں بیسیوں زبانیں ہیں لیکن وہاں کی حکومت نے ملائی زبان کو اس بنا پر قومی زبان قرار دیا ہے کہ وہ اردو کی طرح انڈونیشیا کے ہر علاقے میں سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ یہی زبان وہاں ذریعہ تعلیم ہے اور یہی حکومت کی زبان ہے اور اسی زبان میں ریڈیو سے تقریریں نشر کی جاتی ہیں۔ حالانکہ دو زبانیں وہاں ایسی بھی ہیں جو ملائی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں بھی یہ نہ کہا کہ ملائی نہیں جاوی زبان قومی زبان ہونی چاہئے۔ سب نے بے چوں و چرا اس بات کو قبول کرلیا۔ چونکہ ملائی ہر علاقے میں سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کو قومی زبان ہونے کی عزت حاصل ہونی چاہئے۔ بہ خلاف ملائی زبان کے اردو کو ایک یہ فضیلت بھی ہے کہ وہ پاکستان کی ہر زبان سے زیادہ ترقی یافتہ بھی ہے اور اس کے علاوہ ہر زبان سے زیادہ مروج اور مقبول ہے۔ اردو کے قومی زبان ہونے سے انکار کرنا اسے اس کے درجے سے گرانا ہے۔ قائد

اعظم نے اردو کے مشہور اعلان کے ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ:

"جو لوگ اس بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔" اب ہم ان صاحبوں کو جو دانشوران پاکستان کی صف اول میں ہیں اور اپنے پوچ دلائل سے اردو کو گرانا چاہتے ہیں پاکستان کا دوست یا دشمن سمجھیں۔ کوئی کوشش کوئی شورش اور کوئی سازش اردو کو قومی زبان کے مرتبے سے نہیں گرا سکتی۔

ماہ نو کراچی

نومبر ۱۹۸۸ء

maablib.org

تصویرِ عزم

میاں بشیر احمد

تصویر عزم، جان وفا، روح حریت
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

قائداعظم محمد علی جناح کا نام لب پر آتے ہی قسم قسم کے جذبات دل میں ابھرتے ہیں ہزاروں خیالات دماغ میں اٹھتے ہیں اور اپنے ہجوم میں کچھ اس طرح، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں جس طرح عوام الناس بڑے بڑے مجمعوں اور جلوسوں میں اپنے اس محبوب رہنما کے دیدار کے لئے بے تاب و مضطرب ہو جایا کرتے تھے اور پھر جیسے اس کا ایک معمولی سا اشارہ ان کو خاموش و متوجہ کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا اسی طرح آج اس کی تڑپتی یاد میں، اس کی زندگی کی ایک جھلک ہر پاکستانی کے دل کو قرار دیتی ہے اور اس کی تقریر کا ایک ایک پھڑکتا ہوا جملہ ہر کہہ ومہ کو فوراً" میدان عمل میں اتر آنے پر اکساتا ہے:-

"یہ ہے ایک آزمائش کی گھڑی.... میں ہر مسلمان کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ وہ قومی مفاد کے لئے اپنا جان و مال سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔" "خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم یقیناً" کامیاب ہوں گے۔"

قائداعظم کی زندگی ہمیشہ کسی نہ کسی بلند نصب العین کے حصول کے لئے مصروف کار رہی۔ انہوں نے جو کچھ کیا، خلوص سے کیا، جو کچھ محسوس کیا اسے دوست دشمن دونوں کے سامنے برملا کہہ دیا۔ شروع میں جب وہ کانگریسی تھے جب لیگی بنے تو لیگی تھے اور جب پاکستانی ہوئے تو ان کی زبان پر صرف پاکستان کا نعرہ تھا۔ اس بات میں وہ سچے مسلمان تھے، جو ان کے دل میں تھا وہی ان کی زبان پر تھا اس میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کسی سخت سے سخت حاکم

سے بھی وہ کبھی ایک لمحے کے لئے نہ ڈرے:۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

محمد علی جناح کی زندگی کے پانچ دور ہیں۔ (بیس سال کا) پہلا دور ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک جب انہوں نے تعلیم پائی اور انگلستان میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ (دس سال کا) دوسرا دور ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۶ء تک جب انہوں نے اپنی یکسوئی اور محنت سے اپنی وکیلانہ ناموری کی بنیاد ڈالی۔ پھر (دس سال) کا تیسرا دور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک جب وہ زیادہ تر کانگریسی رہے۔ (بیس سال کا) چوتھا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک جب وہ کانگریس اور لیگ اور ہندو مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور (تقریباً" گیارہ سال کا) آخری پانچواں دور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک جب انہوں نے وکالت چھوڑ کر اپنی تمام تر مساعی مسلمانان ہند کی قومی تنظیم اور پاکستان کے حصول و قیام میں صرف کر دیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ پاکستان کے پہلے فرماں روا ہوئے اور اس کے تقریباً" ایک سال بعد ۷۱ سال ۸ ماہ اور ۱۸ دن کی عمر پا کر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس دار فانی سے عالم بقا کو سدھارے!

جناح نے چالیس برس ۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۶ تک وکالت کی اور ایسی کہ ہندوستان میں بہت کم لوگوں نے اس پیشے میں اتنی ناموری پائی اور اتنی دولت کمائی۔

۳۷-۱۹۳۶ء میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی قوم انتہائی خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے انہیں لکھا کہ "ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جو اپنی قوم کو اس طوفان سے جو شمالی مغربی اور شاید سارے ہندوستان پر ٹوٹنے والا ہے بچا سکتے ہیں اور اس لئے قوم کو حق ہے کہ وہ آپ کی رہنمائی کی امید رکھے۔" جناح اس سے تقریباً" چار سال پہلے جب مسلمان لیڈروں نے انہیں انگلستان میں بحری تار بھیجا تھا قوم کے اس حق اور اپنے فرض کو بخوشی تسلیم کر چکے تھے۔ ۱۹۳۴ء سے وہ مسلم لیگ کے مستقل

صدر ہو گئے۔ وہ طول و عرض ہند میں شہر شہر پھرے اور جا بجا انہوں نے جا کر مسلمانوں کے لیڈروں اور عوام سے اپیل کی۔ منت سماجت کی سمجھایا کہ قوم کتنے شدید خطرات سے محصور ہے لیکن قوم کی تنظیم کا کام بہت کٹھن نکلا' لیڈروں کی جاہ پرستی اور قوم کی غفلت اس قدر دل شکن تھی کہ جناح کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کار دشوار کو ناممکن سمجھ کر اس سے ہاتھ اٹھا لیتا مگر وہ جناح نہ ہو جو دشواریوں سے دل شکستہ ہو جائے اور ناکامیوں سے حوصلہ ہار بیٹھے۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مسلم لیگ کا ایک انتخابی بورڈ بنایا اور زور شور سے ہر صوبے میں اپنا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے لیڈروں سے گفت و شنید ہوئی مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ کانگریس نے چھ سات صوبوں میں اکثریت حاصل کر کے وہاں اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ نہرو نے کہا کہ اس وقت ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں برطانوی حکومت اور کانگریس۔ جناح نے ببانگ دہل کہا کہ تم غلط کہتے ہو یہاں ایک اور طاقت بھی ہے اور وہ مسلمان ہیں۔ جن کا اپنا تمدن اپنی معاشرت اور اپنا نظام حیات ہے۔ اس کے بعد جناح نے ملک بھر کے مسلمانوں کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس (اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں جمع ہونے اور ہندو استبداد کے خطرے کا سامنا کرنے کی دعوت دی۔ اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے کہا۔ " ایک اور صرف ایک صورت مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان کو ان کی گئی گزری طاقت دلا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے اپنی گمشدہ روح کو پھر ڈھونڈ پائیں۔" اور پھر کہا کہ "اس وقت ایسی قوتیں موجود ہیں جو ممکن ہے تم کو ڈرائیں دھمکائیں اور مرعوب کریں اور ممکن ہے کہ ان کے ہاتھوں تم کو سخت تکلیفیں بھی پہنچیں لیکن یاد رکھو کہ آتش ظلم کی اس بھٹی میں جس میں تم کو ڈالا جائے گا اگر اس پر بھی تم ثابت قدم رہے اور تم نے ان مصیبتوں اور سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور تم برابر ایمان دار اور اپنی قوم کے وفادار بنے رہے تو اس طرح ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو اپنی گزشتہ عظمت

اور تاریخ کی لاج رکھے گی اور مستقبل میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی تاریخ کو کہیں زیادہ پر عظمت اور شاندار بنادے گی۔"

فروری ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی قوم کو ہوشیار کیا کہ " سیاسیات کی دنیا کا دستور ہے کہ آپ طاقتور ہوں گے تو آپ کے لئے خیر خواہی پیار محبت اور پاس خاطر بھی کچھ ہوگا ورنہ کچھ بھی نہیں۔" اور مارچ ۱۹۴۰ء میں پھر وہیں اپنے نوجوانوں کو اپیل کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ سب شانہ بشانہ کھڑے ہو جاؤ۔ ایک مستحکم و مضبوط فولادی پیکر کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہو اور اپنی قوم کی تنظیم و تربیت کئے جاؤ۔ دقتوں کی فکر نہ کرو بلکہ مسلمانوں کو منظم کر کے ان سب کو یکجا و یک سو کردو' ان کو پابندی کار سکھاؤ اور اس طرح ان کو ایک ایسی حیرت انگیز فوج میں تبدیل کردو کہ ملک ہند نے کبھی پہلے دیکھی نہ سنی ہو۔ ایسا کرو گے تو یقیناً" تم بہت جلد اپنی آزادی کی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔" اسی ماہ میں لاہور کے مشہور پاکستانی اجلاس میں انہوں نے کہا کہ "مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ مسلمان متحد ہو کر دنیا کی تمام مشکلات اور تکالیف کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔

اس طرح جناح نے اپنی قوم کو بلایا' سمجھایا اور ابھارا اور ان کو پاکستان کی راہ پر لگادیا۔ ان کی گرجتی آواز نے ملت کے رگ و پے میں ایک برقی رو دوڑا دی اور مسلم لیگ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی ایک عوامی تحریک بن گئی۔

لکھنؤ کے اجلاس کے بعد دس برس تک جناح نے جواب اپنی قوم کے قائداعظم بن گئے تھے صوبے صوبے میں بلکہ شہر شہر میں اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ پر خلوص مسلمان اپنی تمام سیاسی مشکلات میں ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ادھر وہ بھی باوجود پیرانہ سالی کے جگہ جگہ پہنچے اور جہاں تک ہو سکا ایک ایک کارکن کی حوصلہ افزائی کی۔ نوجوانوں اور عورتوں کی طرف انہوں نے خاص توجہ دی۔ اور انہوں نے بھی اپنے قائد کی پکار پر جس طرح لبیک کہی اس کا

مسلم سیاسیات پر معتد بہ اثر پڑا۔

قائداعظم جس بات میں اکثر لیڈروں سے سبقت لے گئے۔ وہ یہ تھی کہ جہاں ایک طرف ان کے دل میں قومی جوش تہور اور شجاعت کے جذبات تھے اور عوام ان سے بے حد متاثر ہوئے وہاں ان میں قانونی قابلیت اور سیاسی بصیرت بھی بدرجہ اتم موجود تھی اور انہوں نے مخالف جماعتوں یا قوموں کے قابل ترین نمائندوں اور نقادوں کو اپنی ان صفات کے بل پر بری طرح پچھاڑا۔ ۱۹۲٦ء سے لے کر جب وہ جداگانہ نیابت کے حامی ہوئے ۱۹۴۸ء تک جب باوجود پاکستان کے قیام کے مخالفین اپنی چالیں چلتے رہے قائداعظم نے اپنے سیاسی مذاکرات و بیانات میں اور اپنی خط و کتابت میں نہرو سے جذباتی نوجوان لیڈر اور گاندھی سے دور اندیش روحانی رہنما کو بساط سیاست میں شکست دی۔ پربھات (دہلی) نے قائداعظم کی رحلت پر لکھا کہ "متحدہ ہندوستان کی تمام طاقتیں اس ایک شخص سے شکست کھا گئیں۔" اس کے ساتھ ہی وقتاً"فوقتاً" ان کی مصلحت آمیز خاموشی بھی کام کرتی رہی۔ بہت کم لیڈر ہوں گے جن کو اپنے جذبات پر اتنا قابو ہو' جتنا مسلمانوں کی جذباتی قوم کے اس رہنما کو تھا۔ انہوں نے اپنی روشن مثال سے مسلمانوں کو ان کی بعض کھوئی ہوئی خوبیوں کی طرف متوجہ کیا۔

قائداعظم کی نماز جنازہ کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تقریر میں کہا اور خوب کہا کہ " شہنشاہ اورنگزیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا۔"

ماہ نو کراچی
قائداعظم نمبر

قائداعظم .... ایک تاثر

ڈاکٹر وزیر آغا

موسم برسات کی وہ رات مجھے آج تک یاد ہے جو ہم نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ مگر یہ سب بیداری ایک عجیب سے احساس بہجت سے لبریز تھی۔ کئی روز سے ریڈیو پر اعلان ہو رہا تھا کہ ۱۴ اگست کو ٹھیک بارہ بجے رات' پاکستان منصہ خاک پر طلوع ہو گا۔ چنانچہ ہم لوگ شام ہی سے کھانے وانے سے فارغ ہو کر ریڈیو کے گرد حلقہ سا بنا کر بیٹھ گئے اس رات بھی آسمان کے تھال میں لاکھوں ستارے مکی کے دانوں کی طرح بکھیرے پڑے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے گھڑیال کی آواز سن کر ان میں سے ایک چمکتا ہوا ستارہ آج آسمان سے ضرور ٹوٹے گا اور ہمارے پھیلے ہوئے دامن میں آگرے گا۔ پھر بارہ بجے' اعلان ہوا اور سننے والوں نے یک زبان ہو کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ تب ہم میں سے ایک نے بانس کی سیڑھی منگائی اور اسے دکان کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پھر وہ سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ گیا اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے' تاروں بھرے آسمان کے نیچے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی زمین کے اوپر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرایا۔ دوسری بار سب اہل خانہ نے یک زبان ہو کر پاکستان زندہ باد کہا اور فرط مسرت سے بے حال ہو گئے' مگر عین اسی وقت پاکستان کو وجود میں لانے والا شخص ہم سے سینکڑوں میل دور ایک گہرے کرب میں مبتلا تھا ایک طرف ہزاروں مسلمان قتل ہو رہے تھے' دوسری طرف طاغوتی قوتیں پاکستان کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ گویا قائداعظم نے پاکستان تو دلا دیا تھا لیکن ان کے سامنے آنے والے واقعات کے منحوس سائے بھی نمودار ہو گئے تھے اور ان کی چھٹی حس نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ قدرت شاید انہیں اتنی فرصت نہ دے گی کہ وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے بعد رخصت ہوں۔

یہ لگتا ہے جیسے قائداعظم کو اگر کسی شے نے زندہ رکھا ہوا تھا تو وہ ان کی زبردست قوت

ارادی تھی۔ انہوں نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور اسی میں مسلمانان ہند کی عافیت اور ترقی کا راز پایا تھا اور وہ اس خواب کے دھاگے کی مدد سے اپنے جسم اور جان کے رشتے کو جوڑے کھڑے تھے۔ پھر جیسے ہی اس خواب کی تعبیر ملی تو جسم اور جان ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے اور ابھی پاکستان کو بنے بمشکل ایک برس ہی گزرا تھا کہ دھاگہ ٹوٹ گیا اور تسبیح کے سارے دانے بکھر گئے۔

پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے قائداعظم نے بے مثال اور لگاتار کوشش کی تھی۔ خرابی صحت کے باوجود انہوں نے اس سلسلے میں اتنا کام کیا تھا کہ ہزاروں آدمی مل کر بھی شاید نہ کر سکیں اور اب ان کا وزن کم ہوتے ہوتے محض ایک سو بارہ پونڈ رہ گیا تھا اور چہرے پر صدیوں کی تھکاوٹ نمودار ہونے لگی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم کو فراغت کے کچھ لمحے ملتے تاکہ ان کی صحت بحال ہو جاتی مگر ایک طرف تو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو قائداعظم کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی' دوسرے خود قائداعظم کو پاکستان کے مقابلے میں اپنی صحت بلکہ اپنی جان تک کو زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے پاکستان کی جان ہڈیوں کے اس جسم میں مقید تھی جس کو لوگ احترام اور محبت سے قائداعظم کے نام سے پکارتے تھے۔ خود قائداعظم کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ اور پاکستان ایک ہی شے کے دو نام ہیں اور اسی لئے اگر بات کو الٹ کر یہ کہا جائے کہ پاکستان کے جسم میں قائداعظم کی جان مقید تھی تو یہ بات بھی غلط نہ ہوگی۔ ایسے میں اگر قائداعظم نے اپنی صحت کی ذرہ برابر پروانہ کی اور آخر دم تک پاکستان کی بقا اور ترقی کے لئے سرگرم عمل رہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔

بایں ہمہ قائداعظم کی چھٹی حس نے انہیں آنے والے سانحہ کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اولین مظاہرہ اس تقریر میں ہوا جو قائداعظم نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے

چمک تھی۔ ان کی نظر ہر کام کے اصول کے علاوہ جزئیات پر رہتی تھی۔ ان کی **طبعیت** میں ایک سلیقہ اور ایک باضا**بطگی** تھی جس کی شہادت نہ صرف ان کے سیاسی کارناموں میں بلکہ ان کی روزانہ زندگی میں بھی ملتی تھی۔

لندن کے قیام کے دوران میں سرکار برطانیہ کی طرف سے قائداعظم کی خوب مہمانداری کی گئی۔ لنکاسٹر ہاؤس میں ڈنر ہوا۔ پھر ہاؤس آف کامنز میں دعوت ہوئی پھر بادشاہ نے لنچ پر بلایا۔ پھر انڈیا ہاؤس میں ہندوستانی ہائی کمشنر نے چائے کی دعوت دی۔ عام طور پر قائداعظم اور لیاقت علی خاں کی دعوت الگ ہوتی تھی' اور پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کی الگ۔ ایک دفعہ غلطی سے مجھے پنڈت نہرو کی پارٹی کا دعوت نامہ پہنچ گیا۔ میں نے فوراً "گورنمنٹ برطانیہ کے افسر متعلقہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اور اس نے بڑے ہی تپاک سے میرا شکریہ ادا کیا۔ ورنہ اگر میں وہ دعوت قبول کر لیتا تو شاید ان لوگوں کے لئے کچھ اچھا نہ ہوتا۔ سوائے بادشاہی لنچ اور انڈیا ہاؤس کی پارٹی کے مجھے کوئی پارٹی ایسی یاد نہیں ہے۔ جہاں قائداعظم' لیاقت علی خاں صاحب' پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ سب ہی موجود ہوں۔

لندن کی سیاسی گفتگوؤں کا فیصلہ ۶ دسمبر کو ہو گیا۔ مگر قائداعظم نے فرمایا کہ وہ لندن میں کچھ دن اور قیام کریں گے اور وہ دو ہفتے تک وہاں ٹھہرے۔ اس قیام کے تین واقعات مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ پہلا واقعہ قائداعظم کی ایک پبلک تقریر تھی جو لندن کے **کنگز** وے ہال میں ہوئی۔ اس میں دو تین ہزار کے قریب آدمی موجود تھے۔ قائداعظم نے ایک وکیل کی طرح تقریر شروع کی۔ ابتدا میں واقعات بیان کئے اور ان کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ان کی گفتگو میں ایک گرمی اور آواز میں ایک کڑک آ گئی۔ تقریر کے دوران میں کسی ہندو نے جو ایک طرف بیٹھا تھا کچھ شور مچایا ایسے موقعوں پر بہت سے لیڈر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ قائداعظم نے اس کا بالکل کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ دو لمحوں کے لئے رک گئے اتنے

میں ہمارے والنٹیروں نے اس فسادی شخص کو ہال سے باہر کر دیا۔ اور قائداعظم کے ماتھے پر نہ تو اس وقت کوئی بل آیا نہ ان کی تقریر میں کوئی فرق پڑا اور نہ اس کے بعد اس واقعہ کا کوئی تذکرہ کیا۔

دوسرا واقعہ جمعہ کی نماز کا ہے۔ قائداعظم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ جمعہ کی نماز لندن کی کسی مسجد میں ادا کریں۔ انہوں نے گرم جوشی سے یہ تجویز منظور فرمائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اس مسجد میں جانا پسند کروں گا جہاں عام مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔ ہم نے ایسٹ اینڈ کی ایک مسجد جو غریب مسلمانوں کی آبادی کی ہوتی ہے، منتخب کی۔ وہاں قائداعظم پہنچے تو خطبہ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اگلی صفوں میں ان کے لئے جگہ خالی کر دی مگر انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں دیر سے آیا ہوں اس لئے جہاں مجھے جگہ ملی وہی میرے لئے مناسب ہے۔ نماز کے بعد لوگوں نے نہایت پرجوش مصافے کئے ایک شخص پر مصافحے کے بعد رقت طاری ہو گئی اور اس نے مسجد میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ اے خدا تو میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ اکثر حاضرین آبدیدہ ہو گئے۔

تیسرا واقعہ ڈاکٹر بک مین سے متعلق ہے جو "مارل ری آرمامنٹ" کی تحریک کے علم بردار ہیں۔ انہوں نے قائداعظم کو ویسٹ منسٹر تھیٹر میں اپنی تحریک سے متعلق ایک ڈرامہ دیکھنے کی دعوت دی۔ کھیل ختم ہوا تو ہمیں وہ کھانا کھلانے اپنے مکان پر لے گئے۔ اس مکان میں کسی زمانے میں لارڈ کلایو رہا کرتا تھا۔ یہاں ڈاکٹر بک مین کے حاشیہ نشین جن میں نوجوان عورتیں بھی تھیں، میزبانی کے فرائض ادا کرنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تحریک کے اوصاف بھی بیان فرماتی جاتیں۔ ڈاکٹر بک مین نے بھی جناح صاحب سے یہی تذکرہ چھیڑا۔ کچھ عرصے تک اسی تحریک کے متعلق گفتگو رہی اور ڈاکٹر بک مین تبلیغ کرتے رہے مگر کچھ عرصے کے بعد مجھے یک لخت محسوس ہوا کہ گفتگو ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر نہیں بلکہ پاکستان کی ضرورت اور اس

کے قیام کے امکان پر ہو رہی ہے۔ اور خود قائد اعظم بات کر رہے ہیں۔ اس کے بعد باقی کے دو تین گھنٹے تک میں نے سوائے پاکستان کے کوئی بات نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قائد اعظم کسی اور موضوع پر دھیان دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ محض رسمی طور پر اور اپنے میزبان کو خوش کرنے کے لئے بھی نہیں۔

ہاں! ایک اور معمولی سا واقعہ یاد آیا۔ بادشاہ کا لنچ پہلے جس دن مقرر ہوا تھا' اتفاق سے اس روز محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ یہ تاریخ پہلے سے مقرر ہو چکی تھی۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے قائد اعظم کی خدمت میں گزارش کی۔ انہوں نے فی الفور لارڈ ویول سے جو ان کے قریب تھے بات کی اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں بادشاہی دعوت میں اس روز شریک نہ ہو سکوں گا۔ یہ واقعہ سفر کے دوران کا ہے۔ لارڈ ویول نے فوراً" لندن تار دیا اور ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے تاریخ بدل چکی تھی۔

سیاسی میدان میں قائد اعظم نے لندن جا کر فتح پائی اور در حقیقت اسی سفر میں پاکستان کی عمارت کی بنیاد اٹھائی گئی۔ واپسی پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ مصر میں تین دن ٹھہریں قاہرہ میں عرب لیگ کی طرف سے دعوت آ چکی تھی۔ قاہرہ میں اسی **شیپرڈ** ہوٹل میں ٹھہرایا گیا قائد اعظم کے لئے جو کمرہ مقرر کیا گیا تھا وہ انہیں پسند نہ آیا اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ نہیں وہی کمرہ دیا جائے جہاں وہ لندن جاتے ہوئے ٹھہرے تھے ان کی یہ خواہش فی الفور پوری کی گئی اور مجھے اور خورشید صاحب کو بھی ان کے اور لیاقت علی خاں صاحب کے کمروں کے برابر میں کمرہ دیا گیا۔

مصر میں قائد اعظم کا یہ تین دن کا قیام ایک تاریخی قیام ہے' کیونکہ انہوں نے ان تین دنوں میں مصری مسلمانوں کے دلوں پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ بادشاہ مصر' وزیر اعظم اور دوسرے وزراء سے ملے۔ مفتی اعظم سے ملاقات کی۔ حزب اختلاف کے لیڈر مصطفیٰ

نحاس پاشا نے بھی ان کی دعوت کی۔ مصطفیٰ نحاس ان مصری قارئین سے ہیں جن کا عرصے تک کانگریس سے رابطہ رہا ہے وہ مسلم لیگ سے بد ظن تھے' ان کے ہاں کھانا بڑا پرلطف تھا اور ان کا گھر بھی محل سا معلوم ہوتا تھا۔ کھانا کھا چکے تو وہ قائداعظم کو تخلئے میں لے گئے جہاں ان دونوں کے علاوہ صرف ایک شخص اور تھا' یہ ترجمانی کے فرائض ادا کرتا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو رات کے ایک بجے تک ہوتی رہی۔ قائداعظم نے بعد میں کہا کہ اس نے بہت سے سوالات نہایت معاندانہ نقطہ نگاہ سے کئے۔ بہرحال اگلے دن جب مصطفیٰ نحاس قائداعظم سے ان کے ہوٹل میں ملنے آئے تو ان کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی قائداعظم سے معانقہ کیا اور انہیں بوسہ دیا۔ پھر وہ اسی گرم جوشی سے لیاقت علی خاں صاحب سے ملے۔

یہی حال مصری اخباروں کا تھا۔ قائداعظم کے ورود سے قبل چند وہ اخبار بھی جو ان کے اور مسلم لیگ کے مخالف تھے اور جن میں سے بعض کو شاید اس سلسلے میں مالی امداد بھی ملتی تھی تین دن کے اندر اندر ان کا دم بھرنے لگے۔

مصر کے وزیراعظم نے قائداعظم کی دعوت دی۔ ایک اور وزیر ایاز پاشا اور عرب لیگ نے بھی۔ ایک شام کو مجھے خیال آیا کہ اہرام مصر کو دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے چند گھنٹے کی چھٹی مانگی۔ قائداعظم نے فرمایا کہ جاؤ مگر شرط یہ ہے کہ تم ان کے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ یہ بات انہوں نے اس انداز سے کہی جیسے انہیں یقین ہے کہ اگر وہ مجھے تنبیہہ نہیں کریں گے تو شاید میں اہرام پر چڑھنے سے باز نہیں آؤں گا۔ اور اس کا نتیجہ یقیناً" یہ ہو گا کہ ان کے ہمراہیوں میں سے ایک کی ہو جائے گی۔ ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے پکا وعدہ کیا کہ ہرگز اہرام پر چڑھنے کی کوشش نہیں کروں گا اور اس وعدے کو نبھایا۔

ہم لوگوں کو ان سے کام کے علاوہ ملنے کا موقع شاذ ہی ملتا تھا مگر ہمیں نہ معلوم کیوں یہ تسلی

ہروقت رہتی تھی کہ ان کی شفقت ہروقت شامل حال ہے۔ جب وہ ہمیں کھانے پر اکھٹا بلاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی سردار اپنے قبیلے کو اکھٹا کر رہا ہو۔ وہ ہم سے ملتے کم تھے مگر ہماری طرف سے بے خبر کبھی نہ تھے۔ ایک مرتبہ خورشید صاحب کی **طبعیت** معمولی طور پر خراب تھی۔ انہیں معلوم ہوا تو وہ خود اپنے کمرے سے اٹھ کر خورشید صاحب کے کمرے میں ان کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ جو لوگ قائداعظم کی مصروفیت اور ان کی زندگی کے نظم و ضبط سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا خود خورشید صاحب کے کمرے میں آنا کس قدر شفقت بزرگانہ کا پتہ دیتا ہے۔ خورشید صاحب کے پاس انگلستان کی سردی سے مقابلہ کرنے کے لئے مناسب گرم کپڑے نہیں تھے۔ جب قائداعظم کو معلوم ہوا تو انہوں نے کراچی ہی میں انہیں اپنا ایک نفیس اوور کوٹ اور شاید کچھ اور کپڑے دیئے۔

قاہرہ سے واپسی پر بی او اے سی کے لوگوں نے ایک حماقت کی۔ رات کا سفر تھا اور ان کا وعدہ تھا کہ وہ ایسا ہوائی جہاز مہیا کریں گے جس میں آرام سے سونے کا انتظام ہو گا۔ جب ہم ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو معمولی قسم کا تھا۔ جس میں قائداعظم کو کرسی پر بیٹھ کر رات کاٹنی پڑی اور وہ بہت تھک گئے۔

جب ہم کراچی پہنچے تو قائداعظم وہیں اتر پڑے۔ لیاقت علی خاں صاحب کو دہلی جانا پڑا اور مجھے ان کے ساتھ۔ جہاز کراچی کے اڈے پر رکا تو قائداعظم اٹھے۔ جہاز سے باہر نکلنے سے پہلے میری طرف تشریف لائے اور کہنے لگے کہ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ خدا حافظ انہوں نے ہاتھ ملایا۔ میں نے خدا حافظ کہا اور وہ جہاز سے اتر کر میرے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم کی طرف بڑھے اور غائب ہو گئے۔

سہ ماہی **صحیفہ** لاہور ستمبر دسمبر ۱۹۷۶ء

قائداعظم کی پہلی اردو تقریر

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

تقسیم سے کئی برس پہلے کا ذکر ہے کہ اینگلو عربک کالج دہلی نے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ طلبائے کالج کو خطاب فرمائیں۔ یہ درخواست طلبا کے پیہم اصرار اور خواہش پر کی گئی تھی۔ قائداعظم نے اسے قبول کرلیا اور ایک تاریخ مقرر کی کہ اس روز' شب کے وقت کالج کے طلبا کو مخاطب کریں گے۔ تقریر سے پہلے کالج کی طرف سے ایک مختصر سی کھانے کی دعوت بھی دی گئی جس میں قائداعظم کے علاوہ کالج کے پرنسپل اور چند اور صاحب شریک تھے مجھے بھی اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

کھانا سادا اور اچھا تھا زیادہ کھانے نہیں تھے اور جو دو چار چیزیں تھیں وہ ایسی تھیں جو روزانہ اوسط درجے کے مسلمان شرفا کے گھروں میں پکتی ہیں۔

کھانے کے بعد قائداعظم نے مجھ سے فرمایا "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے سب سے پہلے اردو میں تقریر کہاں کی؟"

اور پھر خود ہی بیان کیا کہ میمن سنگھ (مشرقی پاکستان) میں ایک جلسہ (انتخابی یا کسی اور نوعیت کا یہ مجھے یاد نہیں رہا) تھا لوگ جمع ہونے شروع ہوئے اور جتنی توقع تھی اس سے زیادہ جمع ہو گئے۔

اس موقع پر سرعزیزالحق میرے ہمراہ تھے۔ میں نے سرعزیزالحق سے پوچھا کہ "اس مجمع میں انگریزی سمجھنے والے کتنے ہوں گے؟" انہوں نے کہا کہ "زیادہ سے زیادہ پانچ سو ہوں گے۔" پھر پوچھا کہ اردو سمجھنے والے کتنے ہوں گے۔ "انہوں نے کہا کہ "ڈیڑھ دو ہزار" اس کے بعد عزیزالحق نے کہا کہ "آپ انگریزی میں تقریر فرمایئے میں اس کا ترجمہ بنگالی میں سنا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں اردو ہی میں تقریر کروں گا اور میں نے اردو ہی میں تقریر کی۔" اس کے بعد ہنس کر فرمانے لگے کہ میری اردو تانگے والے کی اردو ہے۔"

اس کے تین چار سال بعد مجھے دارالسلام (حیدر آباد دکن) میں قائداعظم کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ اوپر کا ہال اور سامنے وسیع صحن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور جب لوگوں کو وہاں بھی جگہ نہ ملی تو درختوں، دیواروں اور چھتوں پر چڑھ گئے۔ کوئی ایک لاکھ کا مجمع ہو گا۔ یہاں پر آپ نے اول آدھ گھنٹہ اردو میں تقریر کی اور اس کے بعد انگریزی میں۔ یہ تقریر بڑی پر اثر اور اہم تھی لوگوں میں مسرت اور جوش کی انتہا نہ تھی۔

دوسرے دن ان کی ایک جگہ دعوت تھی مجھے ان کے قریب بائیں جانب بٹھایا گیا۔ اس وقت میں نے انہیں گزشتہ روز کی اردو تقریر پر مبارک باد دی اور کہا:

"مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ آپ اردو میں ایسی اچھی تقریر فرمائیں گے۔ آپ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ آئندہ آپ یہ کبھی نہ کہے گا کہ میری اردو تانگے والے کی اردو ہے۔" یہ سن کر وہ مسکرائے اور چند جملے میرے متعلق کہے۔

اس میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ قائداعظم یہ جانتے تھے کہ ان کی اردو ناقص ہے اور ایک تانگے والے کی اردو میں تقریر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

دوسری بات غور کرنے کی یہ ہے کہ قائداعظم نے اردو کی سب سے پہلی تقریر مشرقی پاکستان میں کی اور یہ فخر مشرقی پاکستان کو حاصل ہوا جس پر ہمیں یک گونہ رشک ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اسی مشرقی پاکستان میں قائداعظم نے وہ اہم اور تاریخی اعلان کیا کہ اردو ہی پاکستان کی زبان ہو سکتی ہے اور دوسری کوئی زبان نہیں ہو سکتی اور اس طرح انہوں نے عین وقت پر فتنہ کا سر کچل دیا جو چند غرض کے بندوں نے زبان کی آڑ لے کر اٹھایا تھا لیکن ہمیں نہایت درجہ افسوس ہے کہ وہ حضرات جو قائداعظم کا دم بھرتے تھے اور ان کے نقش قدم پر

چلنا اپنے لئے موجب فخر سمجھتے تھے اور ان کی بدولت آگے بڑھے، عزت پائی نام پایا ان کے قرب و صحبت کے سہارے رواداری حاصل کی، آج وہ اسی قائد اعظم کے قول کی تحقیر کر رہے ہیں۔

جتنی زبانیں پاکستان میں بولی جاتی ہیں ان سب میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو پاکستان کے ہر علاقے میں سمجھی یا بولی جاتی ہے باقی جتنی زبانیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ اپنے علاقے سے باہر نہ سمجھی جاتی ہیں اور نہ بولی جاتی ہیں۔

اور صوبوں کو چھوڑیے خود مشرقی بنگال میں اس کے سمجھنے والے اور بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ریڈیو سے اردو نشری تقریریں ہر جگہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ پاکستان سے باہر بھی انگریزی جاننے والے کتنے ہیں بہت کم نہایت کم اور سب سے کم۔ ایسی تقریریں جن کا تعلق پاکستان کے ہر خاص و عام سے ہو وہ صرف اردو میں ہونی چاہئیں اور اگر کوئی خاص ضرورت لاحق ہو تو اس کا انگریزی میں ترجمہ نشر کیا جاسکتا ہے۔

انڈونیشیا میں بیسیوں زبانیں ہیں لیکن وہاں کی حکومت نے ملائی زبان کو اس بنا پر قومی زبان قرار دیا ہے کہ وہ اردو کی طرح انڈونیشیا کے ہر علاقے میں سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ یہی زبان وہاں ذریعہ تعلیم ہے اور یہی حکومت کی زبان ہے اور اسی زبان میں ریڈیو سے تقریریں نشر کی جاتی ہیں۔ حالانکہ دو زبانیں وہاں ایسی بھی ہیں جو ملائی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں بھی یہ نہ کہا کہ ملائی نہیں جاوی زبان قومی زبان ہونی چاہئے۔ سب نے بے چوں و چرا اس بات کو قبول کرلیا۔ چونکہ ملائی ہر علاقے میں سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کو قومی زبان ہونے کی عزت حاصل ہونی چاہئے۔ بہ خلاف ملائی زبان کے اردو کو ایک یہ فضیلت بھی ہے کہ وہ پاکستان کی ہر زبان سے زیادہ ترقی یافتہ بھی ہے اور اس کے علاوہ ہر زبان سے زیادہ مروج اور مقبول ہے۔ اردو کے قومی زبان ہونے سے انکار کرنا اسے اس کے درجے سے گرانا ہے۔ قائد

اعظم نے اردو کے مشہور اعلان کے ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ:

"جو لوگ اس بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔" اب ہم ان صاحبوں کو جو دانشوران پاکستان کی صف اول میں ہیں اور اپنے پوچ دلائل سے اردو کو گرانا چاہتے ہیں پاکستان کا دوست یا دشمن سمجھیں۔ کوئی کوشش کوئی شورش اور کوئی سازش اردو کو قومی زبان کے مرتبے سے نہیں گرا سکتی۔

ماہ نو کراچی

نومبر ۱۹۸۸ء

maablib.org

تصویرِ عزم

میاں بشیر احمد

تصویرِ عزمؑ جانِ وفاؑ روحِ حریت

ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

قائداعظم محمد علی جناح کا نام لب پر آتے ہی قسم قسم کے جذبات دل میں ابھرتے ہیں ہزاروں خیالات دماغ میں اٹھتے ہیں اور اپنے ہجوم میں کچھ اس طرح ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں جس طرح عوام الناس بڑے بڑے مجمعوں اور جلوسوں میں اپنے اس محبوب رہنما کے دیدار کے لئے بے تاب و مضطرب ہو جایا کرتے تھے اور پھر جیسے اس کا ایک معمولی سا اشارہ ان کو خاموش و متوجہ کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا اسی طرح آج اس کی تڑپتی یاد میں اس کی زندگی کی ایک جھلک ہر پاکستانی کے دل کو قرار دیتی ہے اور اس کی تقریر کا ایک ایک پھڑکتا ہوا جملہ ہر کہہ ومہ کو فوراً" میدان عمل میں اتر آنے پر اکساتا ہے:۔

"یہ ہے ایک آزمائش کی گھڑی.... میں ہر مسلمان کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ وہ قومی مفاد کے لئے اپنا جان و مال سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔" "خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم یقیناً" کامیاب ہوں گے۔"

قائداعظم کی زندگی ہمیشہ کسی نہ کسی بلند نصب العین کے حصول کے لئے مصروف کار رہی۔ انہوں نے جو کچھ کیا خلوص سے کیا جو کچھ محسوس کیا اسے دوست دشمن دونوں کے سامنے برملا کہہ دیا۔ شروع میں جب وہ کانگریسی تھے جب لیگی بنے تو لیگی تھے اور جب پاکستانی ہوئے تو ان کی زبان پر صرف پاکستان کا نعرہ تھا۔ اس بات میں وہ سچے مسلمان تھے جو ان کے دل میں تھا وہی ان کی زبان پر تھا اس میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کسی سخت سے سخت حاکم

سے بھی وہ کبھی ایک لمحے کے لئے نہ ڈرے:۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

محمد علی جناح کی زندگی کے پانچ دور ہیں۔ (بیس سال کا) پہلا دور ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک جب انہوں نے تعلیم پائی اور انگلستان میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ (دس سال کا) دوسرا دور ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۶ء تک جب انہوں نے اپنی یکسوئی اور محنت سے اپنی وکیلانہ ناموری کی بنیاد ڈالی۔ پھر (دس سال) کا تیسرا دور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک جب وہ زیادہ تر کانگریسی رہے۔ (بیس سال کا) چوتھا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک جب وہ کانگریس اور لیگ اور ہندو مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور (تقریباً" گیارہ سال کا) آخری پانچواں دور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک جب انہوں نے وکالت چھوڑ کر اپنی تمام تر مساعی مسلمانان ہند کی قومی تنظیم اور پاکستان کے حصول و قیام میں صرف کر دیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ پاکستان کے پہلے فرماں روا ہوئے اور اس کے تقریباً" ایک سال بعد ۷۱ سال ۸ ماہ اور ۱۸ دن کی عمر پا کر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس دار فانی سے عالم بقا کو سدھارے!

جناح نے چالیس برس ۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۶ تک وکالت کی اور ایسی کہ ہندوستان میں بہت کم لوگوں نے اس پیشے میں اتنی ناموری پائی اور اتنی دولت کمائی۔

۳۷-۱۹۳۶ء میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی قوم انتہائی خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے انہیں لکھا کہ "ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جو اپنی قوم کو اس طوفان سے جو شمالی مغربی اور شاید سارے ہندوستان پر ٹوٹنے والا ہے بچا سکتے ہیں اور اس لئے قوم کو حق ہے کہ وہ آپ کی رہنمائی کی امید رکھے۔" جناح اس سے تقریباً" چار سال پہلے جب مسلمان لیڈروں نے انہیں انگلستان میں بحری تار بھیجا تھا قوم کے اس حق اور اپنے فرض کو بخوشی تسلیم کر چکے تھے۔ ۱۹۳۴ء سے وہ مسلم لیگ کے مستقل

صدر ہو گئے۔ وہ طول و عرض ہند میں شہر شہر پھرے اور جا بجا انہوں نے جا کر مسلمانوں کے لیڈروں اور عوام سے اپیل کی۔ منت سماجت کی سمجھایا کہ قوم کتنے شدید خطرات سے محصور ہے لیکن قوم کی تنظیم کا کام بہت کٹھن نکلا' لیڈروں کی جاہ پرستی اور قوم کی غفلت اس قدر دل شکن تھی کہ جناح کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کار دشوار کو ناممکن سمجھ کر اس سے ہاتھ اٹھا لیتا مگر وہ جناح نہ ہو جو دشواریوں سے دل شکستہ ہو جائے اور ناکامیوں سے حوصلہ ہار بیٹھے۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مسلم لیگ کا ایک انتخابی بورڈ بنایا اور زور شور سے ہر صوبے میں اپنا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے لیڈروں سے گفت و شنید ہوئی مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ کانگریس نے چھ سات صوبوں میں اکثریت حاصل کر کے وہاں اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ نہرو نے کہا کہ اس وقت ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں برطانوی حکومت اور کانگریس۔ جناح نے ببانگ دہل کہا کہ تم غلط کہتے ہو یہاں ایک اور طاقت بھی ہے اور وہ مسلمان ہیں۔ جن کا اپنا تمدن اپنی معاشرت اور اپنا نظام حیات ہے۔ اس کے بعد جناح نے ملک بھر کے مسلمانوں کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس (اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں جمع ہونے اور ہندو استبداد کے خطرے کا سامنا کرنے کی دعوت دی۔ اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے کہا۔ "ایک اور صرف ایک صورت مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان کو ان کی گئی گزری طاقت دلا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے اپنی گمشدہ روح کو پھر ڈھونڈ پائیں۔" اور پھر کہا کہ "اس وقت ایسی قوتیں موجود ہیں جو ممکن ہے تم کو ڈرائیں دھمکائیں اور مرعوب کریں اور ممکن ہے کہ ان کے ہاتھوں تم کو سخت تکلیفیں بھی پہنچیں لیکن یاد رکھو کہ آتش ظلم کی اس بھٹی میں جس میں تم کو ڈالا جائے گا اگر اس پر بھی تم ثابت قدم رہے اور تم نے ان مصیبتوں اور سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور تم برابر ایمان دار اور اپنی قوم کے وفادار بنے رہے تو اس طرح ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو اپنی گزشتہ عظمت

اور تاریخ کی لاج رکھے گی اور مستقبل میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی تاریخ کو کہیں زیادہ پر عظمت اور شاندار بنادے گی۔"

فروری ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی قوم کو ہوشیار کیا کہ " سیاسیات کی دنیا کا دستور ہے کہ آپ طاقتور ہوں گے تو آپ کے لئے خیر خواہی پیار محبت اور پاس خاطر بھی کچھ ہو گا ورنہ کچھ بھی نہیں۔" اور مارچ ۱۹۴۰ء میں پھر وہیں اپنے نوجوانوں کو اپیل کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ سب شانہ بشانہ کھڑے ہو جاؤ۔ ایک مستحکم و مضبوط فولادی پیکر کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہو اور اپنی قوم کی تنظیم و تربیت کئے جاؤ۔ دقتوں کی فکر نہ کرو بلکہ مسلمانوں کو منظم کر کے ان سب کو یکجا و یک سو کر دو' ان کو پابندی کار سکھاؤ اور اس طرح ان کو ایک ایسی حیرت انگیز فوج میں تبدیل کر دو کہ ملک ہند نے کبھی پہلے دیکھی نہ سنی ہو۔ ایسا کرو گے تو یقیناً" تم بہت جلد اپنی آزادی کی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔" اسی ماہ میں لاہور کے مشہور پاکستانی اجلاس میں انہوں نے کہا کہ "مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ مسلمان متحد ہو کر دنیا کی تمام مشکلات اور تکالیف کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔ اس طرح جناح نے اپنی قوم کو بلایا' سمجھایا اور ابھارا اور ان کو پاکستان کی راہ پر لگا دیا۔ ان کی گرجتی آواز نے ملت کے رگ و پے میں ایک برقی رو دوڑا دی اور مسلم لیگ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی ایک عوامی تحریک بن گئی۔

لکھنؤ کے اجلاس کے بعد دس برس تک جناح نے جواب اپنی قوم کے قائداعظم بن گئے تھے صوبے صوبے میں بلکہ شہر شہر میں اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ پر خلوص مسلمان اپنی تمام سیاسی مشکلات میں ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ادھر وہ بھی باوجود پیرانہ سالی کے جگہ جگہ پہنچے اور جہاں تک ہو سکا ایک ایک کارکن کی حوصلہ افزائی کی۔ نوجوانوں اور عورتوں کی طرف نہوں نے خاص توجہ دی۔ اور انہوں نے بھی اپنے قائد کی پکار پر جس طرح لبیک کہی اس کا

مسلم سیاسیات پر معتد بہ اثر پڑا۔

قائداعظم جس بات میں اکثر لیڈروں سے سبقت لے گئے۔ وہ یہ تھی کہ جہاں ایک طرف ان کے دل میں قومی جوش تہور اور شجاعت کے جذبات تھے اور عوام ان سے بے حد متاثر ہوئے وہاں ان میں قانونی قابلیت اور سیاسی بصیرت بھی بدرجہ اتم موجود تھی اور انہوں نے مخالف جماعتوں یا قوموں کے قابل ترین نمائندوں اور نقادوں کو اپنی ان صفات کے بل پر بری طرح پچھاڑا۔ ۱۹۲۶ء سے لے کر جب وہ جداگانہ نیابت کے حامی ہوئے ۱۹۴۸ء تک جب باوجود پاکستان کے قیام کے مخالفین اپنی چالیں چلتے رہے قائداعظم نے اپنے سیاسی مذاکرات و بیانات میں اور اپنی خط و کتابت میں نہرو سے جذباتی نوجوان لیڈر اور گاندھی سے دور اندیش روحانی رہنما کو بساط سیاست میں شکست دی۔ پربھات (دہلی) نے قائداعظم کی رحلت پر لکھا کہ " متحدہ ہندوستان کی تمام طاقتیں اس ایک شخص سے شکست کھا گئیں۔" اس کے ساتھ ہی وقتاً" فوقتاً" ان کی مصلحت آمیز خاموشی بھی کام کرتی رہی۔ بہت کم لیڈر ہوں گے جن کو اپنے جذبات پر اتنا قابو ہو، جتنا مسلمانوں کی جذباتی قوم کے اس رہنما کو تھا۔ انہوں نے اپنی روشن مثال سے مسلمانوں کو ان کی بعض کھوئی ہوئی خوبیوں کی طرف متوجہ کیا۔

قائداعظم کی نماز جنازہ کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تقریر میں کہا اور خوب کہا کہ " شہنشاہ اورنگزیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا۔"

ماہ نو کراچی
قائداعظم نمبر

قائداعظم .... ایک تاثر

ڈاکٹر وزیر آغا

موسم برسات کی وہ رات مجھے آج تک یاد ہے جو ہم نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ مگر یہ سب بیداری ایک عجیب سے احساس بہجت سے لبریز تھی۔ کئی روز سے ریڈیو پر اعلان ہو رہا تھا کہ ۱۴ اگست کو ٹھیک بارہ بجے رات' پاکستان منصہ خاک پر طلوع ہو گا۔ چنانچہ ہم لوگ شام ہی سے کھانے وانے سے فارغ ہو کر ریڈیو کے گرد حلقہ سا بنا کر بیٹھ گئے اس رات بھی آسمان کے تھال میں لاکھوں ستارے مکی کے دانوں کی طرح بکھیرے پڑے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے گھڑیال کی آواز سن کر ان میں سے ایک چمکتا ہوا ستارہ آج آسمان سے ضرور ٹوٹے گا اور ہمارے پھیلے ہوئے دامن میں آگرے گا۔ پھر بارہ بجے' اعلان ہوا اور سننے والوں نے یک زبان ہو کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ تب ہم میں سے ایک نے بانس کی سیڑھی منگائی اور اسے دکان کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پھر وہ سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ گیا اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے' تاروں بھرے آسمان کے نیچے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی زمین کے اوپر پاکستان کا قومی پرچم لہرایا۔ دوسری بار سب اہل خانہ نے یک زبان ہو کر پاکستان زندہ باد کہا اور فرط مسرت سے بے حال ہو گئے' مگر عین اسی وقت پاکستان کو وجود میں لانے والا شخص ہم سے سینکڑوں میل دور ایک گہرے کرب میں مبتلا تھا ایک طرف ہزاروں مسلمان قتل ہو رہے تھے' دوسری طرف طاغوتی قوتیں پاکستان کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ گویا قائداعظم نے پاکستان تو دلا دیا تھا لیکن ان کے سامنے آنے والے واقعات کے منحوس سائے بھی نمودار ہو گئے تھے اور ان کی چھٹی حس نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ قدرت شاید انہیں اتنی فرصت نہ دے گی کہ وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے بعد رخصت ہوں۔

یہ لگتا ہے جیسے قائداعظم کو اگر کسی شے نے زندہ رکھا ہوا تھا تو وہ ان کی زبردست قوت

ارادی تھی۔ انہوں نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور اسی میں مسلمانان ہند کی عافیت اور ترقی کا راز پایا تھا اور وہ اس خواب کے دھاگے کی مدد سے اپنے جسم اور جان کے رشتے کو جوڑے کھڑے تھے۔ پھر جیسے ہی اس خواب کی تعبیر ملی تو جسم اور جان ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے اور ابھی پاکستان کو بنے بمشکل ایک برس ہی گزرا تھا کہ دھاگہ ٹوٹ گیا اور تسبیح کے سارے دانے بکھر گئے۔

پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے قائداعظم نے بے مثال اور لگاتار کوشش کی تھی۔ خرابی صحت کے باوجود انہوں نے اس سلسلے میں اتنا کام کیا تھا کہ ہزاروں آدمی مل کر بھی شاید نہ کر سکیں اور اب ان کا وزن کم ہوتے ہوتے محض ایک سو بارہ پونڈ رہ گیا تھا اور چہرے پر صدیوں کی تھکاوٹ نمودار ہونے لگی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم کو فراغت کے کچھ لمحے ملتے تاکہ ان کی صحت بحال ہو جاتی مگر ایک طرف تو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو قائداعظم کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی' دوسرے خود قائداعظم کو پاکستان کے مقابلے میں اپنی صحت بلکہ اپنی جان تک کو زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے پاکستان کی جان ہڈیوں کے اس جسم میں مقید تھی جس کو لوگ احترام اور محبت سے قائداعظم کے نام سے پکارتے تھے۔ خود قائداعظم کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ اور پاکستان ایک ہی شے کے دو نام ہیں اور اسی لئے اگر بات کو الٹ کر یہ کہا جائے کہ پاکستان کے جسم میں قائداعظم کی جان مقید تھی تو یہ بات بھی غلط نہ ہو گی۔ ایسے میں اگر قائداعظم نے اپنی صحت کی ذرہ برابر پروانہ کی اور آخر دم تک پاکستان کی بقا اور ترقی کے لئے سرگرم عمل رہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔

باایں ہمہ قائداعظم کی چھٹی حس نے انہیں آنے والے سانحہ کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اولین مظاہرہ اس تقریر میں ہوا جو قائداعظم نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے

یونیورسٹی اسٹیڈیم میں کی۔ جی الانا لکھتے ہیں کہ پبلک تقریروں میں یہ پہلا موقع تھا کہ قائداعظم نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں موت کا ذکر کیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

"حوصلہ نہ ہارو' موت سے نہ ڈرو' ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ موت کے لئے ہروقت تیار رہنا چاہئے۔ ہمیں جرات سے اس کا سامنا کرنا چاہئے تاکہ پاکستان اور اسلام کی آبرو کا تحفظ ہو سکے۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی نوید آزادی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک سچے نصب العین کے لئے جام شہادت پئے۔ اپنے فرائض بجالاؤ اور خدا پر یقین رکھو پاکستان کو اب دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی' پاکستان ہمیشہ رہے گا۔"

یوں لگتا ہے جیسے یہ تقریر "خطاب" نہیں تھا خود کلامی کی ایک صورت تھی۔ قویٰ مضمحل ہو رہے تھے' جسم آہستہ آہستہ بجھ رہا تھا لیکن روح بیدار تھی اور عزم جوان تھا۔ قائداعظم نے پاکستان کے لئے ایک بھرپور جنگ لڑی تھی اور وہ اس جنگ میں کام آگئے تھے۔ چنانچہ وہ بظاہر تو اپنی تقریر میں ملت کو صراط مستقیم کا نقشہ دکھا رہے تھے لیکن بباطن شاید اپنی ہی کہانی سنا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ ایک مجاہد کس طرح لڑتا ہے اور ایک شہید کس طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ اس کے بعد ان کی طویل علالت کی کہانی ہے جس سے سب لوگ واقف ہیں۔ کرنل الٰہی بخش نے اپنی کتاب میں قائداعظم کی زندگی کے آخری ایام کی کہانی بڑے خلوص اور دردمندی سے رقم کی ہے۔ اور اس کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ قائداعظم کس قدر بااصول اور بے غرض انسان تھے زیارت میں رہتے ہوئے جب ان کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی تو کرنل الٰہی بخش کو طلب کیا گیا۔ وہ بھی غالباً" قائداعظم کو بتائے بغیر ورنہ وہ شاید اسے بھی غیر ضروری سمجھتے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی کسی پر بلا ضرورت بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ کرنل الٰہی بخش نے انہیں ان کے محبوب سگریٹوں کا ڈبہ پیش کیا جو انہوں نے قبول کر لیا مگر اس کے بعد یہ کہہ کر یہ سگریٹ کچھ ٹھک نہیں رہے

انہوں نے دوسرا ڈبہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح انہیں گلاب کے پھول بہت اچھے لگتے تھے۔ جنرل محمد اکبر خاں نے انہیں پھول بھجوائے تو خوشی سے قبول کر لیے مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ جنرل صاحب سے کہئے کہ دوبارہ تکلیف نہ فرمائیں۔

عجیب بات ہے کہ قائداعظم پاکستان کے بانی تھے' انہوں نے پاکستان بنا کر قوم پر اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ اس وقت ہر پاکستانی ان پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار تھا۔ وہ گورنر جنرل بھی تھے اور اس لئے قانونی طور پر بھی انہیں تمام مراعات حاصل تھیں۔ مگر وہ قوم اور ملک پر ذرہ برابر بوجھ ڈالنے کے حق میں نہیں تھے۔ کرنل الٰہی بخش نے لکھا ہے کہ زیارت کے سرد موسم میں ان کے پاس گرم کپڑے تک نہیں تھے چنانچہ تیس گز گرم کپڑے کا آرڈر دیا گیا جب کپڑا آگیا تو کرنل صاحب اور قائداعظم کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہوئی:

"جناب جو لباس آپ نے پہن رکھا ہے وہ بہت پتلا ہے آپ کو ٹھنڈ لگ جانے کا خطرہ ہے۔"

"میرے پاس تو یہی لباس ہے مگر میں سوچ رہا ہوں کہ کھڈی کے کپڑے کا ایک لباس بھی بنا لوں۔"

"لیکن جناب روئی کا لباس تو ٹھیک نہیں۔ آپ کو گرم اونی لباس چاہئے۔"

"مگر میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ میرے پاس اونی لباس نہیں ہے۔"

"جناب آپ کے پاس ہونا چاہئے۔ آپ کی اجازت کے بغیر میں نے کراچی سے منگا لیا ہے؟"

"سنو ڈاکٹر! میری مانو جب کبھی روپیہ خرچ کرنے لگو تو سوچ لیا کرو کہ کیا ایسا کرنا بہت ہی ضروری ہے۔"

قائداعظم کی ساری زندگی' ان کی بول چال' نشست و برخاست' پہناوا' خوراک' صحت

کے دوران، علالت کے دوران، غرضیکہ شروع سے آخر تک الگ مثالی حیثیت رکھتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ کسی قوم کا لیڈر وہی ہوتا ہے جو قوم پر اپنی جان، مال، سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ پاکستان اور اہل پاکستان پر قائداعظم کے احسانات ان گنت ہیں۔ اگر ہم نے قائداعظم کو بھلا دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم پاکستان کے وجود ہی سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ یہ بات ہمہ وقت ہمارے سامنے رہنی چاہئے۔

سہ ماہی صحیفہ لاہور

ستمبر دسمبر ۱۹۷۶ء

maablib.org

قائداعظم اکادمی